زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

THE EDITOR JANG.

Sham-jee! A renowned Journalist, writer, intellectual and poet of Pakistan.

۔ جانے کیوں آئے ہیں ۔

عالمی سطح پر ظلم، ناانصافی اور بے رحمی کی جنگ جس شدت سے پھیلتی اور بڑھتی جارہی ہے اُسی برق رفتاری سے انسانی سوچ اور احساس کے زاویئے بھی تبدیل ہورہے ہیں۔ اضطرار اور بے چینی بلکہ بے یقینی دلوں اور دماغوں میں تیزی سے گھر کررہی ہے۔ گھٹن کے اس عالم میں تخلیق کار کا کرب ایک تخلیق کار یا اُس کا قاری بہتر طریقہ پر محسوس کرسکتا ہے۔ جناب رب نواز مائل اردو کے معروف اور مقبول حلقوں سے دوررہ کر آج کے انسان بلخصوص پاکستانی اور بلوچی پر گذرنے والی المناکی سے کچھ اس طور نبرد آزما ہیں کہ اُن کے اشعار سے اپنے اپنے عصر کا دُکھ اور درد ایک کراہ کی صورت ظاہر ہوکر مقتدر حلقوں کی بے حسی کا ماتم کررہے ہیں۔

درد سا درد ہے دیر سے سر میں یوں　　اپنی آواز کیوں گم ہوئی گھر میں یوں
جس کا باعث ہے کیا کون جانے اسے　　ایک دنیا ہے اُلجھی ہوئی شر میں یوں

اگر آپ کچھ دیر کے لیے حبس اور شر کے اس ماحول سے نجات یا فرار چاہتے ہیں تو اولین فرصت میں جناب رب نواز مائل کے تازہ شعری نسخے کی دستیابی کے لیے مندرجہ ذیل فون نمبرز پر رجوع کیجیے۔ Mob: 0300-3897428 --- 081-2827237

○○○

۔ ورق ورق آئینہ اور عصری شعور ۔

جناب دیپک بُدکی اردو افسانے کے روشن دماغ اور اعلیٰ عصری رویّوں کے حامل ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جن کا مقام اردو ادب میں معتبر بھی ہے اور مستند بھی۔ ہماری رائے کو دو حوالوں سے تقویت مل رہی ہے اوّل میزان پبلی شرز سری نگر کے زیر اہتمام پروفیسر شباب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری صاحبان نے یکسو ویکجا ہوکر جناب دیپک بُدکی کی شخصیت وفن پر قریب چار صد صفحات کی ضخیم اور مجلد دستاویز ''ورق ورق آئینہ'' ترتیب دے کر بُدکی صاحب کی شخصیت وفن کو ایک طرح سے امر کردیا ہے۔ دوسری جانب خود دیپک بُدکی نے ''عصری شعور'' کے عنوان سے پونے تین سو صفحات پر مشتمل ایسی مجلد دستاویز ترتیب دی ہے جس میں برصغیر کے قریب ساٹھ تخلیق کاروں کو مختلف اور منفرد انداز میں جانچا اور پرکھا گیا ہے۔ ہر دو کتابیں اہل علم اور ادب کے لئے جناب دیپک بُدکی اور اُن کے احباب کی جانب سے ایسا ادبی اور قیمتی تحفہ ہیں جو اپنے اندر دل و دماغ کی تازگی اور تراوٹ کے لئے نسخہ کیمیا کی تاثیر لئے ہوئے ہیں۔

دستیابی: میزان پبلی شرز، متصل فائر اینڈ ایمرجنسی سروسز ہیڈ کوارٹرس، بٹہ مالو، سری نگر، کشمیر۔

○○○

۔ سرمایہ ۔

مسافرت کا مزہ کیا، جو آبلہ نہ ملے　　وہ دکھ ہی کیا، کہ اٹھاؤ تو صلہ نہ ملے
چلے بھی آؤ میری جان دل نہ میلا کرو　　عجب نہیں ہے کہ پھر یہ بھی رابطہ نہ ملے

مذکورہ بالا دو البیلے اشعار قادر الکلام سنجیدہ وفکائیہ شاعر سید ضمیر جعفری مرحوم ومغفور کے خانوادے کے اہم رکن ڈاکٹر شبیر حیدر کے تازہ شعری مجموعے ''سرمایہ'' سے لیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر شبیر حیدر ایک عرصے سے پیشہ ورانہ زمہ داریوں کے باعث آسٹریلیا میں مقیم ہیں۔ خوش کُن اور لائق توجہ پہلو اُن کا شعری جوہر اور اُس کی بابت اِن کا اشتیاق ہے جس سے امیدیں وابستہ کرنا قرینِ قیاس بھی ہے اور قرینِ انصاف بھی۔ ہر چند ڈاکٹر شبیر حیدر کی شخصیت اور فن اپنا آپ منوانے کی صلاحیتوں سے مُمیز ہے مگر ادبی پیرومرشد ضمیر جعفری سے خونی نسبت اضافی خوش امیدیوں میں گرفتار کرنے کے لیے بھی مجبور کرتی ہے۔ لہذا جس قدر جلد ممکن ہو ڈاکٹر شبیر حیدر کے تازہ شعری نسخے ''سرمایہ'' سے رجوع کیجیے اور ہماری آواز میں آواز ملاتے ہوئے ڈاکٹر شبیر حیدر کی کامیابی وکامرانی کی دعا کیجیے۔

دستیابی: رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی۔

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُوچہارسُوچہارسُوچہارسُوچہارسُوچہارسُوچہارسُوچہارسُوچہارسُو

چہارسُو

جلد۱۹، شمارہ: جنوری، فروری ۲۰۱۰ء

زرِ سالانہ
دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

مجلسِ مشاورت
قارئین چہارسُو

''تم یاد رکھنا''

ہر سال کی طرح،
اس سال بھی
''چراغ''
اُمیدوں کے
جلنے لگے ہیں
''پھول''
آس کے، ارمانوں کے
پھر سے
کھِل اُٹھے ہیں
اے سالِ نو
دو ہزار دس!
ہماری
اُمیدوں، ارمانوں کی
لاج رکھنا
ہماری دھرتی
ہمارے
بام و در
آباد رکھنا
ہمارے نونہالوں کے
چہروں کو
سدا خوشحال رکھنا
جو ہم سے ہوئی کوتاہیاں
گذرے برس
اب کے برس
اُن سے ہمیں تُم
باز رکھنا
جو ہو سکے
اِک بار پھر سے
میری مٹی
میری دھرتی
میرے گلشن کو
شاداب رکھنا

اے سالِ نو!
تُم ----
یاد رکھنا!!!

۔ فقیرِ بےنوا ۔

بانی مدیرِ اعلیٰ
سید ضمیر جعفری
مدیر مسؤل
گلزار جاوید
مدیرِ معاونین
بینا جاوید
فاری شا
محمد انعام الحق

چہارسُوچہارسُوچہارسُوچہارسُوچہارسُوچہارسُوچہارسُوچہارسُو

رابطہ: 537، ویسٹریج-III، راولپنڈی۔فون: 92-51-5462495 فیکس: 5490181 ای۔میل: chaharsu@gmail.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہار سُو

سرِ ورق، پسِ ورق ---------- شعیب حیدر زیدی
تزئین ---------- عظمیٰ رشید
کمپوزنگ ---------- تنویر الحق
کُتب شناسی ---------- انوار شریف

قرطاسِ اعزاز

خالقِ کل کا انعام ---------- قدر القادری ۳
سراب کی صورت ---------- فاری شا ۴
روشنی کا تسلسل ---------- وقار جاوید ۶
مادرِ علمی کے نام ---------- محمود شام ۹
آفتاب کی صورت ---------- صفوت علی صفوت ۱۳
براہِ راست ---------- گلزار جاوید ۱۸
پہلی جیل یاترا ---------- محمود شام ۳۴
بابِ سخن کھلا ہے ---------- گوپی چند نارنگ ۳۷
زمینی حقیقتوں کا اظہار ---------- محمد علی صدیقی ۳۹
زندگی کا رت جگا ---------- قتیل شفائی ۴۲
شبِ سیاہ گزار دے ---------- انور سدید ۴۴
وجودِ عدم کی سرحد پر ---------- سحر انصاری ۴۶
دل کے آنگن میں ---------- شاہدہ حسن ۴۹
بند گنبد میں آزادیٔ افعال ---------- شمشاد احمد ۵۲
جب کبھی خون میں ڈوبی مٹی ---------- محسن مگھیانہ ۵۵
ایک لمحۂ وصال ---------- فیصل عظیم ۵۹
صلیب اپنے شانوں پر ---------- عطیہ سکندر علی ۶۴

آغوشِ اجازت ۶۸

مشکور حسین یاد، محمود الحسن، عبداللہ جاوید، امین راحت چغتائی، آصف ثاقب، کرشن کمار طور، غالب عرفان، یوگیندر بہل تشنہ، جین جوہر، پرتپال سنگھ، ضیاء شبنمی، مناظر عاشق ہرگانوی، خیال آفاقی، سہیل غازی پوری۔

افسانے

عقبی آئینہ ---------- شہناز عابدی ۷۵
رزق کی دھوپ ---------- جاوید چودھری ۷۸
مکاں لامکاں کے درمیاں ---------- نصیر اعظم ۸۱
درد کا قصہ ---------- رینو بہل ۸۳
His Master`s Voice ---------- گلزار جاوید ۸۸

خوابِ ناتعبیر ۹۰

مہندر پرتاب چاند، تشنہ بریلوی، جواز جعفری، صدیق شاہد، حسیر نوری، کرشن پرویز، انیس الرحمٰن، شگفتہ نازلی، قاضی عنایت الرحمٰن، سجاد مرزا، عتیق الرحمٰن عتیق، سیفی سرونجی، انجم جاوید، شاہد رحمان، عتیق چشتی۔

رپوتاژ

نگینِ گم گشتہ ---------- طاہرہ اقبال ۹۵

انشائیہ

کند ہم جنس باہم جنس ---------- رؤف خیر ۱۰۰

باغِ ارم ۱۰۲

ستیہ پال آنند، علی کمیل قزلباش، عبدالعزیز خالد، کوثر صدیقی، شگفتہ نازلی، بھگوان داس اعجاز، زہیر کنجاہی، حفیظ انجم، خورشید انور رضوی، خالد حمید شیدا۔

آئینۂ فن

جینے کی ادا ---------- مامون ایمن ۱۰۸

نشانِ راہ

طوفانِ حوادث ---------- نند کشور وکرم ۱۱۱

رس رابطے :

جستجو، ترتیب، تدوین ---------- نازش فردوس ۱۱۵

☆

''خالقِ کُل کا انعام''

خالقِ کُل کا ہے تُو انعام شام
بن ترے حسنِ ادب ہے خام شام
جب بھی دیکھی ہے بہار شام! شام
لب پہ آیا صرف تیرا نام شام
تجھ سے مہکا گلشنِ شعر و سخن
تیری خوشبوئے سخن بے دام شام
جگمگاتا ہے اندھیری رات میں
جگنوؤں کی طرح تیرا نام، شام
ہر جہانِ جبر تیرا حرف حرف
بے محابہ امن کا پیغام شام
تو کہ مفہوم آشنائے زندگی
تیرا ہر آغاز ہے انجام شام
وہ جسے میں تیرا ہمسر کہہ سکوں
صبح آیا اور نہ آیا شام شام
ہیں مثالِ روزِ روشن تابناک
اِس جہانِ فن میں تیرے کام شام
قدر کی تجھ سے عقیدت کا ثبوت
قدرؔ کے اشعار تیرے نام شام

قدرالقادری
(کراچی)

قرطاسِ اعزاز محمود شام کے نام
قرطاسِ اعزاز محمود شام کے نام
قرطاسِ اعزاز محمود شام کے نام
قرطاسِ اعزاز محمود شام کے نام
قرطاسِ اعزاز محمود شام کے نام
قرطاسِ اعزاز محمود شام کے نام
قرطاسِ اعزاز محمود شام کے نام
قرطاسِ اعزاز محمود شام کے نام
قرطاسِ اعزاز محمود شام کے نام
قرطاسِ اعزاز محمود شام کے نام
قرطاسِ اعزاز محمود شام کے نام
قرطاسِ اعزاز محمود شام کے نام
قرطاسِ اعزاز محمود شام کے نام
قرطاسِ اعزاز محمود شام کے نام
قرطاسِ اعزاز محمود شام کے نام
قرطاسِ اعزاز محمود شام کے نام
قرطاسِ اعزاز محمود شام کے نام

''سراب کی صورت''

فاری شا (راولپنڈی)

مکمل نام:	محمد طارق محمود	
ازاں بعد:	محمود شام	
تاریخ ولادت:	۵فروری ۱۹۴۰ء	
والدِ گرامی:	صوفی شیر محمد	
والدہ محترمہ:	بشیر ن خاتون	
بہن بھائی:	محمد خالد مسعود	محمد طارق محمود
	سکینہ خالدہ	شاکرہ اسما
خاندادہ:	راجپوت	

والد محترم صوفی شیر محمد بھوپندر اطبیہ کالج پٹیالے سے فارغ التحصیل، ماہر طبّ وجراحت، ارسطو دواخانہ کے نام سے پٹیالے میں مطب تھا۔ ہجرت کے بعد جھنگ شہر (پنجاب) میں تادم آخر ۱۹۸۰-۱۱۶ اکتوبر۔ قیام پاکستان سے قبل پرجا منڈل کے پلیٹ فارم سے سیاست میں حصّہ۔ انگریز کی جیلوں میں قید کاٹی۔ پاکستان میں نیشنل عوامی پارٹی جمعیت علمائے اسلام سے وابستگی رہی۔ خان عبد الغفار خان۔ مولینا غلام غوث ہزاروی ہمارے ہاں بھی تشریف لائے۔ ہجرت اگست ۱۹۴۷ کے دوسرے ہفتے میں۔ اپنے بھرے پرے خاندان میں سے صرف والد گرامی۔ والدہ اور دو بھائی بچ کر آ سکے۔ راجپورہ۔ پٹیالے میں دیگر قریبی عزیز سب شہید کر دیئے گئے۔ ہجرت کے بعد چند روز لاہور۔ گجرات۔ منڈی بہاؤ الدین۔ پھر ۱۹۴۸ سے جھنگ۔ گورنمنٹ کالج جھنگ سے بی۔اے ۱۹۶۲ میں کر کے حصول تعلیم کے لیے لاہور۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں زیر تعلیم اور ساتھ ہی'' نوائے وقت'' پبلی کیشنز کے ہفت روزہ ''قندیل'' میں مدیر معاون کی حیثیت سے ۱۹۶۳ میں ملازمت۔ پھر ''نوائے وقت'' میں۔ ۱۹۶۷ء میں ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' میں ملازمت کے لیے کراچی آئے۔ پھر کراچی ہی مسکن اور مقدر۔

تعلیم وتربیت:

ابتدائی تعلیم۔ پرائمری۔ ایم بی پرائمری اسکول وارڈ نمبر ۷ جھنگ شہر۔ ۱۹۴۸ سے ۱۹۵۳۔ (چھٹی سے آٹھویں: ایم بی ہائی اسکول جھنگ شہر۔ یہیں سے ڈاکٹر عبدالسلام نے بھی میٹرک کیا۔ ۱۹۵۴-۱۹۵۶): (نویں دسویں۔ گورنمنٹ ہائی اسکول جھنگ ۱۹۵۷-۱۹۵۸۔ میٹرک اور ملک کا پہلا مارشل لاء ایک ساتھ) ایف اے۔ ۱۹۵۹-۱۹۶۰، بی اے۔ ۱۹۶۱-۱۹۶۲ گورنمنٹ کالج جھنگ، ۱۹۶۳-۱۹۶۴ ایم اے فلسفہ۔ گورنمنٹ کالج لاہور۔

قرآن پاک ناظرہ۔ عربی فارسی۔ مدرسہ انوار الاسلام۔ جو شام صاحب کے والد مکرم نے قائم کر رکھا تھا

۱۔ پہلا شعر: ۱۹۵۹ء

آدمی ہے حباب کی صورت
زندگی اک سراب کی صورت

۲۔ پہلی مطبوعہ تخلیق/غزل: ہفت روزہ ''قندیل''۔ ۱۹۶۰

۳۔ پہلی کتاب: کارڈیوسپازم۔ ۱۹۷۰

۴۔ پہلا مضمون: ہفت روزہ اقدام لاہور۔ ۱۹۶۱

۵۔ پہلی ملازمت: نذر سنز لاہور۔ پروف ریڈر۔ ۱۹۶۳۔ ۵۰ روپے ماہانہ

۶۔ پہلا انٹرویو: ڈاکٹر جاوید اقبال سے۔ ۱۹۶۴

۷۔ پہلا انٹرویو: ہندوستان ٹائمز۔ نئی دہلی ۱۹۷۴

۸۔ پہلا طویل سفر: چین۔ جنوری ۱۹۷۲

۹: پہلا ادبی اعزاز: کالج کے دور میں شاعروں میں پہلا انعام لیا۔ بعد میں اعزاز نہ لینے کا اصول اختیار کیا۔ جس پر آج تک قائم ہیں۔ کبھی کوئی کتاب کسی ایوارڈ کے لیے نہیں بھیجی نہ ہی سرکاری ایوارڈ کے لیے پیشکش قبول کی۔

شادی:

جولائی ۱۹۵۹ میں اپنی خالہ زاد بلقیس بانو سے۔ پہلی صاحبزادی۔ فرخندہ محمود۔ ۱۹۶۲..... قاسم محمود۔ ۱۹۶۶..... سلیم محمود۔ ۱۹۶۹..... نعیم محمود۔ ۱۹۷۱..... رخشندہ محمود۔ ۱۹۷۴

☆ فرخندہ محمود کی اولاد: عدیل۔ شرجیل۔ دانیال۔ عیدلینہ

☆ قاسم محمود۔ شادی کے لیے آمادہ نہیں ہوئے ہیں۔

☆ سلیم محمود کی اولاد: عمیرہ محمود۔ باسل محمود

☆ نعیم محمود: حال ہی میں شادی ہوئی ہے۔

☆ رخشندہ محمود کی اولاد: پرنیاں باشار۔ وجدان باشار۔

سفر در سفر:

(۱) چین ۱۹۷۲۔ (۲) بھارت، شملہ ۱۹۷۲۔ (۳) بھارت ۱۹۷۴۔ (۴) بھارت ۱۹۷۵۔ (۵) امریکہ ۱۹۷۴۔ (۶) روس ۱۹۷۵۔ (۷) ایران۔ ترکی۔ برطانیہ۔ سویڈن۔ ڈنمارک ۱۹۷۵۔ (۸) فرانس۔ بنگلہ دیش۔ رومانیہ۔ اٹلی ۱۹۷۶۔ (۹) افغانستان۔ لیبیا۔ سعودی عرب۔ کویت۔ ابوظہبی ۱۹۷۷۔ (۱۰) چین ۱۹۸۹۔ (۱۱) امریکہ ۱۹۹۰۔ (۱۲) ترکی ۱۹۹۰۔ (۱۳) افغانستان ۱۹۸۹۔ (۱۴) قطر ۱۹۹۰۔ (۱۵) دوبئی ۱۹۹۳۔ (۱۶) فرانس۔ کینیڈا۔ امریکہ ۱۹۹۳۔ (۱۷) برطانیہ ۱۹۹۳-۱۹۹۴۔ (۱۸) ملائشیا ۱۹۹۵۔ (۱۹) مراکش ۱۹۹۴۔ (۲۰) نیپال ۱۹۹۴۔ (۲۱) بنگلہ دیش ۱۹۹۰۔ (۲۲) سعودی عرب ۱۹۹۷۔ (۲۳) امریکہ ۲۰۰۳-۲۰۰۴-۲۰۰۵-۲۰۰۶۔ (۲۴) کینیڈا۔ ۲۰۰۳-۲۰۰۴۔ ۲۰۰۵-۲۰۰۶-۲۰۰۹ (۲۵) چین۔ تھائی لینڈ۔ کمبوڈیا۔ لاؤس ۲۰۰۴۔ (۲۶) برطانیہ۔ فرانس۔ سوئیزرلینڈ ۲۰۰۴۔ (۲۷) مصر ۲۰۰۳۔ (۲۸) جاپان ۲۰۰۶۔ (۲۹) ہندوستان جنوری ۲۰۰۷۔ (۳۰) ایران ۲۰۰۸۔ (۳۱) بلجیم ۲۰۰۸۔

اعزازات وانعامات:

احباب کی بے پناہ محبت

ملازمت اورادارت:

اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ہفت روزہ قندیل لاہور۔۱۹۶۳.....۱۹۶۴

میگزین ایڈیٹر۔روزنامہ نوائے وقت لاہور۔۱۹۶۵.....۱۹۶۶

اسسٹنٹ ایڈیٹر،ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی۔۱۹۶۷.....۱۹۷۵

ایڈیٹر۔ہفت روزہ کہسار کراچی۔۱۹۷۶.....۱۹۹۳

ایڈیٹر۔روزنامہ ''جنگ'' کراچی۔۱۹۹۴.....۲۰۰۰

گروپ ایڈیٹر۔'جنگ گروپ'۔۲۰۰۱تاحال

تصنیفات۔تالیفات۔تراجم

۱	آزاد شیرنی	Born Free کا ترجمہ۔ مکتبہ جدید لاہور	۱۹۶۴
۲	کارڈیو سپازم	طویل نظم	۱۹۷۰
۳	روبرو	مغربی ومشرقی پاکستان کے رہنماؤں کے انٹرویوز	۱۹۷۰
۴	آخری رقص	اپنی نظمیں۔غیر ملکی شاعری کے منظوم تراجم	۱۹۷۱
۵	لاڑکانہ سے کیلنگ	جناب ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ چند سفر	۱۹۷۲
۶	لاڑکانہ سے کیلنگ	انگریزی	۱۹۷۴
۷	کتنا قریب کتنا دور	شملہ مذاکرات۔وزیراعظم اندرا گاندھی کے انٹرویو کے لیے بھارت کا سفر	۱۹۷۵
۸	چہرہ چہرہ میری کہانی	غزلیں۔نظمیں	۱۹۷۵
۹	نوشتۂ دیوار	غزلیں۔نظمیں	۱۹۷۸
۱۰	بھٹو کے آخری ایام	بھٹو کے قریبی رفقا کے تاثرات	۱۹۷۹
۱۱	نئی آوازیں	نئے سیاسی رہنماؤں کے انٹرویوز	۱۹۸۷
۱۲	بے نظیر بھٹو The Way Out	انگریزی	۱۹۸۸
۱۳	بے نظیر بھٹو ایک ہی راستہ	اردو	۱۹۸۸
۱۴	قربانیوں کا موسم	غزلیں۔نظمیں	۱۹۹۰
۱۵	ایک تنہائی اقتدار	بے نظیر بھٹو کا پہلا دور حکومت	۱۹۹۱
۱۶	برطانیہ میں خزاں	سفرنامہ	۱۹۹۲
۱۷	تقدیر بدلتی تقریریں	قائداعظم سے بے نظیر بھٹو تک حکمرانوں کی اہم تقریریں	۱۹۹۳
۱۸	محلوں میں سرحدیں	غزلیں۔نظمیں	۱۹۹۹
۱۹	خواتین وحضرات	ادبی محفلوں میں پڑھے گئے مضامین	۱۹۹۸
۲۰	شب بخیر	اپنی طرز کا منفرد ناول۔صرف مکالمات	۱۹۹۹
۲۱	روبرو	۱۹۶۷ سے ۱۹۷۰ تک کے انٹرویوز کے ساتھ ۱۹۷۰ سے ۱۹۷۷ تک کے نئے انٹرویوز	۲۰۰۰
۲۲	ون ٹو ون	۱۹۷۸ سے ۲۰۰۲ تک کے انٹرویوز	۲۰۰۲
۲۳	بھارت میں بلیک لسٹ	کتنا قریب کتنا دور+آگرہ مذاکرات پاک بھارت تعلقات کی اہم دستاویزات کے ساتھ	۲۰۰۲
۲۴	امریکا سوچ رہا ہے	نائن الیون کے بعد امریکہ کا سرکاری سفر محکمۂ خارجہ،ہوم سیکورٹی کے دورے	۲۰۰۴
۲۵	مملکت اے مملکت	۱۹۹۷ سے ۲۰۰۷ تک کے اہم کالم	۲۰۰۷
۲۶	Visiting America mind	انگریزی	۲۰۰۵
۲۷	زلزلے کی دھول	۲۰۰۵ کے زلزلے پر لکھے گئے مضامین،غزلیں۔نظمیں	۲۰۰۶
۲۸	پاکستان پر قربان	بے نظیر بھٹو شہید کے ساتھ ۱۹۷۰ سے ۲۰۰۷ تک صحافتی وابستگی کی روداد	۲۰۰۸
۲۹	اپ سیٹ ۲۰۰۸	۹ مارچ ۲۰۰۷ سے ۱۸ اگست ۲۰۰۸ تک کی اندرونی کہانیاں	۲۰۰۹
۳۰	ایاں ایاں یو یو	بچوں کے لیے نظمیں بین الاقوامی معیار پر طباعت	۲۰۰۹
۳۱	سے ایک خط.....	مختلف ممالک سے اسی روز بھیجے گئے صحافتی تاثرات	زیر طبع
۳۲	منزلیں	منتخب نظمیں۔اردو۔رومن اور انگریزی ترجمہ	زیر تصنیف
۳۳	رقص لایعنی	لایعنی ردیف اور ایک ہی بحر میں لکھی گئی غزلیں	زیر تصنیف
۳۴	Meta Physics of Asghar Gondvi	انگریزی	زیر تصنیف

☆

''روشنی کا تسلسل''

وقار جاوید
(راولپنڈی)

۵۔جنوری،۲۰۰۱ء کراچی
محترم جناب محمود شام صاحب، تسلیم و نیاز

آپ کی جانب سے دخترِ نیک اختر کی شادی کا دعوت نامہ پا کر بے پایاں خوشی ہوئی۔ آپ کی بیٹی میری بیٹی ہے خدا کا شکر کہ آپ اس فرض سے سبکدوش ہو رہے ہیں۔ اللہ مبارک کرے اور زوجین میں دائمی محبت کا رشتہ استوار رکھے۔ آمین۔ میرا بیٹا آج کل فلائٹ پر ہے اگر وہ آ گیا تو میں اس پر مسرت تقریب میں شرکت کو سعادت سمجھوں گا۔ کہولت کی وجہ سے تنہا آنا جانا ممکن نہیں رہا۔ ویسے بھی یہ ناچیز ضیافت شکم سے زیادہ ضیافتِ طبع کا قائل ہے۔ اور یہ فریضہ آپ کی بلند پایہ تخلیقات بحسن و خوبی انجام دے رہی ہیں۔ ایک درخواست جو میں عرصے سے آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا تھا وہ اس عریضے کے ذریعے بصد احترام کرنا چاہتا ہوں کہ آپ شاعری کو اس قدر وقت اور توجہ نہیں دے رہے جس قدر آپ کے فنی جوہر کا تقاضا ہے۔

دعاؤں کا طالب
تابش دہلوی

۱۰۔جون ۱۹۷۸ء لاہور
محترمی، مکرمی شام صاحب، تسلیم

آپ کی نثری کتاب ملی۔ آپ نے ناحق دو جلدیں ارسال فرمائیں حالانکہ آپ پر اس پابندی کا اطلاق قطعاً نہیں ہوتا۔ انشاء اللہ جلد ہی اپنی رائے سے مطلع کروں گا اور فنون میں مختصر تبصرہ بھی شامل کروں گا۔ مختصر اس لیے کہ تفصیل کا وقت تاخیر کا باعث بن سکتا ہے۔ جیسا کہ آپ کو علم ہوگا کہ ہم آئندہ ستمبر میں ''فنون'' کا جدید غزل نمبر شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جدید غزل کے افق کو وسیع کرنے میں آپ نے بھی مؤثر حصہ لیا ہے اس لیے گذارش ہے کہ جولائی کے وسط تک پندرہ مطبوعہ یا غیر مطبوعہ منتخب غزلیں ارسال فرما کر شکریہ کا موقع دیجیے۔ غزلوں کے ہمراہ ایک تازہ تصویر اور حالات زندگی بھی ارسال کرنا نہ بھولیے۔ آپ کے تعاون کے بغیر یہ کارِ دشوار ہمارے لیے انتہائی دشوار ہوگا جو اردو ادب کی تاریخ میں ایک منفرد مقام حاصل کر سکے۔ بصد احترام

احمد ندیم قاسمی

۹۔نومبر ۱۹۹۷ء کراچی
شام جی! صبح مبارک!

ہم دو برس امریکہ میں قیام بلکہ خرام کے بعد وطن واپس آ گئے ہیں۔ پڑاؤ ملپر میں ٹھہرا جہاں ہمارا فوجی بیٹا احتشام ضمیر خیمہ زن ہے۔ ہم تو کب کے چھاؤنیاں چھوڑ چکے مگر چھاؤنیاں ہمیں نہیں چھوڑ رہیں۔ آپ سے ملاقات کو جی بہت چُلبلا رہا ہے۔ عین اُسی طرح جس روز آپ نے کراچی کو جھنگ مگھیانہ بنا دیا تھا سچ یہ ہے کہ اس روز آپ نے دوستی کا حق ادا کر دیا یعنی مگھیانہ کے ساتھ ہمیں بھی لانچ کر دیا۔ اگلے روز شام ہمدرد میں اپنے اس قطعے کا چرچا سنا جو کچھ دن ہوئے جھنگ کی نذر کیا تھا۔ دو اور قطعات آستین میں رکھ لیں۔ جناب ہمیں تو آپ وقفوں سے لگاتے رہیں۔ چھاپیں تو ترجیحات والے کو ترجیح میں سبقت دیں کہ یہ شاعروں کے بارے میں ہے۔ نام بھی بیشک نہ لکھیں۔ راولپنڈی جھنگ میں تو شورش ملک، ضمیریات ہی چلاتے رہے ہیں۔ ویسے تو رئیس امروہوی مرحوم کے بعد قطعہ کلامی کو قطع ہو جانا چاہیے مگر یہ سلسلہ انہی کا جاری کیا ہوا ہے۔ آپ تو جانتے ہو کہ ہماری قطعہ کاری کا سلسلہ رئیس صاحب کے انتقال کے بعد شروع ہوا ہے۔ خدا کرے ہمارے اختتام سے پہلے انجام کو پہنچ جائے۔

ضمیر جعفری

۲۹۔جولائی ۹۸ء جموں
محبِ مکرم محمود شام صاحب، آداب

''جنگ'' کراچی مڈویک میگزین میں اپنے دوست لطف اللہ خاں کے ٹرسٹ میوزیم کے بارے میں آپ کا عدیم المثال مضمون پڑھنے کے بارے میں آپ کو پہلے ہی خراجِ تحسین پیش کر چکا ہوں۔ اللہ اللہ کیا موزوں طبیعت پائی ہے۔ آپ کی شاعری کا میں عرصے سے دلدادہ ہوں۔ اس بار آپ کی نثر پڑھی تو دل و دماغ میں یہ کشمکش شروع ہو گئی کہ آپ کو شعر اور نثر میں سے کس چیز پر زیادہ قدرت حاصل ہے۔ ہر چند میں اس کا اہل نہیں کہ آپ جیسے بلند قامت شخص کے مقام کا تعین کروں البتہ یہ خواہش ضرور ہے کہ آپ کی نظم و نثر کا تفصیل سے مطالعہ کر کے خود کسی نتیجے پر پہنچ کر آپ کو قلمی خراجِ تحسین پیش کروں جس کے آپ بجا طور پر مستحق ہیں۔

جگن ناتھ آزاد

۳۱، دسمبر ۱۹۹۳ء لاہور
میرے بھائی محمود شام، سلام مسنون

ابھی ابھی ''ٹوٹ بٹوٹ'' ملا ہے۔ یہ ایک ایسا مسافر تھا جو میرے گھر کا راستہ بھول کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ واپس آیا ہے تو بے پناہ خوشی ہو رہی ہے اور دل سے آپ کے لیے دعائیں بھی نکل رہی ہیں کہ خداوند کریم آپ کے لیے اور آپ کے اہل خانہ کے لیے نیا سال مبارک کرے اور بھرپور خوشیوں

کی روشنیاں لائے۔ آپ میرے لیے محبت کی ایک نہایت تابناک کرن ہیں۔ خدا کرے آپ کا ذہن، آپ کا قلم ہمیشہ متحرک رہے۔

مرزا ادیب

۵، فروری ۱۹۹۴ء، سرگودھا

برادرم محمود شام صاحب، السلام علیکم

ممنون ہوں کہ آپ نے اپنا سفر نامہ بھجوایا اور نئے سال کا کارڈ بھی۔ یہ آپ کی محبت ہے کہ آپ مشرقی چلن کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔ میں آپ کی تخلیقات توجہ اور شوق سے پڑھا کرتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میں محبی ڈاکٹر انور سدید صاحب سے درخواست کروں کہ وہ ''اوراق'' کے آمدہ شمارے کے لیے آپ کی کتاب پر تبصرہ کریں تاکہ احباب سفر نامے کے ساتھ اس کے حسن و قبح پر بھی توجہ فرما سکیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے پچھلے دنوں ''معیار'' کے لیے کوئی تخلیق بھجوائی تھی۔ ریکارڈ چیک کر لیجیے میں غلطی پر ہوا تو دوبارہ بھجوا دوں گا۔

وزیر آغا

۶۔ مئی ۲۰۰۲ء، امریکہ

مکرمی محمود شام صاحب، آداب

آپ سے پہلی بار مخاطب ہو رہا ہوں۔ آپ سے قلم کا رشتہ ہے جس سے یہ تحریک ملی کہ آپ کو یہ خط لکھوں۔ میں ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتا ہوں۔ گجرات کے حالیہ افسوسناک مسلم کش فسادات نے اکسایا کہ ملفوف نظم لکھوں۔ یہ نظم ہندی میں ہے اور انڈیا کے کچھ ہندی روزناموں میں چھپ چکی ہے۔ اس کو اردو رسم الخط میں لکھنے پر اداس ہوا کہ کچھ ہندی الفاظ اردو قارئین کے لیے شاید اجنبی ہوں۔ میں نے سلسلہ وار معانی نظم کے آخر میں لکھ دیئے ہیں۔ شاید یہ ''جنگ'' کے لیے موزوں ہوں۔ شاید نہ ہوں۔ بہر حال اگر آپ چاہیں تو اسے جنگ کے صفحات میں جگہ دے سکتے ہیں۔ میں دو برس پہلے کراچی گیا تھا تو آپ کے دفتر میں شاہد شیدائی صاحب نے میرا انٹرویو ریکارڈ کیا تھا جو جنگ کے شمارے میں چھپا تھا۔ اگر یہ نظم آپ شامل اشاعت کریں تو کیا یہ ممکن ہے کہ مجھے اس کا تراشہ مل جائے۔

ستیہ پال آنند

۵۔ اکتوبر ۲۰۰۲ء، کراچی

برادر محترم محمود شام صاحب، سلامِ واجب

آج کے اخبار سے آپ کے بیگ کی چوری کا علم ہوا۔ خدا کرے چور پکڑا گیا ہو یا جلد از جلد پکڑا جائے۔ یقین جانیے مجھے بھی بے حد دکھ ہوا اور میں آپ کے لیے دست بہ دعا ہوں۔ ''جنگ'' کی اسی اشاعت میں ایک خوشی کی خبر بھی نظر سے گذری۔ ''ون ٹو ون'' کی اشاعت پاکستان کی تاریخ کا ایک الگ باب ہوگا۔ میں نے کتاب تو نہیں دیکھی لیکن بعض انٹرویوز نظر سے گزرتے رہے ہیں میری جانب سے بے حد مبارک۔ میں ان دنوں صاحب فراش ہوں اور ایک آنکھ کا آپریشن بھی کروایا ہے ورنہ آپ سے مل کر اپنے جذبات کا اظہار کرتا۔ میرے لائق کوئی کارِ خدمت ہو تو مجھے خوشی ہوگی۔ اربابِ جلسہ کو سلام اور مناسبات۔

شبنم رومانی

۳۰۔ نومبر ۲۰۰۲ء، اسلام آباد

ڈیئر محمود شام، محبتیں۔

تین روز قبل کراچی میں آوارہ گردی کرتے ہوئے جنگ کی بلڈنگ پر نظر پڑی تو نجانے کیوں شام بھیگنے سے پہلے شام سے ملنے اور ''بھارت میں بلیک لسٹ'' پر مبارک باد دینے کو جی چاہا۔ حالانکہ تم جیسے زاہدِ خشک سے ملنا میرے لیے کبھی بھی کشش کا باعث نہیں رہا۔ اب ذرا تم یہ بتلاؤ کہ کیف و سرور تمہیں بھاتا نہیں، حسن و عشق راس آتا نہیں، مشاعرے سے تمہارا مزاج لگّا کھاتا نہیں۔ دریافت کرنے کا سبب صرف یہ ہے کہ آئندہ اس طرح کی صورت حال درپیش ہو تو تمہیں کہاں تلاش کیا جا سکے۔ اس خط کے ذریعے ''بھارت میں بلیک لسٹ'' پر اس لیے مبارک بار قبول کر لو کہ تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں دیارِ غیر سے بے دخل کیا گیا۔ کچھ ہم جیسے بدنصیب بھی ہیں جن پر اپنے ہی وطن کی سرزمین حق بولنے کی پاداش میں کئی بار تنگ کی گئی۔

احمد فراز

۱۳، مارچ ۲۰۰۰ء، کراچی

محترم شام صاحب، اسلام علیکم

گذشتہ کل عجیب اتفاق سے سابقہ پڑا۔ ہنگامِ زندگی سے نبرد آزما ہوتا ہوا جب ویلکم بکڈپو اردو بازار کراچی پہنچا تو وہاں نئی کتابوں کے ہجوم میں ایک کتاب نے کچھ اس طرح اپنی جانب متوجہ کیا جس طرح سبزی اور فروٹ منڈی میں اشیاء بیچنے والے آواز لگا کر توجہ دلایا کرتے ہیں۔ ہر چند ایک شاعر کے لیے دوسرے شاعر کو مبارک دینا بڑے دل گردے کا کام ہے اور میں یہ کام کر گزرنے پر خود بھی حیران ہوں۔ ماشاء اللہ سرورق سے لیکر پس ورق تک کتاب کا ایک ایک صفحہ، ایک ایک شعر اور ایک ایک لفظ آپ کی جدت طرازی کی گواہی دے رہا ہے۔ میری جانب سے ''محلوں میں سرحدیں'' جیسے خوبصورت شعری مجموعے کی تخلیق پر مبارک بار قبول فرمایئے۔ اب اس خوبصورت حادثے کی تصویر کا دوسرا رخ دیکھیے۔ گھر پہنچ کر ڈاک کھولتا ہوں تو وہاں ''محلوں میں سرحدیں'' کو اپنا منتظر پاتا ہوں۔ پہلے تو جی میں آئی کہ الٹے پاؤں واپس جا کر خریدا ہوا نسخہ واپس کر کے اپنے پیسے کھرے کر لوں۔ پھر خیال آیا کہ اضافی پٹرول جلا کر پیسے وصول کرنے سے بہتر یہی ہے کہ کوئی عاشقِ شام تلاش کیا جائے اور خریدا ہوا نسخہ اس کی نذر کر دیا جائے۔ آپ کی بھیجی ہوئی جلد تو میرے

لیے اس سبب اہم ہے کہ اس پر آپ کے دستخط میرے نام کے ثبت ہیں۔

محسن بھوپالی

۱۷؍ستمبر ۱۹۹۶ء پشاور

برادرم شام صاحب! السلام علیکم

میرے لیے یہ خبر دکھ کا باعث ہے کہ باقاعدگی سے اپنی اشاعت جاری رکھنے والا ''معیار'' اچانک بند کس سبب ہو گیا ہے۔ ''معیار'' ۱۹۸۳ کے سال نامے میں میرے عزیز دوست ارشاد احمد صدیقی مقیم امریکہ کی طویل کہانی ''زختِ دل باندھ لو'' شامل اشاعت تھی۔ اگر ممکن ہو تو اس شمارے کی ایک کاپی ارشاد صاحب کو یا مجھے بھجوا دیں میں انہیں روانہ کر دوں گا۔ حال ہی میں جناب ادیب سہیل کی معرفت آپ کو ''جریدہ'' پشاور نمبر ارسال کیا ہے۔ اس شمارے میں پشاور پر میری طویل نظم شامل ہے اس کے بارے میں اپنی رائے سے ضرور مطلع کیجیے۔

تاج سعید

۴؍جون ۱۹۹۸ء کراچی

برادرِ محترم شام صاحب! السلام علیکم۔

حسبِ ارشاد ''انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا'' کی ایک کاپی پیشِ خدمت ہے۔ آپ اپنی نگرانی میں یہ صفحہ تیار کرائیں گے تو ایک شان نکل آئے گی کیونکہ آپ کی طبیعت میں جو نفاست اور شائستگی ہے وہ دوسروں کے ہاں مشکل سے ملتی ہے۔ میں قیصر زیدی صاحب سے کہوں گا کہ اس صفحے میں ''ویلکم'' کا ایک چھوٹا موٹا اشتہار بھی دے دیں۔ میرے حالات سے بہت کچھ واقفیت آپ کو ہے مزید درکار ہو تو منسلک ہے۔ محمود شام کے لیے دیکھئے پہلے اشاریہ صفحہ ۳۵ آگے لکھا ہے صفحہ ۸۵۸ اس صفحے پر آپ موجود ہیں۔ قوسین کا مطلب ہے ''دیکھئے''۔

قاسم محمود

۱۷؍جولائی ۱۹۹۵ء لاہور

پیارے شام جی! محبت۔

آج ہی کوریئر سے آپ کی نظمیں ملیں ہیں۔ یہ صبح کی بات تھی۔ اب شام ہو رہی ہے۔ میں ابھی تک نظموں کے حصار میں ہوں۔ جب اداسی بہت شدید ہو جاتی ہے تو میرا سر پھٹنے لگتا ہے۔ اس وقت بھی یہی عالم ہے مگر میں کوئی دوا نہیں کھانا چاہتا۔ نظموں کی اس اُداسی کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ دیر تک ..... بہت دیر تک.....!! ہم آپ اب صرف اداس ہی تو رہ سکتے ہیں۔ ''تخلیق'' تیار ہو چکا تھا..... مگر یہ نظمیں انشاء اللہ ضرور شامل ہوں گی۔ کوئی احسان نہیں.....! میرا اور تخلیق کا فخر اور مان ہے کہ آپ نے یہ نظمیں یہاں چھپوانا پسند کیں۔ خدا آپ کی شاعری کو تابندہ رکھے۔ مگر ایسے دکھ سمیت نہیں..... اور بہت سے پہلو ہیں دکھ کے..... کراچی تُو شاد رہ..... آباد رہ۔

اظہر جاوید

۲۲؍دسمبر ۱۹۹۸ء جرمنی

عالی وقار جناب محمود شام صاحب! آداب۔

طویل زمانہ ہوا، آپ کے نیاز حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ شائد آپ کو یاد ہو! اس دوران آپ کے منفرد لہجے کی دل کو چھو لینے والی نظمیں برابر مختلف جرائد کے توسط سے شرفِ مطالعہ عطا فرماتی رہیں۔ بلاشبہ آپ کے کلام میں اک عالمِ نُو کی دریافت کا سا خوشگوار عمل اپنی پوری حیرتا کیوں کے ہمراہ جلوہ افروز نظر آتا ہے۔ کئی بار حاضر ہو کر مبارکباد عرض کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر اس پر عمل نہ ہو سکا۔ کیوں کہ بہت زمانہ بیچ میں آ گیا تھا۔ اب آپ کے تحریر کردہ ناول کا چرچا بے اختیار مجبور کر رہا ہے کہ آپ کو مبارکباد کہنے کی جسارت کروں۔ اس قدر مصروفیات اور کثرتِ کار کے باوجود آپ کے ہاں ادبی کاوشوں کی فروزاں قندیلوں کا روشن رہنا، قابل توصیف و قابل رشک ہونے کے ساتھ ساتھ ادب سے کمٹمنٹ کی شاداب، سرسبز علامت ہے۔ خدائے واحد آپ کو مزید برکات سے نوازے۔ آمین۔ تاحال ناول، یورپ میں دستیاب نہیں، ورنہ ضرور فیض یاب ہونے کی کوشش کرتی۔ تاہم امید ہے کہ جلد ہی نظر نوازی کا موقع عطا ہو جائے گا۔ اپنے دو مضامین منسلک کرنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ دونوں آپ کی صوابدید پر ہیں۔ جو بھی سلوک آپ کو مناسب معلوم ہو ان کے ساتھ روا رکھیں۔ میری جانب سے آپ کو اور آپ کے لواحقین کو سالِ نو مبارک ہو۔ جرمنی میں اگر میں کسی قسم کی خدمت کر سکوں تو بلا تکلف ارشاد فرمائیں۔ مجھے مسرت ہو گی اور اسے رسماً مت جانیئے گا۔ ضیاء بھی سلام کہہ رہے ہیں۔

نعیمہ ضیاء الدین

۱۷؍فروری ۱۹۹۴ء راولپنڈی

مخدوم ما شام صاحب قبلہ، تسلیمات

خواہش یہ تھی کہ ''برطانیہ میں خزاں'' پر تبصرہ شامل اشاعت کر کے آپ کو شکریہ کا خط لکھوں افسوس فروری مارچ کا شمارہ پریس جانے کے بعد کتاب موصول ہوئی۔ بہ منظور خدا آئندہ شمارے میں ''برطانیہ میں خزاں'' پر تبصرہ سر فہرست ہو گا۔ کتاب کے بارے میں بہت سی لفاظی کی جا سکتی ہے یقیناً کی بھی گئی ہو گی، میں فقط اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کے زیر نظر کتاب میں خود کو پڑھوانے بلکہ منوانے کی خصوصیت اور قوت موجود ہے۔ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد قاری کے لیے کتاب کو چھوڑنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ بس اتنا فرما دیجیے کہ صفحات پر فراخ دل نظر آنے والے واقعی عملی زندگی میں بھی اتنے ہی روشن خیال ہوا کرتے ہیں۔

گلزار جاوید

مادرِ علمی کے نام

محمود شام

اے میری عظیم درسگاہ!

سب سے پہلے تو میں دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں کہ میں چار دہائیوں کے بعد مخاطب ہونے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ یہ واقعی ناقابل معافی جرم ہے اور یہ واقعی ناقابل قبول معافی ہے۔ صورتِ حال کی اس سنگینی کو سامنے رکھتے ہوئے میں یہ خط ڈاک کے سپرد کرنے کی بجائے خود پیش کرنے کے لیے حاضر ہو گیا ہوں۔

یوں تو میرے پاس سنانے کے لیے قریباً نصف صدی کی بہت سی کہانیاں ہیں بہت سے قصے ہیں۔ وہ پھر کبھی سہی فی الحال تو مجھے اس کیف کی لذت اٹھانے دیں جوان در و دیوار کی آغوش میں واپسی کے بعد مجھے حاصل ہو رہا ہے۔ یہ آپ کے سامنے کے باعث نہیں، بلکہ مجھے یہ اعتراف رہا ہے کہ اپنے ملک کے عالمی دارالحکومتوں کے ایوانوں میں بین الاقوامی اداروں کے اسٹیجز پر دنیا کی بہتری یا ابتری کا فیصلہ کرنیوالی بڑی بڑی شخصیتوں کے سامنے گفتگو کرتے ہوئے، اپنے دلائل پیش کرتے ہوئے، ایک صحافی کی حیثیت سے مجھے جو اعتماد حاصل رہا ہے وہ انہی برآمدوں اور کلاس رومز کی تربیت کا ثمر ہے۔ میرے دھیان میں استعاروں، تشبیہوں، خوشبوؤں کی جو محفلیں سجی ہیں اور ایک ندرت، جدت بھری شاعری تخلیق کر سکا ہوں میری نثر میں اگر کوئی چاشنی کسی نے محسوس کی ہے تو وہ اسی مادرِ علمی کی فضاؤں میں رچے ارمان کا فیض ہے۔

یہاں مجھے اردو اور انگریزی میں مباحثوں میں حصہ لینے کا جو موقع دیا گیا میں نے بولنا اسی سے سیکھا۔

مجھے یہاں کالج میگزین ''کارواں'' کی ادارت کی ذمہ داری دی گئی۔ میری آج تک کی ایڈیٹری کا تسلسل اسی سے ہے۔ یہاں شعری نشستوں میں مجھے اپنا کلام سنانے کی اجازت دی گئی۔ اور شاعری میں اپنی چھوٹی سی جگہ میں اسی لئے بنا سکا۔ 1958ء سے 1962 تک کے چار سال جہاں میری زندگی کے اہم سال ہیں وہاں میرے وطن کی تاریخ کا بھی یقیناً اہم عرصہ ہیں۔ لاکھوں افراد کی قربانیوں سے حاصل ہونے والے اس ملک میں پہلے سول دور کا خاتمہ اسی عرصے میں ہوا۔ پہلا مارشل لاء انہی برسوں میں نافذ ہوا۔ آئیں توڑنے کی روایت پہلی بار انہیں دنوں میں قائم کی گئی۔ یہ ہمارے ہوش سنبھالنے کے بعد پہلا مارشل لاء تھا ہماری جوانی کے لیے جبر کا پہلا موسم، لیکن یہاں اعتراف کرنا چاہیے کہ ابتداء میں یہ بہت اچھا لگا سمگلر پکڑے جا رہے تھے۔ سبزی گوشت سستے ہو رہے تھے، تجاوزات ہٹائی جا رہی تھیں، کھوکھے اٹھائے جا رہے تھے، ہر بچہ اپنی پیدائش کے وقت پیارا لگتا ہے۔ یہ کسے خبر ہوتی ہے کہ یہ بڑا ہو کر تباہی مچائے گا یا خوشحالی لائے گا۔ لوگوں کو آباد کرے گا یا برباد کرے گا۔

پہلا شخصی آئین بھی انہیں دنوں نافذ کیا گیا تھا۔ جس کے بارے میں کسی نے کہا تھا کہ اس آئین میں صدر کی حیثیت لائل پور کے گھنٹہ گھر کی سی ہے کہ کہیں سے بھی ہو کر آ جائیں سامنے گھنٹہ گھر ہی ہوتا ہے۔

انہی برسوں میں تین سالہ ڈگری کورس کا اعلان کیا گیا کہ بی اے دو سال کی بجائے 3 سال میں ہوگا۔ یہ ہم پر ہی نافذ ہوا ہم پر ہی ختم ہو گیا۔ اس سہ سالہ ڈگری کورس نے ہمیں کچھ سیاست اور کچھ احتجاج کی تربیت دی۔

مادرِ علمی! تیرے پھاٹک گواہ ہیں کہ ہم نے ساتھیوں کو کیسے جمع کیا، کیسے جلوس نکالے، شہر کی سڑکوں پر کیسے نعرے لگائے، پھر ہمیں کالج سے نکال بھی دیا گیا۔ یہ دو چار سخت مقامات تو عشق کے سفر میں آتے ہی ہیں۔ ہمارا احتجاج کامیاب رہا۔ سہ سالہ ڈگری کورس واپس لے لیا گیا۔ افسوسناک پہلو یہ کہ ان در و دیوار میں ایک اور سال گزارنے سے محروم رہ گئے۔

ان برآمدوں، کلاس رومز، روشوں، کھیل کے میدانوں اور لائبریری میں گزارے ہوئے دن ہی زندگی کے وہ سنہرے دن ہیں جو ہمیشہ یاد آتے ہیں۔ ڈسپلن میں رہنے کا اپنا لطف ہوتا ہے۔ ڈسپلن توڑنے کا لطف اس سے سوا ہوتا ہے۔

آج ہم بنیاد پرستی کے مخالف ہیں، لیکن اس وقت شکلاً بہت زیادہ بنیاد پرست تھے، کرتا، پاجامہ، سر پر رومال بندھا ہوا، ڈاڑھی کی ابتداء جو آج بھی اسی طرح ہے کبھی ہم سے جدا نہیں ہوئی ہے۔ سائز اور سٹائل تبدیل ہوتا رہا ہے۔ ہمارے بعض اساتذہ اس ہیئت کذائی پر اعتراض کرتے تھے۔ لیکن ہمیں اس سے اور مہمیز لگتی تھی۔ ادب، فکر اور آفاقیت سے دلچسپی رکھنے والے اساتذہ اس سے قطع نظر ہماری شاعری، سوچ اور ہم نصابی سرگرمیوں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ پاکستان ہی نہیں دنیا کے دیگر ملکوں کے بہت سے کالجوں اور درسگاہوں میں کبھی طالب علم، کبھی صحافی، کبھی مہمان خصوصی کی حیثیت سے جانے کا اتفاق ہوا ہے لیکن گورنمنٹ کالج جھنگ

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

یہ وہ زمانہ تھا جب زبان کے حوالے سے تفریق نہیں تھی نہ فرقوں کے اعتبار سے سب ایک گھاٹ پانی پیتے تھے، سب ایک ساتھ آگے بڑھتے تھے، پنجاب کے قدیم ترین ضلع جھنگ نے پسماندگی، ویرانی اور غربت میں نام تو پیدا کیا تھا لیکن فرقہ پرستی اور ایک دوسرے کی ہلاکتوں میں بہت پیچھے تھا۔

آج سے 41 برس پہلے کا کانووکیشن مجھے یاد آ رہا ہے۔ کھلے سبزہ زار میں، سردیوں کی دھوپ میں، گورنمنٹ کالج لاہور کے درویش منش پرنسپل ڈاکٹر نذیر احمد، مہمان خصوصی تھے۔ یہیں مجھے نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں

کئی انعامات کئی سرٹیفکیٹ ملے۔ کالج کے بہترین شاعر کالج کے بہترین اردو مقرر، فلسفہ و فارسی میں امتیاز میں بار بار انعامات وصول کرنے آیا تو مہمان خصوصی پوچھنے لگے کہاں کے رہنے والے ہو۔ آگے کیا ارادہ ہے۔

پھر اتفاق دیکھئے کہ اس سال ہمارے کلاس فیلو ضیاء الحق بی اے میں پنجاب بھر میں اول آئے۔ مادرِ علمی! تیرا نام پورے ملک میں چمکا، ہمیں بہت فخر محسوس ہوا۔ ہم نے پروگرام بنایا کہ ان کے ساتھ گورنمنٹ کالج جائیں گے۔ ان کو داخلہ وہیں ملنا چاہیے۔

ہمارے ساتھ مشکل یہ تھی کہ جھنگ سے لاہور جانے کے لیے بس کا کرایہ تک نہیں تھا۔ لیکن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ روزنامہ ''امروز'' میں شائع ہونے والی ایک غزل کے معاوضے کا منی آرڈر انہی دنوں میں موصول ہوا۔ نو روپے چودہ آنے۔ کل معاوضہ دس روپے تھا۔ دو آنے منی آرڈر فیس کے وضع کر لئے جاتے تھے۔ پانچ روپے لاہور تک کا کرایہ تھا۔ لاہور جانے کا انتظام تو ہو گیا تھا۔ ٹھہرنے کا ایک دوست نے اہتمام کروالیا تھا۔ آگے پڑھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ کیونکہ مارکس شیٹس جو داخلے کے لیے ضروری تھی اس پر بھی تیس روپے لگتے تھے۔ جن کا حصول ایک پہاڑ سر کرنا لگتا تھا۔ گورنمنٹ کالج جھنگ کے چند بیٹے ڈاکٹر نذیر احمد پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور کے دفتر جا پہنچے۔ سلام دعا کے بعد مدعا بیان کیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے پوچھا تو محمود شام ہو نا؟

''جی''

جھنگ کے کانووکیشن میں تم نے خاصے انعامات لئے تھے؟

''جی''

میں نے تمہاری غزل ''ماہ نو'' میں پڑھی۔ بہت مختلف اور نئی imageries تھیں۔ چلو میں تمہیں لوگوں سے ملواتا ہوں۔

میں نے عرض کیا کہ میں تو ان ساتھیوں کے ہمراہ آیا تھا۔ میں تو داخلہ نہیں لے رہا ہوں۔

کہنے لگے کہ ان کا کام ہو جائے گا تم میرے ساتھ چلو۔

انہوں نے کرسی چھوڑی۔ اپنا سیاہ گاؤن پہنا اور مجھے ساتھ لے کر چل پڑے۔ میں اپنی جگہ حیران بھی، پریشان بھی گورنمنٹ کالج لاہور کے برآمدوں، محرابوں کی ہیبت میرے اندر سنسنی پھیلا رہی تھی۔ گاؤن پہنے ایک اور شخصیت سامنے آئی یہ پروفیسر صدیق کلیم ہیں اور یہ محمود شام ہیں۔ ان کی غزل آپ نے پڑھی ہوگی۔ یہ داخلہ لینے آئے ہیں۔ غزل جس کا بار بار ذکر ہو رہا تھا یہ تھی۔

عمر گزری کہ تری دھن میں چلا تھا دریا
جا بجا گھومتا ہے آج بھی پگلا دریا
بنتی جاتی ہیں گہر کتنی ہیں بھولی یادیں
یہ مرا دل ہے کہ ٹھہرا ہو گہرا دریا
نہ کسی موج کا نغمہ ہے نہ گرداب کا رقص
جانے کیا بات ہے خاموش ہے سارا دریا
تھل کے سینے پہ پگھل جاتی ہے جب چاند کی برف
دور تک ریت پہ بہتا ہے سنہرا دریا
یہ ہواؤں کی پر اسرار صدا' ہانپتی شب
ہر طرف گونجتے سناٹے یہ تنہا دریا
ہائے وہ رنگ بھرے پیار کے مسکن باتیں
ہائے وہ ناؤ سے رہ رہ کے لپٹتا دریا
شام آکاش پہ جب پھیلتا ہے دن کا لہو
ڈوب جاتا ہے کسی سوچ میں بہتا دریا

پھر علاؤ الدین کلیم سے اسی طرح کی ملاقات اور بالآخر ہم کالج ٹک شاپ پر جا پہنچے جہاں پروفیسر قیوم نظر بیٹھے تھے۔ بھئی یہ محمود شام ہیں۔ یہ داخلہ لے رہے ہیں۔

قیوم نظر کہنے لگے: میرا مسئلہ تو حل ہو گیا۔

ہمیں کچھ خبر نہیں تھی کہ یہ مسئلہ کیا ہے' بخوشی تو ہو رہی تھی کہ جن بڑے لوگوں کی نظمیں، غزلیں، افسانے، تحریریں پڑھتے آ رہے ہیں ان کے درمیان بیٹھنے کا موقع مل رہا ہے لیکن داخلے کی فیس کہاں سے لاؤں گا کتابوں کے پیسے کیسے ملیں گے۔

میں اسی رات ڈاکٹر نذیر احمد کے بنگلے پر لا گیا اور صورتِ حال بیان کی۔ کہنے لگے صرف فیس کا انتظام کر لو اگر ہو سکتا ہے۔ کتابوں وغیرہ اور دیگر اخراجات کی فکر نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ نے کرم کیا۔ فلسفے میں داخلہ مل گیا اور پھر فلسفے میں بی اے میں اچھے نمبروں کے باعث سرکار نے وظیفہ جاری کر دیا۔ جو اے عظیم کالج' تیری تربیت کی ہی بدولت تھا۔ اس وظیفے سے بہت سے ادھار چکا دیئے اور آئندہ کے لئے پریشانیوں سے نجات مل گئی۔

لذیز بود حکایت رد راز تر گفتم

گورنمنٹ کالج لاہور جیسی دنیا کی منتخب اور مثالی درس گاہ میں داخلہ صرف ان در و دیوار کی شفقت اور جھنگ میں لکھی گئی ایک غزل کے موجب ہی ملا تھا جس کالج سے علامہ اقبال، پطرس بخاری، فیض احمد فیض، ن م راشد، ڈاکٹر عبد السلام، حنیف رامے وابستہ رہے ہوں۔ اس کا حوالہ کسی کو مل جائے تو یہ اس کے لیے شرف ہی ہے۔ پھر ''راوی'' کے اردو حصے کی ادارت بھی ہمیں سونپ دی گئی اور ہم برصغیر کے بڑے ادیبوں شاعروں کی صف میں ایک نقطہ پر کھڑے ہو گئے۔

اس عرصہ میں ہمارا اس درسگاہ میں آنا جانا رہا لیکن فاصلے بڑھتے رہے۔ حالات بدلتے گئے ادب پر صحافت کا غلبہ ہو گیا۔ ہم نے اپنے اس تعلق کو

کبھی چھپایا نہیں بلکہ اس کا برملا اظہار کیا۔ شاعری کا پہلا مجموعہ شائع ہوا ''چہرہ چہرہ مری کہانی''، ریڈیو پاکستان کراچی اسٹیشن پر مرحومہ پروین شاکر نے انٹرویو کرتے ہوئے اس وقت غزلیں کم لکھنے کی وجہ پوچھی تو ہم نے کہا تھا کہ جھنگ کی سرزمین دولت، خوشحالی سے محروم تھی لیکن خیالات تصورات سے مالا مال تھی۔ وہاں تخلیقی سرگرمی زیادہ تھی۔ لاہور اور کراچی کے ہنگامے اور شور تخیل کو پرواز نہیں کرنے دیتے۔ انہوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔

ذہن کی ہر تہہ میں کتنے رنگِ تھے
وہ بھی کیا دن تھے کہ جب ہم جھنگ تھے
جتنے غم تھے اتنے ہی تھے حوصلے
دل کھلے تھے ..... ہاتھ گرچہ تنگ تھے
رات ' چوپالیں' الاؤ' شاعری
زندگی کے کیا سہانے ڈھنگ تھے
پہلے نظروں میں کہاں تھی یہ چُبھن
اور لفظوں میں کہاں یہ ڈنگ تھے
اب تو آنکھیں بھی ہماری خشک ہیں
پہلے دریا بھی ہمارے سنگ تھے

ان چالیس برسوں میں صرف پاکستان ہی نہیں دنیا میں دور دور تک گھوم آئے ہیں۔ پاکستان جب ایک تھا، مشرقی پاکستان کے مختلف شہروں میں' بھارت میں' چین' امریکہ' برطانیہ' ہر جگہ پاکستان کے بعد جھنگ کا ہی حوالہ شناخت بنتا ہے۔ کوئی نہ کوئی مل جاتا ہے، تسی جھنگ دے او۔ نا'۔ جی۔ وہ اپنا بتاتے ہیں کہ ہم فلاں فلاں سن میں جھنگ میں رہے۔ جھنگ اب کیسا ہے کچھ ترقی کی ہے یا نہیں۔

میں دوسروں کی بات کیا کروں میں نے خود اپنی اس سرزمین کے لیے کیا کیا ہے۔ اس دھرتی نے مجھے شاعری دی، پہچان دی، عزت دی، شہرت دی میں نے اسے کیا دیا۔

جھنگ ہی کیا' اس مملکت پاکستان نے ہمیں پناہ دی' امان دی' عزت دی' ہم نے اس کے لیے کیا کیا۔

یہ سوال اپنے آپ سے کرنے کی بجائے ہم میں سے اکثر یہ رونا روتے ہیں۔ اس ملک میں کچھ نہیں رکھا۔ اس ملک نے یہ کر دیا۔ یہاں تو زندگی اجیرن ہے۔

یہ کفران نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مملکت کی شکل میں ایک جنت دی ہے۔ جسے ہم لوگ کبھی کبھی جہنم بنا دیتے ہیں ورنہ یہاں کس چیز کی کمی ہے۔ لہلہاتے سونا اگلتے کھیت، گنگناتے، بنجر زمینوں کو سیراب کرتے دریا۔ سرسبز پہاڑ، دل لبھاتی وادیاں، سونا، تانبا، گیس، تیل چھپائے پہاڑ، ریگ زار، خوبصورت ساحل، ٹھاٹھیں مارتا سمندر، دنیا میں کسی کے پاس سمندر نہیں ہے۔ کوئی پہاڑوں سے محروم ہے کوئی ریگ زاروں کو ترستا ہے۔ کہیں زمین بے آب و گیاہ ہے۔ یہ زمین پر ایک فردوس ہے۔ وہی محنت جو ہم غیر ممالک میں جا کر کرتے ہیں۔ وہی ڈسپلن جس کا مظاہرہ ہم دوسری سرزمینوں پر کرتے ہیں۔ اس محنت، ڈسپلن اور خلوص کا مظاہرہ اگر ہم یہاں کریں تو ہم اس دھرتی سے جانے کتنے دوبئی، کویت، مانچسٹر، کیلی فورنیا، نیویارک، ٹورنٹو تعمیر کر سکتے ہیں۔ پھر ہمارے بچوں کے سات سمندر پار ہزاروں میل دور جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ تھوڑے لکھے کو بہت جاننا چاہیے۔ طالب علم آتے ہیں چلے جاتے ہیں۔ درسگاہیں ندیوں کی طرح رواں رہتی ہیں۔ ان کے کناروں پر بستیاں آباد ہوتی رہتی ہیں۔

مجھے چناب نے پالا تو سندھ نے سینچا
مرے مزاج سے دریا دلی کبھی نہ گئی

میں نے کافی دنیا دیکھ لی ہے طاقت کے قریباً تمام مراکز میں گھومنے کا موقع ملا ہے۔ لیکن جھنگ شہر سے آدیوال آتے ہوئے ریت کے ٹیلوں کی softnen کبھی نہیں بھولی۔

ایک عجیب نفسیاتی کیفیت ہے۔ کہ 1948 سے 1962ء، 14 سال تک میں جھنگ کے جس گھر میں رہا ہوں اس کے بعد 40 سال تک ہر خواب کا لینڈ سکیپ اس گھر سے ترتیب پاتا ہے۔ یہ تو خوابوں کی تعبیر کے ماہر بتا سکتے ہیں کہ کتنے سال تک یہ کیفیت رہتی ہے۔ امریکی صدر ہوں، بھارت کے وزیر اعظم، ہالی وڈ کی ہیروئنیں یا علمائے کرام خوابوں میں ہماری ان سے ملاقات اسی گھر میں رہتی ہے۔

میں نے بدلے ہیں کئی شہر بھی گھر بھی لیکن
اب بھی آتا ہے وہی جھنگ کا گھر خوابوں میں

تحت الشعور۔ لاشعور کی اصطلاحات ہمارے شعور میں انھیں کلاس رومز سے داخل ہوئی تھیں۔ میں تو اب بھی اپنے آپ کو ایک طالب علم ہی سمجھتا ہوں۔ ہر روز ہر لمحے کچھ نہ کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ اپنے آپ کو سنوارنے میں مدد ملتی ہے۔

آنکھ رکھتا تھا کھلی اور طبیعت موزوں
تجربے دوسرے کرتے تھے سنورتا میں تھا

ہم بحیثیت قوم بھی دوسروں کے تجربوں سے سنور سکتے ہیں۔ کہنے کو تو مجھ سمیت سب ہی کہتے ہیں کہ پاکستان کی تاریخ ہی کتنی ہے۔ پچپن، چھپن سال تو قوموں کی زندگی میں کچھ بھی نہیں ہوتے۔ امریکہ کو دو سو سے زیادہ سال لگے آج کی پوزیشن میں پہنچنے کے لیے۔ برطانیہ چار سو سال بعد اس جمہوری مقام تک پہنچا ہے۔ تو کیا ہمیں بھی اتنا انتظار کرنا ہوگا۔ آج کی تیز رفتار زندگی۔ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں اس طویل سفر کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ تجربے برطانیہ اور امریکہ اور دوسرے ملکوں نے کر لیے۔ ہم ان سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ آنکھ کھلی اور طبیعت موزوں رکھنے کی ضرورت ہے۔ ہم آزاد تو ہو

چکے لیکن ذمہ دار شہری بننے کو تیار نہیں ہیں۔ اس زعم میں مبتلا رہتے ہیں کہ میں تو ٹھیک ہوں۔ دوسروں کی اصلاح کرنی چاہیے۔ سب سے زیادہ ذمہ داریاں تو ہم حکومت پر ڈالتے ہیں۔ حکومت میں جانے والے بھی تو ہم میں سے ہی جاتے ہیں۔ یا ساری خرابیوں کی ذمہ داری ہم فوج پر ڈال دیتے ہیں۔ وہ بھی ہم میں سے ہی ہیں۔ یا سب سے بڑے صوبے کو سب بڑی ناانصافیوں کا ذمہ دار ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں اب تک ایک ذمہ دار سول سوسائٹی پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ خیال ہم نفساں Fellow feeling نہیں ہے۔ ہم ہر دوسرے پر شک کرتے ہیں۔ اسے کسی سازش میں مصروف رکھتے ہیں۔ امریکہ یورپ پ میں ہر ایوینو۔ ہر گلی میں ہر پاس سے گزرتا یا گزرتی، مسکراہٹ کا تبادلہ کرتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو کنکھیوں سے یا معاندانہ انداز میں دیکھتے ہیں۔ ہاتھ ملانے کے بعد اپنی انگلیاں گنتے ہیں۔

مادرِ علمی! میں حاضر ہوں۔ اپنی کوتاہیوں، خامیوں، گناہوں کے اعتراف کے ساتھ۔

میں نے تو ہمیشہ اپنے گریبان میں جھانکا ہے۔ یہی دیکھا ہے کہ میں نے کہاں کہاں غلطی کی ہے۔ ہر رات سونے سے پہلے اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کہ صبح جو عزائم لے کر نکلا تھا۔ ان میں سے کتنے پورے ہو سکے۔

میرے والدِ محترم! جو یہیں جھنگ شہر میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ ہمیں فکر نہیں ہونی چاہیے۔

کارساز ما بفکر کارما
فکر ما در کار ما آزارِ ما

اس یقین نے مجھے تو ہمیشہ طاقت دی ہے۔ بڑے بڑے بحرانوں میں، مشکلات میں بھی گھبراہٹ طاری نہیں ہونے دی۔

جو بھی ہونا ہے مری جان رہے گا ہو کر
فکر انجام کو کیوں روگ بنائیں اپنا

ایک آیت کا ورد اپنے گھر میں ہوتے دیکھا تھا۔ اب بھی یہی آیت بے اختیار زبان پر آ جاتی ہے

وافوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد

اس آیت نے ہمیشہ دل کو سکون دیا ہے۔ کئی کئی امتحانوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔

میں حاضر ہوں۔ اپنی تمام کوتاہیوں، لغزشوں کا اعتراف کرتے ہوئے۔ لیکن اس افتخار کے احساس کے ساتھ کہ میں نے اپنے شہر۔ اپنی درسگاہوں اور اپنے عظیم وطن کے نام اور وقار کو بلند کیا ہے۔ کبھی ان سے وابستگی پر کسی معذرت، ندامت کا نہیں۔ پورے اعتماد اور فخر کا اظہار کیا ہے۔

اپنا خط میں اسی افتخار پر سمیٹتا ہوں۔ انشاءاللہ حاضری دیتا رہوں گا۔

''کہانی اختتام کو پہنچ گئی ہے''

میری ماں میرے وطن کے بارے میں بھی بہت سے ڈاکٹر مجھے ایسی مایوس کن اطلاعات دیتے رہتے ہیں لیکن میں ان کی بات نہیں مانتا ہوں اس ماں نے مجھے جنم دیا اس ماں نے مجھے شناخت دی، عزت دی، تحفظ دیا یہ ماں جس کا آخری وقت آن پہنچا ہے اس نبی نوع انسان سے تعلق رکھتی ہے جن کی منزل فنا ہے ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ میری ماں کا آخری وقت آن پہنچا لیکن میری ماں میری دھرتی میرے وطن کو ابد آباد تک رہنا ہے۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ آپ کو جو کچھ پڑھنا ہے پڑھ لیجئے۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کے سی سی یونٹ کے ایک کیبن میں اب صرف میں ہوں اور ایک بیڈ پر شفقت، محبت، پیار، انکسار، ایثار، بے لوثی، بے غرضی، کرم، احسان کے اکیاسی سال ہیں ایک اسکرین پر سبز منحنی لائنیں اس دل کا اتار چڑھاؤ بتا رہی ہیں جو میرے لیے میرے بھائی بہنوں کے لیے ہمیشہ درد اور لطف سے معمور رہا۔ یہ دل کے مدوجزر ہیں یا اس زندگی کی کہانی جو غیر منقسم ہندوستان سے شروع ہوتی ہے تحریک پاکستان کے جدوجہد سے بھرپور دنوں سے گزرتی ہے جب جواں سال شوہر آزادی کے عشق میں شہر شہر جذبات کو گرما رہا ہے، جب خونیں فسادات شروع ہو گئے ہیں جب چند افراد کے علاوہ خاندان کے باقی تمام لوگ پٹیالے اور راجپورے کے مقتلوں میں تہہ تیغ کر دیئے گئے ہیں۔ دل پڑھنے والی مشین کہہ رہی ہے کہ دل ڈوب رہا ہے کہانی اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے۔

(''پاکستان پر قربان'' سے اقتباس)

''آفتاب کی صورت''

جناب محمود شام کے کلام سے انتخاب اوّل

صفوت علی صفوت (یو۔ایس۔اے)

۔اولین غزل۔

آدمی ہے حباب کی صورت
زندگی اک سراب کی صورت

دل حریفِ سکون رہتا ہے
اک بپھرتے چناب کی صورت

تیری آنکھیں شراب کے ساغر
تیرے عارض گلاب کی صورت

ہجر میں انتظار کی زحمت
قرب میں اضطراب کی صورت

چاندنی کی پکار بھی سنتے
کاش ہوتی نہ خواب کی صورت

عشق سے پہلے ایک ذرّہ تھا
آج ہوں آفتاب کی صورت

(۱۹۶۰۔موسمِ سرما)

○

ڈنر پہ آج کوئی اس سا آشنا بھی نہ تھا
وہ اس سے پہلے اگرچہ کہیں ملا بھی نہ تھا

مجھے نہ جانے وہ سینے میں کیوں لگائے پھرے
میں کوئی گل بھی نہ تھا' موجۂ ہوا بھی نہ تھا

اسی نے آج بتایا مجھے کہ کون ہوں میں
وہ جس کو آج سے پہلے میں جانتا بھی نہ تھا

کہاں ہو کیوں ہو ہر اک سانس پوچھتی ہے مجھے
کبھی میں اپنے سوالوں میں یوں گھرا بھی نہ تھا

کسی کی میز پہ ہی رہ گئی نہ جانے کیوں
وہ ڈائری کہ ابھی جس پہ کچھ لکھا بھی نہ تھا

تمام شہر صداؤں کے اک بھنور میں ہے
مرا مکان کبھی ایسے ڈولتا بھی نہ تھا

وہ جس کی دھن میں ہم اتوار کو بھی گھر نہ رہے
ملا تو اپنی طرف شام دیکھتا بھی نہ تھا

(۱۹۶۱)

○

ڈپارٹمنٹ میں آخری دن

(وجودی نظموں میں سے ایک)

''ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں
ذرا بس سفر کے لئے مل پڑے ہیں
سفر کی رفاقت کوئی عمر بھر کی رفاقت نہیں ہے''
یہ پہلی حکایت تھی: ہم نے جو خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو سنائی تھی
رستے کڑے،
دندناتے ہوئے فاصلے
اور خاموش نظروں سے کوئی حکایت نہ پھوٹی
کہ ''سورج'' کی جلتی ہوئی آنکھ ایک اک قدم گھورتی تھی
کبھی ہم نے سوچا: کہ یہ ''لاگ کے نظریاتِ سیاست'' بڑی شے ہے
لیکن سفر میں کڑی دھوپ کا سامنا بھی بڑا جانگسل ہے
کبھی برگساں کے تغیر نے اپنے دلوں کو لبھایا
''کہ ہم لمحہ لمحہ بدلتے ہیں
اور زندگی سمبلوں کے توسط سے آسان کٹتی ہے
منطق یہ کہتی ہے
لیکن یہ فلسفہ ایک بکواس ہے
جب تلک آدمی اپنے رستے کے پتھر اٹھائے نہ اپنے ارادوں میں آزاد ہو
اور جب سارت نے یہ سمجھایا: میں اپنے لئے آپ سب کچھ ہوں''
تو ہم بڑے خوش ہوئے
اور اپنے سفر میں ہم اپنے ہی دل سے اجالے کے طالب ہوئے
سفر ختم ہونے لگا
اور ہمیشہ ہمیشہ کی خاطر بچھڑنے کا ڈر سائے بن کر لرزنے لگا
تو ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے
اور خاموش نظریں بھی الفاظ میں پھیل کر داستان بن گئیں
''ہم سفر کے لئے ہی ملے تھے
مگر ایسا لگتا ہے صدیوں سے ہم آشنا ہیں
سفر کی رفاقت اگر عمر بھر کی رفاقت ہے بنے تو.....
مگر یہ سفر ختم ہونے کو ہے
سامنے اک سمندر ہے.....سب اس میں ملنے چلے ہیں
مگر میں سمندر میں ملنے کا قائل نہیں ہوں
اگر تم بھی.....''

(جون۔۱۹۶۴)

تیز مت چل ابھی اے بادِ عشق

ایڈریان مورئن

میں کہ اِک ناتواں سی لڑکی ہوں
ابھی دہلیز پَر جوانی کی
پاؤں رکھتے بھی ہچکچاتی ہوں

یہ جوانی کے چیختے طوفاں
اپنے نازک وجود سے روکوں
مجھ میں سیکھو ہے اتنی تاب کہاں

کپکپاتے ہیں میرے ہاتھ ابھی
شرم سے سرخ ہیں میرے رُخسار
خوف کتنے ہیں میرے ساتھ ابھی

جسم کی شاخ پر لگی کلیاں
کھل کے ہنسنا ابھی نہیں سیکھیں
ابھی ویراں ہی پیار کی گلیاں

بار ہے کمسنی کا بانہوں پر
تیز مت چل ابھی اَے بادِ عشق
اجنبی ہُوں وفا کی راہوں پر

(۱۹۶۸)

○

ایک مرثیہ

(مشرقی پاکستان میں بہنے والے خون پر)

سلام اے شہیدو
سلام اے شہیدو
کوئی رنگ بھی تھا
کوئی نام بھی تھا
کوئی بھی زباں تھی
کوئی ذات بھی تھی
.....کہ تم کوئی بھی تھے
تمہارے لہو کی مہک ایک ہی تھی
تمہارے لُہو کا تو رنگ ایک ہی تھا
کہ تم کوئی بھی تھے
کوئی نام بھی تھا

تمہارے لُہو میں مِری آبرو تھی
تمہارے بدن میں مِری زندگی تھی
سلام اے شہیدو!
سلام اے شہیدو!
تمہارا لُہو رائیگاں
قبر تک بے نشاں
اور ہماری جبینوں پہ کوئی ندامت نہ فکرِ زیاں ہے
تمہارے لئے بھی کسی ماں کا سینہ تڑپتا تھا
دل کانپتا تھا
تمہارے جنم پہ بھی ماں باپ نے سینکڑوں خواب دیکھے تھے
تانے بُنے تھے
تمنائیں کی تھیں
مگر گولیوں، دمدموں اور ٹینکوں کی نظروں میں سب ایک ہیں
آگ برسی تو ہر جسم جلنے لگا
خوں اُبلنے لگا
اور لُہو تو لُہو تھا
کوئی رنگ تھا نہ کوئی نسل تھی
بھائی کا خون تھا
بھائی کی گولیاں تھیں

سلام اے شہیدو!
سلام اے شہیدو!
تمھیں یاد اب کون ھم میں کرے گا
تمہارا لُہو رائیگاں
قبر تک بے نشاں
ھم اگر یاد رکھیں گے تو یہ
کہ تم کیا زباں بولتے تھے.....؟
بہاری تھے.....؟
بنگال کے تھے.....؟

سلام اے شہیدو
سلام اے شہیدو

(۲۰ فروری ۱۹۷۲ء)

میری دھرتی، مرے آبا کی زمیں

(راجپورہ (بھارت) میں ۲۵ برس بعد اپنا گھر دیکھ کر)

وہی دیوار و در و بام وہی پیڑ مگر
اپنے بچھڑے ہوئے چہروں کو کہاں سے لاؤں
ان کی مٹی ہے، نہ خوشبو ہے، نہ سایا ہے کہیں
اپنے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو کہاں سے لاؤں
تیرے بیٹے، وہ مرے بھائی ہیں اے شہر کہاں
اپنی بانہوں، تری آنکھوں کو کہاں سے لاؤں
چلمنو! یاد تو ہوگی تمہیں ان کی عفّت
اپنی بہنوں کی دعاؤں کو کہاں سے لاؤں
اجنبی بن کے میں اپنا ہی مکاں تکتا ہوں
آہ! بیتے ہوئے لمحوں کو کہاں سے لاؤں

میری دھرتی، مری بستی، مرے آبا کی زمیں
میرا بچپن، میری یادیں، مجھے واپس کر دے
تجھ سے اب توڑنے آیا ہوں میں سارے رشتے
اپنی بیٹی کے تقدّس کی حفاظت نہ کرے
وقت پڑ جائے تو بیٹوں کا لہو پی جائے
ایسی دھرتی سے کوئی کیسے تعلق رکھے
میرا بچپن، میری یادیں، مجھے واپس کر دے
تجھ سے اب توڑنے آیا ہوں میں سارے رشتے

(۱۹۷۴)

غزل مسلسل

پھیلتا جاتا ہے اک لمحہ جو ڈھلتا ہی نہیں
وقت یوں ہم پہ رکا ہے کہ بدلتا ہی نہیں
(۱۹۷۱)

مرحلے کتنے کڑے، کتنے کٹھن طے بھی ہوئے
پھر بھی اک خوف عجب خوب کہ ٹلتا ہی نہیں
(۱۹۷۲)

ایک یہ آنکھ جو ہر رنگ میں کھو جاتی ہے
ایک یہ دل جو کسی طور بہلتا ہی نہیں
(فروری ۱۹۷۴)

لوگ آہٹ پہ ہی آ جاتے تھے گلیوں میں کبھی
اب تو چیخیں بھی کوئی گھر سے نکلتا ہی نہیں
(مئی ۱۹۷۴)

روشنی میں بھی تسلسل نہیں اب تو لوگو
اک دیا بجھتا ہے پھر دوسرا جلتا ہی نہیں
وقت ہے اب بھی کہ سمتوں کا تعین کر لیں
سانس جب ٹوٹنے لگتا ہے سنبھلتا ہی نہیں
(۱۹۷۷)

منزلیں چشم برہ شام جی رستے بے تاب
کسی جانب سے کوئی قافلہ چلتا ہی نہیں
(۱۹۷۸)

○

کبھی تو یوں بھی کوئی دن گزار کر دیکھو
چڑھے ہوئے کسی سورج کو مار کر دیکھو

وہ نشہ جس میں زمیں گھومتی ہے صدیوں سے
کبھی اسے بھی لہو میں اتار کر دیکھو

طلسم وقت سے نکلو حصارِ جاں توڑو
خدا و خود کا یہ مابین پار کر دیکھو

وہ خامشی ہے کہ سب ہو گئے ہیں پتھر کے
یقیں نہ ہو تو کسی کو پکار کر دیکھو

مرے حساب سے پورے نہیں ہیں سراب بھی
پھر ایک بار دھڑوں کا شمار کر دیکھو

ہر ایک گھر سے پکارے گی بے گھری پھر بھی
شمار سارے گھروں کو ہزار کر دیکھو

فریب رنگ سے نکلے گا شہر جس کے طفیل
اس ایک شام کا بھی انتظار کر دیکھو
(۱۹۸۱)

○

بیٹیاں پھول ہیں

پھول جب شاخ سے کٹتا ہے بکھر جاتا ہے
پتیاں سوکھتی ہیں ٹوٹ کے اڑ جاتی ہیں

بیٹیاں پھول ہیں
ماں باپ کی شاخوں پہ جنم لیتی ہیں
ماں کی آنکھوں کی چمک بنتی ہیں
باپ کے دل کا سکوں ہوتی ہیں
گھر کو جنت سا بنا دیتی ہیں
ہر قدم پیار بچھا دیتی ہیں
جب بچھڑنے کی گھڑی آتی ہے
غم کے رنگوں میں خوشی آتی ہے
ایک گھر میں تو اترتی ہے اداسی۔لیکن
دوسرے گھر کے سنورنے کا یقیں ہوتا ہے

بیٹیاں پھول ہیں
اک شاخ سے کٹتی ہیں مگر
سوکھتی ہیں نہ کبھی ٹوٹتی ہیں
اک نئی شاخ پہ کچھ اور نئے پھول کھلا دیتی ہیں

(۱۹۸۷)

○

آف ڈیوٹی ایئر ہوسٹس

مسکراہٹ.....لپ اسٹک پر منجمد

ایک چہرہ ہے فضاؤں میں تھکن سے مضمحل
ایک چہرہ خود نمائی کی طلب میں ضوفشاں

بال بکھرے جیسے اک وی آئی پی کی خواہشیں
بے کلی..... جیسے گرفتارِ اَنا کی اُلجھنیں

آنکھ کی جھیلوں میں کتنے رتجگوں کے دائرے
اُنگلیوں سے بے خیالی میں اُبھرتے زاویئے

جھُکتی پلکوں پر رُکے ہیں تشنۂ تعبیر خواب
تمتماتا ہے تھکے ماتھے سے دل کا اضطراب

جسم کی فُرسودگی تو پیرہن میں کھو گئی
روح کی بے چینیاں تو چھُپ نہیں سکتی کبھی

یہ سفر ہیں کتنے اکثر پَر کوئی منزل نہیں
کتنی فصلیں بو رہے ہیں پر کوئی حاصل نہیں

(اپریل ۱۹۹۰)

○

براہِ راست

ہم تنہائی میں اکثر اس بات پر کُڑھا کرتے ہیں کہ اردو ادب میں چند ایک استثنا سے قطع نظر دوہرے وصف کے حامل اہل قلم کو اُس قدر توجہ اور لائق اعتنا نہیں سمجھا جاتا جس قدر اُن کا استحقاق بنتا ہے۔ دُور مت جایئے، آج کی بزم کے مہمان خصوصی **جناب محمود شام** کی نسبت خلوصِ دل سے ہمدردانہ غور فرمایئے! صفِ سخن کی تمام اصناف پر بھاری اس نادرِ روزگار نے تحقیق، تنقید، سفرنامہ نگاری، ناول نگاری، ادبِ اطفال، ادارت، صحافت اور قومی و بین الاقوامی سطح کے مصاحبہ میں کس قدر محنت، ہمت، لگن اور جاں فشانی سے اعلیٰ پائے کا تخلیقی کام سرانجام دیا ہے۔ اس کے باوجود ادبی حلقوں کی پُراسرار خاموشی ہمارے خدشات کو تقویت دینے کے لیے کافی ہے!! زیرِ نظر گذارشات سے آپ کا عدم اتفاق، ہمارے لئے ایک طرح نیک فال سے کم نہ ہے مگر ثبوت کچھ اس طور مہیا کیجیے کہ شام صاحب کے ہمراہ وہ تمام تخلیق کار جنھیں قدرت نے ایک سے زیادہ وصف سے سرفراز کیا ہے، آپ کی کشادہ دلی اور کشادہ قلمی کے توسط سے اپنا حق بجا اور بروقت حاصل کرتے ہوئے اردو زبان و ادب کی آبیاری زیادہ تندہی سے کریں!!!

گلزار جاوید

☆ گفتگو کی ابتداء بچپن کی ڈائری سے کوئی دلچسپ قصہ سنا کر کیجیے؟

☆☆ بچپن بہت خوبصورت زمانہ ہوتا ہے لیکن بچپن جو دو ملکوں میں بٹ گیا ہو، جو آگ اور خون کے دریاؤں اور دائیں بائیں لاشوں کے درمیان مہاجر کیمپوں میں گزرا ہو۔ اس میں خوبصورتی یا دلچسپی تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتی۔ معلوم نہیں کہ پانچویں کلاس تک بچپن رہتا ہے یا نہیں۔ اس دور کا ایک دن یاد آتا ہے۔ ایک روز پہلے ہی ہم اسکول کی نئی عمارت میں منتقل ہوئے تھے اس سے پہلے ہماری کلاسیں درختوں تلے ایک کھلے میدان میں لگتی تھیں۔ سب کلاسیں ایک دوسرے کے سبق سن سکتی تھیں، نئی عمارت بھی ایک کچا مکان ہی تھی۔ مجھے یاد ہے دیواروں کی تازہ تازہ لپائی اور مٹی کی مہک کے درمیان ہم ٹاٹ پر بیٹھے تھے، اردو کی کتاب پر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، پروفیسر وقار عظیم، ابواللیث صدیقی کے نام تھے، ہمیں بتایا گیا کہ ڈپٹی کمشنر صاحب آج اسکول کا دورہ کریں گے ہمارے سارے ماسٹرز، ہیڈ ماسٹر سب بڑے اچھے اچھے کپڑوں میں تھے۔ بچے بھی صاف ستھرا لباس پہن کر آئے تھے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب چند افسروں کے ساتھ داخل ہوئے، ہنستا مسکراتا چہرہ، کشادہ پیشانی، قامت زیادہ بلند نہیں، باتیں دھیمے لہجے میں کر رہے تھے۔ بچوں سے بہت پیار سے سوال کر رہے تھے۔ میں نے زندگی میں پہلا ڈپٹی کمشنر دیکھا تھا اتنا متین سنجیدہ اور مشفق اس لئے ہمیشہ ڈپٹی کمشنروں کے بارے میں اچھا تاثر ہی رہا۔ بعد میں جب کبھی پڑھنے لکھنے کے قابل ہوئے تو بہت خوشی ہوئی کہ یہ ڈپٹی کمشنر بہت نامور لکھنے والے تھے، قدرت اللہ شہاب جن کا ''شہاب نامہ'' اردو کی سب سے زیادہ بکنے اور پڑھنے والی کتابوں میں سے ایک ہے، ہم اس وقت جھنگ شہر میں تھے۔

☆ کم عمر بلکہ کم سنی میں ''گلستان'' کا اجرا اور کتابت وغیرہ کے مشاغل بنا تجربے اور مہارت کے کیونکر ممکن ہوئے؟

☆☆ والد محترم حکیم صوفی شیر محمد قیام پاکستان سے پہلے سے ہی سیاسی اور ادبی طور پر سرگرم تھے، سیاسی جلسوں میں بڑی جوشیلی تقریریں کرتے تھے۔ اخباروں کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ ہماری آنکھ کھلی تو گھر میں ''امروز'' آتا تھا اس وقت کا اردو کا بہت بڑا اخبار پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے زیر اہتمام شائع ہوتا تھا۔ انہی کا ہفت روزہ ''لیل ونہار'' بھی آتا تھا جس کی بڑی شہرت تھی۔ دہلی سے ڈاک سے روزنامہ ''الجمعیت'' آتا تھا۔ نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کے رہنما اور کارکن گھر پر آتے تھے ان کے درمیان اٹھنے بیٹھنے، ان کی باتیں سننے سے پڑھنے لکھنے سے دلچسپی ہوئی۔ ''لیل ونہار'' میں بچوں کے صفحے میں ایک عنوان ہوتا تھا، میں بڑا ہو کر کیا بنوں گا۔ میں نے اس میں لکھ کر بھیجا تھا کہ میں بڑا ہو کر پبلشر بنوں گا۔ کسی انگریزی کتاب میں یہ جملہ پڑھا اچھا لگا کہ پبلشر کو عام پڑھنے والوں سے پہلے پتہ چل جاتا ہے کہ کہانی کا انجام کیا ہے۔ خبر کیا ہے اس بات نے گویا مجھ پر جادو کر دیا تھا، دوسروں سے پہلے جاننا۔ میں جاننے اور علم حاصل کرنے میں دوسروں سے آگے رہنا چاہتا تھا بلکہ خود جان کر انہیں بھی حصہ دینا چاہتا تھا، اپنی معلومات ان سے بانٹنا چاہتا تھا۔ اخبارات کو خط لکھنے کی عادت تو پڑ چکی تھی اس لئے لکھنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی تھی۔ اخبار کیسے چھپتے ہیں، کتابت کیسے ہوتی ہے، یہ تجسس رہتا تھا۔ بچوں کے رسالے تعلیم و تربیت، کھلونا، بچوں کی دنیا بھی باقاعدگی سے پڑھتا تھا اس لئے اپنا رسالہ ''گلستان'' نکالنا ایک فطری عمل تھا اس زمانے میں فوٹو کاپیاں نہیں ہوتی تھیں، کاربن پیپر تھا اور ایک خاص پینسل ہوتی تھی جس کا لکھا انمٹ ہوتا تھا۔ اسے آپ پانی یا تھوک سے نم کریں تو یہ جامنی رنگ اختیار کر جاتا تھا۔ یہ پینسل اور کاربن پیپر ہمارے مددگار رہے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے گلستان کی دس یا بارہ

کاپیاں کاربن پیپر سے تیار کرتا تھا اور دوستوں میں باقاعدہ قیمت وصول کر کے تقسیم کی جاتی تھیں۔ یہ دوست بھی اپنی تحریریں بھیجتے تھے۔ ایک مختصر سا حلقہ اخبار اور بچوں کے رسالے پڑھنے والوں کا تشکیل پا چکا تھا۔

☆ آپ کی بابت معلومات کی ابتداء پٹیالہ کے غیر معروف قصبے سے شروع ہو کر کراچی پر ختم ہو جاتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے آج کی نشست میں معلومات کے سلسلے کو آباء سے جوڑا جائے؟

☆☆ میرے والد، والدہ اپنے حال بلکہ اقتصادی طور پر بدحالی میں ایسے الجھے رہے تھے کہ کبھی اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں بات کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ مجھے بھی یہی یاد ہے، گھر میں بھی یہی ذکر ہوتا تھا کہ ہمارے دادا پڑ دادا محنت کشوں میں سے تھے۔ ہمارے تایا ایک اچھے درزی تھے، ہمارے والد صاحب اور ان کا خاندان راجپورہ میں صدیوں سے مقیم تھا جو ریاست پٹیالہ کا ایک بڑا صنعتی شہر تھا۔ ریلوے جنکشن تھا، مختلف ہنر، مختلف کاموں سے یہ لوگ اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ ان کا نہ جاگیرداری سے کوئی تعلق تھا، نہ بیوروکریسی سے، اچھا ہے انسانوں پر ظلم کرنے والوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ والدہ کا خاندان انبالہ چھاؤنی میں مقیم تھا۔ والد صاحب خاندان میں پڑھنے لکھنے والے شاید پہلے نوجوان تھے۔ انہوں نے بھوپندرا طبیہ کالج پٹیالہ سے حکمت کی باقاعدہ تعلیم اور تربیت حاصل کی۔ ان کے پاس زبدۃ الحکماء ماہر طب و جراحت کی سند تھی۔ پٹیالہ میں انہوں نے شیرانوالہ گیٹ کے قریب ارسطو دواخانہ کے نام سے مطب کا سلسلہ بھی شروع کیا لیکن تحریک آزادی میں دلچسپی نے انہیں جم کر حکمت نہیں کرنے دی۔ پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا تو پاکستان ہجرت کا فیصلہ ہوا تو ہمارا خاندان بٹا ہوا تھا۔ ابا جی اس وقت سرہند شریف میں تدریس کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ والدہ اور ہم لوگ انبالے میں تھے، شاید اسی لئے زندہ بھی رہ سکے۔ پٹیالے اور راجپورے میں جتنے بھی رشتے دار تھے قریبی اور دور کے۔ تایا، چچا، دادا، سب شہید کر دیئے گئے کسی کا کچھ نہیں پتہ چلا۔ والد صاحب سرہند سے انبالہ آ گئے۔ یہاں سے کسی نہ کسی طرح قافلوں میں شامل ہو کر ایک مال گاڑی میں چڑھ گئے، میں اس وقت پانچ سال کا تھا بڑے بھائی ڈاکٹر خالد مسعود چھ سال کے۔ اس ڈبے کی چھت نہیں تھی، اگست کا سورج سیدھا مسافروں کو دہکا رہا تھا لیکن میں خوش قسمت تھا میری والدہ نے مجھے گود میں لے کر دھوپ سے بچایا ہوا تھا۔ لاہور اسٹیشن پر ٹرین رکی پھر ہم جس کیمپ میں مقیم ہوئے وہ علامہ اقبالؒ کی کوٹھی کے قریب تھا، مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہمارے کیمپ کے بڑے اس کوٹھی سے ایک خاتون کے نکلنے پر بتاتے تھے کہ علامہ اقبال کی صاحبزادی ہیں۔ ہم لاہور سے گجرات، وہاں سے منڈی بہاؤ الدین، پھر جھنگ جا پہنچے، کھوئے ہوؤں کی جستجو، بچھڑ جانے والوں کا دکھ، زندگی کی گاڑی کھینچنے کیلئے ہر وقت محنت، کام کام اور آگے بڑھنے کے عزائم۔ اس میں کبھی فرصت ہی نہیں ملی کہ معلوم کر سکتے ہمارے آباؤ اجداد کیا تھے، ہماری ذات کیا ہے کیا کسی پشت میں ہم کسی بڑے نام سے جا ملتے ہیں یا نہیں۔ لیکن اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

☆ 1951ء کے سیلاب میں گھر بار کے دریا بُرد ہونے کی کہانی کے ساتھ یہ بھی بتلایئے کہ آپ کے والدین نے علوم وفنون کے مرکز لاہور کو چھوڑ کر جھنگ جیسے دور افتادہ شہر کا انتخاب کس بنیاد پر کیا اور آپ کی شخصیت کی تعمیر میں اس کے کیا اثرات ہوئے؟

☆☆ بھارت میں جب اپنا بسا بسایا گھر بار، عزیز و اقارب، سیاسی رفقاء کو چھوڑ کر پاکستان پہنچے تو اکثر خاندانوں کو یہ جستجو تھی کہ قریبی رشتے دار کس شہر میں ہیں۔ دوست احباب کہاں ہیں۔ لوگ جو کاروباری تھے، تاجرانہ رجحانات رکھتے تھے ان کے نزدیک شہروں کی یقیناً ایک اہمیت اور قدر تھی۔ یہ بے گھری کا عالم بھی تھا..... اور تنہائی کی شدت بھی..... قحط میں تو یار عشق بھی فراموش کر دیتے ہیں اس لئے والد محترم کے نزدیک اس وقت کاروبار، علم وفن سے زیادہ فوقیت اس بات کی تھی کہ اپنوں کے درمیان چل کر رہیں اور رفتہ رفتہ پاؤں جمائیں ورنہ اس وقت بڑے بڑے گھر خالی تھے کسی میں بھی رہا جا سکتا تھا۔ لاہور میں شاید ہمیں گمٹی بازار کے قریب کسی گھر کا قبضہ ملا، پھر ہم گجرات منتقل ہوئے، والد صاحب کے ایک ترقی پسند دوست شیخ ظہیر الدین وہاں تھے۔ پھر منڈی بہاؤ الدین میں ایک بڑے گھر میں چند ماہ رہے۔ یہ کسی بڑے آڑھتی ہندو کا چھوڑا ہوا گھر تھا۔ بنولے کی بھری بوریاں پڑی تھیں۔ پھر والد صاحب کو پتہ چلا کہ کچھ رشتے دار اور ایک عزیز دوست مولانا علی احمد پاسلوی جھنگ شہر میں ہیں۔ یہی پھر ہمارا مستقل آشیانہ بن گیا۔ کبھی والد محترم نے اسے غلط فیصلہ یا انتخاب جانا..... نہ ہم نے ..... جھنگ ادب، ثقافت، شعر وسخن کا مرکز ہے اس کی گلیاں رومان پرور ہیں۔ ریت کے ٹیلے نہ جانے کتنی داستانیں سناتے ہیں اور جھنگ کے لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے والے ہیں۔ 1951ء میں جس گھر میں ہم رہتے تھے اسے ہم نے طغیانی کی نذر ہوتے دیکھا۔ ہمارے سامنے اس کی دیواریں زمین بوس ہو رہی تھیں۔ اینٹیں بکھر رہی تھیں۔ یہ مکان بڑی سڑک کے کنارے تھا۔ اس میں ہماری ایک بہن پیدا ہوئی اور جلد ہی چل بسی۔ پھر جو دوسرا گھر ہمارا مسکن بنا۔ جو آج بھی ہمارے پاس ہے یہاں دو بہنوں سکینہ خالدہ اور شاکرہ اسماء نے جنم لیا۔ وہ آج اپنے بیٹوں، بیٹیوں کے ساتھ کراچی اور واہ میں خوش وخرم زندگی گزار رہی ہیں۔ یہ مکان جس کی تعمیر کے دوران ہی اس کے مکینوں کو ملک چھوڑنا پڑا ہمارے لئے بہت خوش آئند ثابت ہوا۔ ہم یہیں سے اپنے اسکول اور کالج جاتے رہے۔ یہیں سے دونوں بھائیوں کی بارات سرگودھا گئیں۔ دونوں کی خالہ زاد بہنوں سے شادی ہوئی۔ 1959ء میں ہونے والی یہ شادیاں آج بھی قائم ہیں۔ یہ مکان دل ودماغ میں اتنا رچ گیا ہے کہ 1962ء میں اسے چھوڑ کر میں پہلے لاہور میں رہا، پھر 1967ء سے کراچی میں ہوں۔

میرے سارے خوابوں کا مقام آج بھی یہی گھر ہے۔ بڑے بڑے لیڈروں، ملکی بین الاقوامی، رومانوی داستانوں، المیوں بھرے خوابوں کی سائٹ یہی مکان ہوتا ہے۔ پاکستانی صدر، وزیراعظم اسی گھر کے کمروں میں مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ یہ تو خوابوں کی سائنس کے ماہرین ہی بتا سکتے ہیں کہ کسی گھر میں یا مقام پر کتنا قیام اسے خوابوں کا مرکز بنا سکتا ہے۔1948ء سے1962ء تک14 سال کا عرصہ اس گھر میں گزرا ہے۔اس کے بعد کتنا طویل عرصہ ہے۔1967ء سے 2009ء لیکن یہ قیام گاہیں خوابوں کا پس منظر نہیں بنتی ہیں۔

☆ بڑا ہی روایتی سوال محمد طارق اور محمود عزمی سے محمود شام تک کی کہانی اور روداد کی نسبت کیا جانا بھی ضروری ہے؟

☆☆ خوب سے خوب تر کی جستجو، محمد طارق محمود، بہت اچھا نام، والد صاحب نے بڑے پیار سے رکھا، لیکن جب قلمی نام پڑھتے تھے تو یہ خواہش مغلوب کرتی تھی کہ نام منفرد ہو ایسا کہ پہلے کسی نے نہ رکھا ہو محمد طارق محمود، صرف طارق محمود، پھر محمود عزمی، گلستان اسی نام سے نکلا پھر دیکھا کہ عزمی تو بہت ہیں۔سورج ڈوبنا تھا، عجیب رنگ کی اداسیاں پھیلتی تھیں، بڑے شہروں میں تو سورج نکلنے کا پتہ چلتا ہے نہ ڈوبنے کا، چھوٹے شہروں میں تو شام کا وقت سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ بڑے بوڑھے کہتے تھے جب دونوں وقت ملتے ہیں، کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ پھر جھنگ کے اہل قلم کہتے تھے کہ سورج ڈوبتا ہے تو بہتے دریا ٹھہر جاتے ہیں۔ دن کا اختتام ..... زندگی کا انجام، افق پر پھیلی لالی .....اس وقت ہمارے شہر میں گھروں میں مسجد میں بجلی نہیں تھی.....آسمان پر سورج کا خون کچھ زیادہ ہی سرخی پھیلاتا تھا۔ یہ سماں بہت کچھ سوچنے پر اکساتا تھا۔ بہت گہرائی..... بہت گیرائی۔ایک شام ہم نے محمد طارق کو الوداع کہہ کے محمود کے ساتھ شام لگالیا۔

☆ میٹرک کے زمانے کو آپ نے شاعری کی ابتداء گردانا ہے مگر اس کے اسباب اور جواز کی بابت کچھ نہیں فرمایا؟

☆☆ گھر کے جس ماحول کا میں نے ذکر کیا، جہاں مختلف کتابیں پڑھی جاتی تھیں.....امروز، الجمعیت، لیل ونہار، کبھی کبھی شورش کاشمیری کا ''چٹان''۔ والد صاحب خود بھی شعر کہتے تھے۔

وہ جا پہنچے فلک پر اور ہوائیں ان کے رستے ہیں
ابھی تک ہم تنزل آفریں پستی میں بستے ہیں

پھر خود جھنگ میں آس پاس غزلیں، نظمیں سناتے لوگ نظر آتے ہیں۔ مشاعرے ہوتے ہیں، ریڈیو سے بھی غزلیں سنائی دیتی تھیں۔ میٹرک کرتے کرتے ادب کی فصل بوئی جا چکی تھی۔ میٹرک کا مرحلہ عبور کیا تو ملک میں پہلا مارشل لاء لگ گیا۔ اتنا کچھ دیکھنے سننے پڑھنے کو ملے .....اور پھر ہر طرف محرومیوں کا دور دورہ ہو.....لوگوں کی آنکھوں میں خواب بکھرتے ٹوٹتے دکھائی دیں۔غربت ہر طرف سے حصار میں لے رہی ہو، پیڑوں سے ٹوٹتے پتے پاؤں سے لپٹتے ہوں۔ مٹی کی بھینی بھینی خوشبو دل وجاں میں اترتی ہو۔حجابوں میں چھپے حسن کو ایک جھلک دیکھنے کی آرزوئیں تڑپتی رہتی ہوں .....تو عشق ہونا بھی لازمی ہے.....اور شاعری بھی، مجھے یہ فخر بھی ہے کہ میں ایف اے ہی میں تھا کہ میری غزلیں، نظمیں پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں کے ادبی رسائل میں شائع ہونے لگی تھیں۔

☆ طاہر سردھنوی ، جعفر طاہر، بیدل پانی پتی، احمد تنویر، شارب انصاری، پروفیسر تقی الدین، پروفیسر حیات، خیر الدین انصاری اور حنیف باوا سے اکتساب کی اشکال اور آپ کی شخصیت پر ان کے اثرات؟

☆☆ سب سے بڑا نام آپ بھول رہے ہیں جنہوں نے صرف میری شخصیت پر ہی نہیں، اردو ادب اور شاعری کو اپنے اسلوب نگارش اور منفرد لہجے سے متاثر کیا۔ جناب شیر افضل جعفری.....ایک درویش.....ایک بہت ہی سادہ شخصیت.....لیکن انہوں نے قیام پاکستان کے فوراً بعد پنجابی کے الفاظ استعمال کر کے اردو کا دامن وسیع کیا۔ ان کے ہاں صرف نئے الفاظ ہی نہیں، نئے محسوسات، نئی سوچ بھی تھی۔ اپنی سرزمین سے محبت بھی.....ان کی جدت اور اپج نے مجھے ہمیشہ مسحور کئے رکھا۔ ان کی صحبتیں ہمیشہ خیال افروز رہیں ..... جناب طاہر سردھنوی میرے استاد تھے۔ میں نے باضابطہ طور پر ان سے اصلاح لی..... بے وزن مصرعوں سے وزن کی طرف ..... الفاظ کے صحیح نشست وبرخاست .....املاء، تلفظ، ان سے باقاعدہ زانوئے تلمذ طے کر کے سیکھا۔ وہ قادرالکلام شاعر تھے۔لیکن کسی گروپ یا بلاک سے وابستہ نہیں تھے۔اس لئے پیچھے رہ گئے .....وہ زمانہ ایک طرف ترقی پسند مصنفین کا تھا.....دوسری طرف حلقہ ارباب ذوق..... یہ اپنے اپنے لکھنے والوں کو آگے بڑھاتے تھے.....ان کی تشہیر کرتے تھے..... طاہر سرد ھنوی غربت کے حصار میں رہے، کبھی خود کو نہیں بیچا۔ انکے کلام میں فکر کی گہرائی تھی.....زبان پر قدرت تھی.....مشاعروں میں بھی بہت کم جاتے تھے.....ان کا شعری مجموعہ شائع کرنے کی کوشش کی گئی..... مجھے یاد نہیں کہ یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوسکا یا نہیں۔

سید جعفر طاہر کا اپنا ایک طنطنہ تھا.....الفاظ پوری گھن گرج کے ساتھ ان کے کنٹوز میں جلوہ گر ہوتے.....اردو فارسی پر بے مثل عبور.....غزل ہو نظم ہو یا کنٹوز اپنا جلال اپنا جمال..... جھنگ سے تعلق پر انہیں ہمیشہ فخر رہا۔ وہ بھی اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ پھر پروفیسر تقی الدین انجم، گورنمنٹ کالج جھنگ میں اردو کے استاد، بہت ہی نستعلیق شخصیت، میں نے اردو بطور مضمون نہیں لیا تھا، اس لئے انکی کلاسز میں تو شرکت نہیں کی، لیکن ان کے ادبی مقام سے فیض حاصل کیا۔ شعری وادبی نشستوں میں ان سے بہت کچھ سیکھا.....وہ ہم سب کے سینئر تھے، سب ان کا احترام کرتے تھے انکی اردو گنگا جمنا کی دھلی ہوئی تھی، کالج میگزین ان کی نگرانی میں نکلتا تھا۔ پروفیسر محمد حیات خان

سیال بہت وجیہہ، بہت جمیل، گورنمنٹ ہائی اسکول جھنگ میں وہ ہمارے ٹیچر تھے۔ پھر گورنمنٹ کالج جھنگ میں وہ ہمارے پروفیسر تھے۔ ادبی محفلوں کے سرپرست۔ انہوں نے ہمیں بہت کچھ سکھایا بہت ہی دھیما لہجہ، وہ بہت جلد چلے گئے۔ میں جھنگ سے لاہور مزید تعلیم کیلئے جارہا تھا تو انہوں نے اپنے ایک دوست کے نام خط دیا.....جس کی بدولت مجھے پڑھائی میں مدد کے لئے پہلی نوکری میسر آئی۔ یہ ایک کتابی اشاعتی ادارے نذر سنز میں پروف ریڈنگ کی تھی۔ -/50 روپے ماہانہ..... یہ بہت ہی بڑا سہارا ثابت ہوئی۔ اس میں میں اپنا گزارا بھی کرتا تھا اور گھر بھی کچھ بھیجتا تھا۔ شارب انصاری، پنجابی کے صاحب طرز شاعر تھے۔ یہ میرے بڑے بھائی ڈاکٹر خالد مسعود کے کلاس فیلو تھے لیکن شاعری کی وجہ سے ہم ان کے ہم عصر بن گئے۔ خیرالدین انصاری بھی مجھ سے سینئر ہیں.....ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے، ان سے بھی ہم نے بہت کچھ سیکھا۔ حنیف باوا بہت بڑے افسانہ نگار ہیں.....کہانی میں ان کو خصوصیت حاصل ہے۔ بیدل پانی پتی .....غزل میں اسلوب خاص رکھتے تھے احمد تنویر ہمارے ساتھی تھے۔ ان کے علاوہ مظفر علی ظفر، آغا نوبہار، مظہر اختر، معین تابش، صفدر سلیم سیال سب کی صحبتیں بہت ہی علم پرور تھیں۔ آج کل جھنگ کی پہچان ڈاکٹر محسن مگھیانہ ہیں۔

☆ کچھ لوگ آپ کے سادہ شعری برتاؤ کو ذخیرہ الفاظ کی کمی کے خانے میں بھی ڈالا کرتے ہیں؟

☆☆ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون لوگ ہیں اور کس بناء پر میرے ذخیرہ الفاظ کو کم قرار دیتے ہیں۔ میں نے شعر اور نثر میں شروع سے بہت سادہ الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ زیادہ لوگوں تک میری بات پہنچ سکے۔ مشکل الفاظ اور تراکیب سے دانستہ گریز کیا ہے۔ اابتہ یہ ضرور سعی کی ہے کہ الفاظ کی تکرار نہ ہو.....اظہار کے لئے نئے نئے الفاظ برتے جائیں۔ شاعری میں جو روائتی الفاظ ہیں، تراکیب ہیں، وہ جان بوجھ کر استعمال نہیں کی ہیں .....ممکن ہے مجھے ان مشکل الفاظ کے معانی ہی معلوم نہ ہوں.....اس لئے انہیں کیسے اپنا سکتا تھا.....سوچ، فکر مجھے غالب کی متاثر کرتی رہی ہے لیکن زبان میں سادگی میر کی اچھی لگی ہے۔

☆ آپ کے ہاں مضمون و مفہوم کے بجائے ''لفظ'' کو زیادہ اہمیت کیوں دی جاتی ہے؟

☆☆ یہ تاثر بھی میرے خیال میں مناسب نہیں ہے، میرے ہاں ہمیشہ مضمون اور مفہوم کو ہی اولیت رہی ہے۔ شعر میں بھی، ادب اور صحافت میں بھی .....میں نے تو ہمیشہ شعوری طور پر لکھا ہے۔ ادبی، سیاسی، محفلوں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اصل حقیقت، مضمون، موضوع، مسئلہ، مفہوم اور معانی ہیں، جذبات نہیں .....لفاظی نہیں۔ اسی طرح اہم ادارے ہیں، شخصیات نہیں ..... لیکن مضمون اور مفہوم کا ابلاغ لفظ کے صحیح انتخاب کے بغیر کیسے ہوسکتا ہے۔ مضمون، مفہوم اور معانی کو قاری تک لے جانے والا وسیلہ اور گاڑی تو الفاظ ہی ہیں۔ ذہنوں، دلوں اور مختلف انسانوں کو آپس میں ہمکلام کرنے والے الفاظ ہی تو ہیں اور یہ سب کچھ لازم وملزوم ہے۔ مضمون، مفہوم لفظ کے بغیر کچھ نہیں..... اور لفظ مضمون مفہوم کے بغیر مہمل اور بے معنی ہوسکتا ہے۔

☆ کچھ لوگ آپ کے ہاں جمالیاتی حس کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے اس کا ذمہ دار کم عمری کی شادی کو گردانتے ہیں؟

☆☆ یہ وہ لوگ ہوسکتے ہیں جو شاعری کو صرف رومان، عشق، سراپا کشی تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ جمالیات کے وسیع تر تناظر کا احاطہ نہ کرپاتے ہوں، صرف لب ورخسار کی باتیں کرتے ہوں، کم عمری کی شادی تو آپ کو جلال و جمال، رموز و وصال سے جلد آگاہ کردیتی ہے اور یہ شادی آپ کو عشق کرنے سے کہاں روکتی ہے۔ حسن کے دیدار اور جمال کے نظارے، خوبرویوں سے چھیڑ سے کہاں منع کرتی ہے۔ آپ زیادہ اعتماد اور زیادہ دلجمعی سے عشق میں مبتلا بھی رہ سکتے ہیں۔ محبوباؤں کے سراپے بھی لکھ سکتے ہیں اور آپ کی مجبوری نہیں ہوتی کہ اگر محبوب نے شادی پر زور دینا شروع کردیا تو کیا ہوگا۔ اگر شادی سے انکار کردیا تو کیا ہوگا۔

ہم نے پہلے شادی کی تھی بعد میں سارے عشق کئے
دونوں فرض نبھائے ہم نے پوری ذمہ داری سے

میں یہ کم عمری کی شادی کی دین ہی کہتا ہوں کہ میری تحریریں روائتی حسن وعشق کی کشمکش میں گرفتار رہنے کی بجائے میرے عہد کے ان دکھوں کا اظہار ہیں جو میرے ہم وطنوں اور ہم عصروں کا مقدر بن چکی ہیں۔ میں اپنی غزلیں، نظمیں گلوکاروں سے تیار کروالیتا تو شاید ان کی آواز سن کر نقادوں کو وہ جمالیاتی حس محسوس ہوجاتی جو صرف پڑھنے سے ان تک نہیں پہنچ پاتی ہے۔ میں نے تو نئے دور عاشقی کے لازمی اجزائے ترکیبی یعنی ڈائری، فون، ای میل، ایس ایم ایس، کو بھی غزل کی فضا میں داخل کیا ہے۔ یہ جمالیات کا احساس ہی تو ہے۔

☆ غزل آپ کی پسندیدہ صنفِ سخن ہے پھر بھی معروف اور ثقہ غزل گو شعراء میں آپ کا ذکر تلاش کرنا دشوار کیوں ہوتا ہے؟

☆☆ یہ بالکل درست ہے کہ غزل میری پسندیدہ صنف سخن ہے۔ زیادہ تر میں نے غزلیں ہی کہی ہیں۔ جن میں عہد کا شعور بھی رہا ہے۔ نئے تجربے، نئے الفاظ، نئی تراکیب بھی۔ آج کے عشق اور سماجی زندگی کے لوازمات، اقدار، مناظر کو غزل میں سمو دیا ہے۔ میری غزلیں 1960ء کے عشرے سے نامور غزل گوؤں کے ساتھ شائع ہوکر خراج تحسین پاتی رہی ہیں لیکن مجھے کبھی بھی یہ مناسب نہیں لگا اور نہ اخلاقی طور پر اسکا جواز جان سکا کہ کچھ نقادوں سے اپنی شاعری پر مضمون لکھنے کی درخواست کروں۔ ٹی وی ریڈیو کے پروڈیوسروں سے تعلقات کو اپنی غزلیں پیش کروانے کیلئے استعمال کروں۔ میری سوچ تو یہی رہی ہے اگر میری شاعری

میں کچھ دم ہے تو وہ یقیناً نقادوں، تذکرہ نگاروں کی توجہ حاصل کرلے گی اور اگر اس میں کچھ انفرادیت اور کشش نہیں ہے تو اس کا ذکر نہیں ہوگا۔

☆ بود باش آپ کی خالص اسلامی اور مشرقی، تاثر آپ کا ترقی پسند اور برتاؤ مابعد جدید طرز کا کیوں ہے؟

☆☆ پاکستان جیسے ترقی پذیر، غریب اور پسماندہ معاشرے میں ایک متوسط ملازمت پیشہ فرد کی جو بود و باش ہوسکتی ہے شاید وہی میری ہے۔ اس میں کسی شعوری کوشش کا دخل نہیں ہے۔ اسلامی اور مشرقی طرز کیا ہوئی ہے، ہوسکتی ہے۔ مجھے اس کے تقاضوں اور معمولات کا علم نہیں ہے۔ اسی طرح ترقی پسند تاثر ..... مابعد جدید طرز کا برتاؤ..... جیسی اصلاحات مجھ جیسے کم علم کی فکری سطح سے بلند تر ہیں۔ میں ہوں جو ہوں..... اندر باہر ایک ہی ہوں.....

☆ اگر ہم وضاحت کے ساتھ آپ کے ترقی پسند مزاج اور رویوں کے مآخذ اور جواز کو تلاش کرنا چاہیں اور ترقی پسندی کے مستقبل سے آگاہی کے طالب ہوں تو ہمیں کس طرف رخ کرنا ہوگا؟

☆☆ گلزار جاوید صاحب۔ سو! یہ آپ نے طے کرلیا کہ محمود شام ترقی پسند ہے۔ یہ ایک مشکل کام ہے۔ میں ترقی پسندوں کے ساتھ نتھی ہونے سے ڈرتا نہیں ہوں۔ لیکن میں کسی خانے میں فٹ نہیں ہونا چاہتا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ایک لکھنے والے کو اپنے عہد کا عکاس ہونا چاہیے۔ جو دیکھے محسوس کرے اسے لکھ دے۔ اگر اس سے میں ترقی پسند ہو جاتا ہوں تو یقیناً مجھے یہ نام دے دیجئے۔ ہم نے جب لکھنا پڑھنا شروع کیا تو انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقۂ ارباب ذوق دونوں بہت سرگرم تھے۔ ان کے مباحث، ان سے وابستہ شعراء اور ادیبوں سب کو پڑھا۔ فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، سجاد ظہیر، سید سبط حسن، احمد فراز، احمد ریاض کا بھی مطالعہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ الطاف گوہر، میرا جی قیوم نظر، ضیاء جالندھری، اعجاز حسن بٹالوی، ن۔م راشد کو بھی پڑھا۔ اب یہ دونوں انجمنیں ماضی کی طرح فعال اور متحرک نہیں ہیں۔ لیکن ادب برائے زندگی۔ ادب برائے ادب کی بحث اسی طرح ہے۔ عوام کے لیے قلم اٹھانے والے، اپنے عہد کے تمام مصائب کو اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ، ہر صنف کی تیکنیک اور حدود کا خیال رکھنے والے یقیناً زندہ رہیں گے۔ مستقبل بھی ان کا ہے، لیکن لوگوں کے دکھ درد سے آنکھیں چرانے والے، مصلحت اور منافقت کا لبادہ اوڑھنے والے اور ان کی تحریریں باقی نہیں رہیں گی۔

☆ ''کارڈیو اسپازم'' میں مبتلا ہونا اور اس نام سے نظم کا ظہور بلکہ اس کیفیت کے زیرِ اثر تخلیق کردہ شاعری کا چرچا سوال طلب ہے؟

☆☆ کارڈیو سپازم عام بیماری نہیں ہے۔ کسی کسی کو لاحق ہوتی ہے۔ میں نے اور کسی سے اس کا نام نہیں سنا۔ بیماری جھنگ سے شروع ہوئی، لاہور میں بھی جاری رہی۔ شدّت کراچی میں اختیار کی۔ ہوتا یہ تھا کہ کھانے پینے میں دقّت ہوتی تھی۔ ڈاکٹرز پہلے ٹانسل کہتے رہے۔ گلے کا مسئلہ سمجھتے رہے۔ دوائیں تجویز ہوتی رہیں۔ پھر یہ ہوا کہ ٹھوس غذا تو کیا پانی بھی واپس آنے لگا۔ 1969ء کی گرمیوں میں ایک روز ہم سول اسپتال کراچی میں جا کر لیٹ گئے۔ کچھ بھی کھایا پیا نہیں جا رہا تھا۔ گلوکوز لگے ڈرپ سے جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھا گیا۔ آپریشن کا فیصلہ ہوا۔ سات گھنٹے تک آپریشن جاری رہا۔ بائیں طرف سے آدھا پیٹ چیر دیا۔ دیکھنے والوں نے ہمارا دل، جگر، پھیپھڑے سب دیکھ لیے۔ ہوش آیا تو کمر میں شدید درد محسوس ہوا۔ خیال یہ تھا کہ گلے میں کچھ واردات کی گئی ہوگی۔ وہاں کچھ رکاوٹ دور کی ہوگی۔ سرجن اشفاق حسن رضوی نے بتایا کہ تشخیص بالآخر یہ ہوا کہ خوراک کی نالی معدے پر جا کر سوکھ گئی ہے، اس لیے سب کچھ واپس آجاتا ہے۔ دوسرا راستہ کھول دیا ہے۔ اب جسم کو، معدے کو راشن کی رسد وہاں سے ہوگی۔ بستر پر پڑے پڑے سوچ رہا تھا۔ ان دنوں دائیں بائیں کی کشمکش زوروں پر تھی۔ ایک مکتب فکر کی پرزور نمائندگی شہید ذوالفقار علی بھٹو کر رہے تھے۔ دوسری طرف مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ تھے۔ اور دوسری جماعتیں۔ طبقاتی تقسیم، طبقاتی تضادات، غریب امیر، عوام، بہرور، اوپر کا طبقہ، نیچے کا طبقہ۔ سب کچھ اوپر والوں کے پاس، وسائل دولت ان کے تسلط میں ہے، نیچے نہیں جاپاتی۔ میرے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا کہ کھاتا تھا پیتا تھا تو جسم کے اوپر حصے تک تو یہ سب کچھ پہنچتا تھا، لیکن نچلے حصے میں نہیں جاتا تھا۔ اوپر کے حصے تک رہنے سے جسم کو مجموعی طور پر کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نعمتیں نچلے حصے تک نہیں پہنچتی تھیں، تو وہ پورے جسم کی طاقت بھی نہیں لگتی تھیں۔ جسم کا حصہ بھی نہیں بنتی تھیں۔ اور پھر جسم انہیں الٹ دیتا تھا۔ ساری نعمتیں اوپر والوں کے پاس ہیں۔ نیچے والوں کے پاس نہیں ہیں۔ یہ وسائل کی جائز تقسیم نہیں ہے۔ یہ جسم کی صحت مندی نہیں ہے۔ ملک اور معاشرہ بیمار ہیں، جس طرح ایک آپریشن سے میرے جسم میں خوراک کی مساوی تقسیم سے میری بیماری دور ہوگئی ہے، نعمتیں اوپر سے نیچے جانے لگی ہیں، معاملات معمول کے مطابق ہوگئے ہیں، اس طرح پاکستانی معاشرے کو بھی ایک سرجن کی ضرورت ہے۔ ایک آپریشن درکار ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے۔ اس وقت بہت پسند کی گئی۔ ملک میں جمہوریت کے لیے جدوجہد کرنے والے اب بھی اس کی مثال دیتے ہیں۔ جنوری 1970ء میں اس کتاب کی رونمائی کراچی پریس کلب میں جناب ذوالفقار علی بھٹو نے کی۔ بڑے بڑے دانشور، لکھنے والے شریک ہوئے۔ جناب ابراہیم جلیس، شوکت صدیقی، محسن بھوپالی، معراج محمد خان، طارق عزیز، عزیز کارٹونسٹ، بہت سے جو یاد نہیں۔

☆ کچھ لوگ آپ کی شاعری کو ادبِ عالیہ کا حصہ ماننے سے اس لیے انکاری ہیں کہ آپ صحافتی ذمہ داری کے باعث روزمرہ کی شاعری کثرت سے کیا کرتے ہیں؟

☆☆ شاعری، ادب کا یا ادب عالیہ کا حصہ کب بنتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں۔ روزمرہ کی شاعری، میں کتنی تخلیقی اپج ہے۔ یا وہ صرف ایک جواب مضمون

ہے۔ یہ تو پڑھنے والے فیصلہ کرتے ہیں۔ میں تو لکھ رہا ہوں۔ کوئی فارم بھر کر ادب عالیہ میں شمار کیے جانے کی مانگ نہیں کر رہا ہوں۔ میں مطمئن ہوں۔ کسی نے مجھے یہ نہیں کہا کسی موضوع پر ارتجالاً کہی گئی نظمیں یا غزلیں فنی اعتبار سے فکری حوالے سے کمزور ہیں۔

☆ شام صاحب ! آپ کے بے پناہ ادبی اور تخلیقی کام کی نسبت ناقدین نے آپ کو اپنی تنقید کا عنوان مناسب طرز پر کیوں نہیں بنایا؟

☆☆ یہ بھی اوپر والے سوال کی توسیع ہے۔ میں تو لکھتا رہا۔ نظم، نثر دونوں میں۔ اپنی سوچ پڑھنے والوں تک پہنچاتا رہا۔ یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ ناقدین سے کس طرح رجوع کیا جائے اور اپنی ادبی تخلیقات کو تنقید کا موضوع بنوایا جائے۔ آپ نے 'چہارسو' کے قرطاس خاص کے لیے مجھے اپنی روایات سے کچھ ادھر ادھر کروادیا ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد آپ ایسا سوال شاید نہ کریں۔

☆ اس کا سبب بڑے اخبار کے بڑے ایڈیٹر کی ناراضگی کا خوف بھی ہوسکتا ہے؟

☆☆ ناراضگی کا خوف تو بڑے تنقیدی تعریفی مضامین لکھواتا ہے۔ بعض اخبارات کے ادبی صفحات کے انچارج نامور ادیب بن گئے۔ میں نے اپنے اخباری اثر ورسوخ کو ادبی تخلیقات کی مدح کے لیے استعمال نہیں کیا۔ اور اگر کسی نے میری ادبی تحریروں پر منفی رائے دی تو میں نے اس کے خلاف کوئی اخباری مہم نہیں چلائی۔

☆ انگریزی ادب سے اپنے تعلق اور دلچسپی کی بابت کچھ فرمایئے اور یہ بھی بتلایئے کہ کچھ لوگ آپ کے ہاں مایا کوفسکی کو کن اسباب کی بنا پر تلاش رہے ہیں؟

☆☆ انگریزی ادب سے میرا تعلق طالب علمی کے زمانے سے ہے۔ بی اے میں انگریزی لٹریچر میرا موضوع تھا۔ ایم اے انگریزی کرنا چاہتا تھا، لیکن انگریزی اچھی نہیں تھی اس لیے داخلہ نہیں مل سکا۔ برطانوی یورپی کلاسیکی شعراء کی نظمیں بھی پڑھیں۔ جدید دور کے شعرا کا مطالعہ بھی کرتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ ان ممالک کے موجودہ شعراء کا سالانہ انتخاب نظر سے گزرتا رہے۔ نظم میں ارتقائی تبدیلیاں دلچسپ لگتی ہیں، لیکن یہ میری کم علمی کہ مایا کوفسکی سے میرا کوئی واسطہ نہیں پڑا۔ سچی بات ہے کہ میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہیں۔ ان کی تحریریں کس قسم کی ہیں۔ جدید شعراء میں مجھے سلویا پلاتھ کی نظمیں اچھی لگیں۔ وہ بے چاری خودکشی کرگئی۔ جدید فارسی شعراء کا مطالعہ بھی باقاعدگی سے کرتا ہوں۔

☆ نظمِ جدید سے وابستہ بہت سے احباب غزل کو ازکارِ رفتہ، وحشی، نیم وحشی صنف سخن گردان کر اس کی حیثیت کو متاثر کرنے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔ نظم کے اہم اور معتبر شاعر محمود شام کا اس حوالے سے نقطہ نظر کیا ہے؟

☆☆ اردو شاعری میں غزل سب سے مقبول، مکمل اور بھرپور صنف ہے۔ ہر اچھی غزل کا ایک شعر وہی کچھ کہہ جاتا ہے، جس کا اظہار بعض اوقات پوری نظم میں بھی ممکن نہیں ہوتا۔ میں تو ذاتی طور پر نظم کی طرف اسی وقت رجوع کرتا ہوں، جب غزل میں وہ مضمون نہ باندھ سکوں۔ آج بھی غزل آگے بڑھ رہی ہے۔ ابلاغ کا سب سے اہم اور موثر وسیلہ غزل ہی ہے۔ ان دنوں بھی غزل ہی سب سے زیادہ لکھی جارہی ہے۔ غم دوراں، غم جاناں، غزل میں ہی بہتر اظہار پا رہا ہے۔ جدید حسیات، تنہائیاں، محرومیاں غزل کا دامن ہی تھام رہی ہیں۔ ایک ایک شعر کئی کئی نظموں پر بھاری پڑ رہا ہے۔ جدید نظم کون لکھ رہا ہے۔ کہاں لکھی جارہی ہے۔ میں تو سب ہی ادبی رسالے پڑھتا ہوں، کتابیں دیکھتا ہوں۔ ایک طرف پورے عہد میں پھیلے ہوئے موضوعات ہیں، مضامین ہیں۔ لیکن ان کا احاطہ غزل میں ہی ہو پا رہا ہے۔ جہاں تک نثری شاعری کا مسئلہ ہے میں اسے شاعری نہیں مانتا۔ نظم نظم ہے، نثر نثر ہے۔ اگر خوبصورت نثر لکھی جارہی ہے، نثر میں سماں بندھ رہا ہے، رنگ بکھر رہے ہیں تو کیا اسے شاعری کہنا ضروری ہے۔ اس کی ویسے بھی تعریف کی جاسکتی ہے۔

☆ کچھ لوگ آپ کی شاعری کو تقسیم ہند کا شاخسانہ، کچھ ۱۹۶۵ء کی جنگ کا ردِعمل اور کچھ ۲۰۰۵ء کے زلزلے کی دردناکی سے جوڑ کر آپ کو حادثاتی شاعر گردانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟

☆☆ میرے خیال میں اگر کچھ لوگ ایسا کر رہے ہیں، تو غلط نہیں کر رہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی شاعر اتنا بے حس اور بے درد تو نہیں ہوسکتا کہ اس کے سامنے آگ ہر طرف لگی ہو، خون کی ندیاں بہہ رہی ہوں، بے گناہ مارے جا رہے ہوں، آزادی کے لیے انسان گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوں۔ وہ ان سب سے آنکھ بند کر کے روایتی شاعری کرتا رہے۔ گل وبلبل کی حکایات قلمبند کرتا رہے۔ میں تو اس آشوب سے خود گزرا ہوں۔ 1947ء کے عذاب، دکھ تو اپنی جگہ تھے، لیکن اس کے نتیجے میں انسانوں پر جو گزری، آبادیوں پر جو بیتی، وہ ایک عرصے تک تمام اہم شعراء کا موضوع سخن رہی ہے۔ 1965ء کی جنگ بھی ایک بہت عظیم المیہ تھا۔ ہوس اقتدار کی کشمکش، توسیع پسندی، جارحیت، بھارت کی طرف سے تقسیم کے زخم چاٹنے اور کھمبا نوچنے کی کوششیں۔ جہاں خون بہہ رہا ہو، پیاری دھرتی شعلوں میں جھلس رہی ہو، سجیلے جوان توپوں، تفنگوں، لڑاکا طیاروں، ٹینکوں سے پھینکے گئے گولوں کا نشانہ بن رہے ہوں، بستیاں تاراج ہورہی ہوں، تو کیا یہ ایسے شعری تجربہ نہیں بن سکتے۔ شاعر، پتھر تو نہیں ہے کہ اس کا دل نہ پگھلے۔ اینٹ تو نہیں ہے کہ اس کا دماغ متاثر نہ ہو۔ مجھے تو 1971ء کی جنگ نے بھی اسی طرح پارہ پارہ کیا۔ میں اپنی صحافتی ذمہ داریوں کے لیے 1965-1971ء کے کارزاروں میں موجود رہا ہوں۔ دوسرے شعراء کی نسبت اس آگ کی تپش زیادہ قریب سے محسوس کی ہے، بلکہ میرے محسوسات جھلسے ہیں، سلگے ہیں۔ میں نے مشرقی پاکستان کے بھائی بہنوں کی آنکھوں میں محرومیاں

دیکھیں۔ کتنے مصائب، مظالم میرے سامنے توڑے جاتے رہے۔ وطن کا ایک حصہ بلکہ بڑا بازو، ہمارے ہم وطن، الگ ہو گئے۔ میں اس سے کیوں متاثر نہ ہوتا۔ پھر کراچی میں 1990ء کی دہائی جو قیامتیں ساتھ لائی، محلوں میں سرحدیں کھنچیں، دلوں اور دماغوں کے درمیان دیواریں اٹھا دی گئیں۔ بوریوں میں لاشیں ملتی رہیں، بم دھماکے ہوتے رہے، گھر اجڑتے رہے، مائیں بیٹوں کی آس میں اندھی ہو گئیں، بیویاں شوہروں کی راہ تکتے تکتے پتھر ہو گئیں، تو کیا میرا قلم بانجھ ہو گیا تھا، میرا خون خشک ہو گیا تھا، دماغ کی شریانیں پھٹ گئی تھیں۔ میں کراچی میں سانس لیتا تھا، تو کراچی کا نوحہ کیوں نہ لکھتا۔

کبھی تقسیم ملک بھی تھی جہاد
اب محلوں میں سرحدیں ہیں کھنچی
جب سے ہم راز قاتلاں ہوں میں
جسم چٹخا ہوا، رگیں ہیں کھنچی

خون قاتل ہی جب رگوں میں رہے
کیوں نہ بحران پھر گھروں میں رہے

سروں کی فصل کٹ چکی شمار ہو رہے ہیں ہم
مرے دیار خیر ہو ترا وقار ہو رہے ہیں ہم

پھر 2005ء کا زلزلہ، الحذر، الاماں۔ ایک لاکھ کے قریب جیتے جاگتے انسان چشم زدن میں فنا ہو گئے۔ ہزاروں بستیاں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ ملبے تلے دبی مائیں، اسکولوں کی دیواروں سے کچلے گئے بچے، خون آلود کتابیں، اپنی جگہ سے سرکے ہوئے پہاڑ، شاہراہوں کے درمیان شگاف، ریزہ ریزہ پل، خیموں میں زندگی، بھرے پرے خاندانوں میں سے بچ جانے والے معصوم بچوں کی سنسان آنکھیں۔ کیا کسی لکھنے والے کا ضمیر نہیں جھنجھوڑتیں۔ کیا اس کے ذہن کو متحرک نہیں کرتیں۔ کیا اس کے دل میں قیامت برپا نہیں کرتیں۔ صرف یہی واقعات نہیں۔ دہشت گردی کی بڑی وارداتوں میں لہو ہو جانے والی جانیں، بکھر جانے والے اعضاء، معصوم لوگوں پر توڑے جانے والے مظالم، مرضی کی شادی پر جاگیرداروں، سرداروں کی قہر سامانی، لبنان میں اسرائیل کی بمباری سے زندہ مٹی میں دب جانے والی بچی۔ سب ہی میرا موضوع بنتے رہے ہیں۔ اقتدار کی کشا کش میں جب عوام کو فریب دیے جاتے ہیں، بڑے آپس میں لڑتے ہیں۔ جب ملک کو لوٹنے والے منتخب عوامی حکومتوں کا تختہ الٹنے والے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں، تو میرا دل خوں کے آنسو رونے لگتا ہے۔ حادثے، المیے اتنے قریب رونما ہو جاتے ہیں کہ وہ میرا شعری تجربہ بنتے رہتے ہیں۔ میں تو صحافت کے پیشے کا شکر گزار ہوتا ہوں کہ مجھے وہ سب دکھ، عذاب، اتنے قریب سے دیکھنے کو ملتے ہیں جس کا عام طور پر شاعر ادیب صرف تصور کر کے کچھ لکھتے ہیں۔ یہ آلام میری تو روح میں اتر جاتے ہیں، میری آنکھوں میں بس جاتے ہیں، میرے ذہن کی ہر تہہ کو رنگ دیتے ہیں۔ میں تو محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اپنے عہد کا قرض ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اپنے مشاہدات شعر میں محفوظ کر دیے ہیں۔ کسی روز غیر جانبدار مورخ ان کے حوالے سے میرے عہد کی تاریخ مرتب کر رہا ہوگا۔

☆ شام صاحب! اردو شاعری کا دامن بہت کشادہ اور وسیع ہے مگر آپ کے ہاں صرف مومن سے متاثر ہونے کا ذکر ملتا ہے؟

☆☆ مومن نے بھی مجھے متاثر کیا ہے۔ لیکن صرف اسی نے نہیں۔ مومن کا ذکر اس لیے کرتا ہوں کہ ایک بہت بڑا شاعر، غالب اور میر کے ذکر میں نظر انداز ہو گیا ہے۔ میں نے اگرچہ اردو کو دوران تعلیم بطور مضمون کسی مرحلے پر نہیں اختیار کیا، لیکن ولی دکنی سے لے کر آج تک کے جدید شعراء کو بہت غور سے پڑھا ہے۔ ہمارے اساتذہ کے کلام میں بہت کچھ ملتا ہے۔ اس عہد کی تصویریں، داستانیں، میر درد، مصحفی، سودا، انشاء اللہ خان انشا، ذوق، نظیر اکبر آبادی اور بہت سے نام۔ سب نے اردو شاعری کا دامن بہت وسیع کیا ہے۔ ماضی قریب میں حالی، اصغر گونڈوی، فانی، جذبی، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، مجاز، تاباں، مخدوم پھر حال ہی میں فراق، قتیل شفائی، مجروح سلطانپوری، ن۔م۔ راشد، مجید امجد، زہرہ نگاہ، حبیب جالب سب ہی آپ کے تخلیقی جذبے کو جلا دیتے ہیں۔ میں تو ہمیشہ یہ سوچتا رہتا ہوں کہ صرف اردو شعراء کی ہی نہیں، دنیا بھر کے شعراء کی ایک طویل قطار ہے۔ اس میں تاریخ کے ایک مرحلے پر میں بھی آیا ہوں۔ پہلے لوگ جو بھی لکھتے آئے ہیں، میری تحریر ان سے مختلف ہونی چاہیے۔ مجھے کسی نئے خیال، نئے مضمون کا اضافہ کرنا چاہیے۔ ورنہ میرا لکھنا بے مقصد اور بے نتیجہ ہے۔

☆ اچھا یہ بتلایئے! مشاعروں اور گلوکاروں سے بدکنے کی وجوہات کیا ہیں؟

☆☆ میرے خیال میں 'بدکنے'' کا لفظ شائستگی سے کافی دور ہے۔ گریز کا استعمال زیادہ مناسب ہے۔ مشاعروں میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے، تو تجربہ یہ ہوتا ہے کہ ترنم والوں کو زیادہ غور سے سنا جاتا ہے۔ شاعری مضمون کچھ بھی ہو، پھر مزاحیہ شاعری زیادہ داد پاتی ہے۔ یا خواتین کی دلچسپی سے سماعت ہوتی ہے۔ ہمارے شعروں کو خاص پذیرائی نہیں ملتی۔ اگرچہ ہم لکھتے ان ہی عام لوگوں کے لیے ہیں۔ سیاسی جلسوں میں بھی سنجیدہ تقریریں نہیں چلتی ہیں۔ جذباتی، مزاحیہ باتیں زیادہ مقبولیت پاتی ہیں۔ جب شعر سناتے ہوئے میں سامعین کی آنکھوں میں دیکھتا ہوں اور جب کوئی خاص تاثر ملتا ہو تو میں اپنے آپ کو ان پر بوجھ محسوس کرنے لگتا ہوں اور غزل کے کچھ اشعار چھوڑ بھی دیتا ہوں۔ اس لیے خود کسی مشاعرے میں جانے کی خواہش نہیں کرتا ہوں۔ دوستوں سے سنتا رہتا ہوں کہ مشاعروں کے لیے باقاعدہ گروپ ہیں، لابیاں ہیں۔ ایک شاعر کو بلایا جاتا ہے تو

وہ اپنے ساتھی شعراء کی ہمراہی کی شرط عاید کرتے ہیں۔ اندرون ملک بھی اور دوسرے ملکوں کے لیے بھی یہی صورت حال ہے۔ پھر اپنے صحافتی فرائض بھی مجھے مشاعروں میں نہیں جانے دیتے۔ مشاعرے جس وقت منعقد ہوتے ہیں، وہی ہماری زیادہ مصروفیت کا عالم ہوتا ہے۔ بیرون ملک مشاعروں کے لیے کئی کئی ہفتے بلکہ ماہ درکار ہوتے ہیں، جو میرے لیے مشکل ہے، لیکن میں مشاعروں کو ادب کے فروغ میں بہت مدد و معاون سمجھتا ہوں، لیکن شعراء کا انتخاب شاعری کے حوالے سے ہونا چاہیے۔ خوش الحانی بنیاد نہیں ہونی چاہیے۔ گلوکاروں سے گریز بھی وہی وقت کا مسئلہ ہے۔ فرصت ہونی چاہیے کہ ان کے پاس بیٹھ کر دھنیں تیار کی جائیں۔ کہیں الفاظ میں تبدیلی ناگزیر ہو وہ کی جائے۔ گلوکار اور گلوکارائیں، ادب اور ثقافت کے فروغ میں بہت موثر، عوامی اور نتیجہ خیز کردار ادا کرتی ہیں۔

کراچی میں غزل کے بہت اچھے گائیک سلامت علی اور ان کی گلوکارہ بیگم عذرا ریاض نے بھی میری ایک دو غزلوں کو امر کر دیا ہے۔

ایسے چپ چپ بھی کیا جیا جائے
عشق ہی اب تو کر لیا جائے

دل ہے ویران شہر ہے خاموش
فون ہی اس کو کر لیا جائے

یہ غزل انہوں نے بھارت میں بھی کہیں گائی۔ وہیں سے بھارت کے ایک اہم جریدے نے اسے انگریزی میں ڈھال کر اپنے قارئین کو پیش کیا۔ اور اسے 'ٹیلی رومانس' کا نام دیا۔ یہ جریدہ بھارت کے نوبل انعام یافتہ امرت سین کی صاحبزادی نکالتی ہیں۔ وہ مجھ سے واقف بھی نہیں ہیں، اس لیے مجھے اس انتخاب کی زیادہ خوشی ہوئی۔ اسی طرح دبئی میں دس بارہ برس پہلے بہت منفرد غزل لکھنے والے خوشبیر سنگھ شاد نے بتایا کہ لکھنؤ میں ایک بہت اچھے گلوکار ہیں روی شنکر۔ وہ آپ کی غزلیں گاتے ہیں اور گرلز کالجوں میں بہت مقبول ہیں۔ پتہ نہیں چل رہا تھا، کونسی غزل ہے۔ پھر 2007ء میں لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے گھر پر آنے کی دعوت دی۔ اپنے رسم و رواج اور تمدن کے مطابق ان کے سب گھر والوں نے میرا پرجوش استقبال کیا، جیسے میں کوئی اوتار ہوں۔ وہ کہنے لگے کہ روی تو آپ کا پجاری ہے۔ ڈھونڈتا رہتا ہے کہ آپ کی اور غزلیں مل جائیں۔ پھر میں نے سنا کتنی اچھی دھن میں، کتنی مدھر آواز

لکھ اپنی ڈائری میں کبھی میرا نام بھی
ان رنگ رنگ لفظوں میں اک سادہ نام بھی
دن تھے کہ تیری کار کا نمبر بھی یاد تھا
اب ہیں کہ ہم کو بھول گیا اپنا نام بھی
محمود شام پوچھتے ہیں کہ وہ کون ہے
تم ہی کہو کہ ہوتا ہے خوشبو کا نام بھی

اتنی اچھی موسیقی میں اپنے شعر سن کر ایک والہانہ خوشی ہوئی۔ یہ بڑی بات ہے کہ ایسے بڑے مغنی خود ہماری غزل پسند کریں۔ بجائے اس کے کہ میں اپنا صحافیانہ اثر و رسوخ، ذاتی تعلقات اس کے لیے استعمال کروں۔

☆ تراجم کے حوالے سے یہ فرمایئے کہ آپ نے کن غیر ملکی اہلِ قلم کو اردو میں منتقل کیا ہے اور اردو حلقوں نے اُس کا نوٹس کس طرح لیا ہے؟

☆☆ ایک ترجمہ تو ملازمت کے فرائض کا حصہ ہوتا ہے، دوسرا اپنے شوق کے تحت ہوتا ہے۔ بسلسلہ ملازمت تو بہت تراجم کیے ہیں، ان کا ذکر غیر مناسب ہے۔ ایک کتاب Born Free کا ترجمہ 'آزاد شیرنی''۔ جناب حنیف رامے کے مکتبۂ جدید کے لیے ضرورت معاش کے تحت کیا۔ شکاریات کے سلسلے کی یہ ایک اہم کتاب ہے۔ بچوں کے لیے ملاں نصیر الدین کی کہانیاں اور لطیفے اردو میں منتقل کیے، لیکن زیادہ قابل ذکر وہ منظوم تراجم ہیں، جو ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں شوق کے تحت مختلف ملکوں کی شاعری کے کیے۔ اور اخبار جہاں میں ہر ہفتے میں شائع بھی ہوتے تھے۔ یہ بعد میں ایک شعری مجموعے 'آخری رقص'' میں شامل کیے۔ ان میں ایزرا پاؤنڈ، محمود درویش، ہوچی منز نمایاں ہیں۔ امریکہ، بھارت، سری لنکا، چین، ویت نام، انڈونیشیا، ملائشیا، جرمنی آئس لینڈ، نگارا گرے، پولینڈ، فلپائن، رومانیہ کی جو نظمیں اچھی لگیں، ان کو اردو میں منتقل کیا۔ اردو حلقوں نے اس کا نوٹس لیا یا نہیں۔ اس کا مجھے پتہ نہیں چل سکا۔ البتہ قارئین نے ہمیشہ پسند کیا۔ داد بھرے خط لکھے۔ شہزادی ڈیانا کی موت پر جان ایلٹن نے جو نوحہ لکھا اور گایا تھا، اسے بھی میں نے اردو میں نظم کیا، تو بہت تعریف ہوئی تھی۔

☆ آپ نے صرف تیس سال کی عمر میں سفر نامہ نگاری شروع کی تھی اب تک آپ کے کتنے سفر نامے منظرِ عام پر آئے اور اس ضمن میں معروف طرز پر آپ کا ذکر کیوں نہیں کیا جاتا؟

☆☆ میں اندرون ملک سفر کر رہا ہوں یا وطن سے دور کہیں محوِ سیاحت ہوں یا صدر، وزیر اعظم کے ساتھ غیر ملکی دوروں میں یا کسی کانفرنس، سیمنار میں، تو میں اس بار امانت تلے دبا رہتا ہوں کہ اس سیاحت کا موقع اپنے جن قارئین کی بدولت مل رہا ہے، مجھے انہیں سفر میں ساتھ لے کر چلنا چاہیے، اسی لیے اپنے مشاہدات کے نکات تفصیل سے لکھتا ہوں۔ تین سال قبل تک میں وطن واپس آ کر ان نکات کی بنیاد پر سفر ناموں کی عمارت استوار کرتا تھا، لیکن جب سے ملک میں پرائیویٹ ٹی وی چینل شروع ہوئے، اور وہ ساتھ ساتھ ہی اپنی فلم اور رپورٹ بھیجنے لگے، تو میں نے محسوس کیا کہ میرے قارئین کو بھی یہ منظر نامہ، یہ رنگ، خوشبوئیں، یہ سماں، تفصیلات ساتھ ساتھ ملنی چاہئیں۔ تو میں نے ''.....سے ایک خط'' بھیجنے کی روایت کا آغاز کیا۔ یہ مشکل کام ہے کیوں کہ صحافی کی حیثیت سے پہلے تقریبات پریس کانفرنسوں، استقبالیوں میں شرکت کرنی ہوتی ہے، اس کے بعد اس کی خبر، رپورٹ لکھ کر بھجوانی

ہوتی ہے۔اس کے بعد'.....ایک خط' کی ذمہ داری ازخود اٹھالی ہے،لیکن اس کی جس طرح پذیرائی ہوئی، قارئین، سیاسی، سرکاری حلقوں نے غور سے پڑھا، داد دی۔ پھر یونیورسٹیوں کے صحافت کے شعبوں میں اردو صحافت میں اس نئی روایت کا نوٹس لیا گیا۔ میری سفری روداد عام روائتی سفرناموں سے مختلف رہی ہے۔اس میں سیاسی، سماجی، تقابلی مطالعے بھی ہوتے ہیں، معلومات اعداد وشمار بھی۔ پہلا سفرنامہ' لاڑکانہ سے پیکنگ' ہے، جس میں 1970ء کے انتخابات سے ذوالفقار علی بھٹو کی سندھ، پنجاب کے اندرونی علاقوں میں عوامی رابطے کی کہانیاں ہیں۔انتخابات میں فتح کے بعد مشرقی پاکستان میں اکثریتی پارٹی عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن سے مذاکرات کی روداد اور آخر میں عوامی جمہوریہ چین کا پہلا دورہ۔

دوسرا سفرنامہ' کتنا قریب کتنا دور'۔ بھارت کے سفر کی یادیں ہیں۔ شملہ معاہدہ کیسے ہوا، کیونکر ہوا اور کیا کیا ہوتا رہا۔ پھر بعد میں ان دنوں میں بھارت کی مسافرت، جب ہمارے سفارتی تعلقات نہیں تھے۔سوئٹزرلینڈ والے دونوں ملکوں میں ایک دوسرے کے مفادات کی نگرانی کرتے تھے۔ وزیراعظم اندرا گاندھی سے انٹرویو، ممبئی، دہلی، آگرہ، پٹیالہ، راجپورہ۔ بعد میں اسی میں آگرہ مذاکرات کی روداد اور امریکی محکمہ اطلاعات کے تحت ہونے والے ایک سفری سیمینار کی روداد بھی شامل ہے۔اور اب اس کتاب کا نام 'بھارت میں بلیک لسٹ'' ہے۔ایک سفرنامہ 'برطانیہ میں خزاں' ہے۔جس میں برطانیہ کے دیہی علاقوں اور یادگار مقامات کی روداد ہے۔مشہور ناول لکھنے والے برونٹی سسٹرز کے گھر اور چرچ کے مشاہدات بھی۔تیسرا سفرنامہ 'امریکہ کیا سوچ رہا ہے'' ہے۔ جس میں ستمبر 2001ء کی دہشت گردی کے خطرناک واقعات کے بعد امریکہ میں دو ہفتے کا ایک سفر، جہاں وزارت خارجہ، وزارت دفاع، ہوم لینڈ سیکورٹی کے اہم حکام سے ملاقاتیں، آئندہ برس میں امریکہ کے فوجی، سیاسی عزائم۔ یہ کتاب بہت زیادہ مقبول ہوئی۔

ان سفرناموں کا ذکر کیوں نہیں ہوتا۔ مجھے مقبول سفرنگاروں کی طرح کیوں پیش نہیں کیا جاتا۔

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

یہ سارے سفرنامے مقبول رہے۔اب' آؤٹ آف پرنٹ' ہیں۔ ان کی تلاش جاری رہتی ہے۔ مجھ سے فرمائش ہوتی ہے۔ میرے لیے یہی داد ہے۔یہی ذکر۔

☆ ''تقدیر بدلتی تقریریں'' مرتب کرنے کا خیال کب اور کیونکر آیا اور اُن میں کن لوگوں کی تقریریں شامل کیں اور احباب ادب نے اُسے کس نگاہ سے دیکھا؟

☆☆ (25 'تقدیر بدلتی تقریریں'۔مرتب کرنے کا خیال اس وقت آیا، جب محترمہ بے نظیر بھٹو کو صدر غلام اسحاق خان کی ایک تقریر نے معزول وزیراعظم بنا دیا۔ میں سوچنے لگا کہ کتنی طویل انتخابی مہم چلتی ہے، کتنے بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں۔ جلوس نکلتے ہیں، ملک کے کونے کونے میں ایک جوش و جذبہ ہوتا ہے، کروڑوں لوگ ووٹ ڈالتے ہیں، منتخب ہوکر، برسراقتدار آنے کے لیے کتنی دولت صرف ہوتی ہے، کتنی توانائی، کتنے لوگ شامل ہوتے ہیں، لیکن ایک شخص کروڑوں ووٹوں سے منتخب ہونے والے کو ایک تقریر سے برطرف کردیتا ہے۔ یہ تقریریں کتنی اہم ہیں، کتنی نتیجہ خیز ہیں۔ یہ ہماری تقدیر بناتی بھی ہیں اور بگاڑتی بھی۔ کیوں نہ انہیں یکجا کیا جائے۔تاریخ پاکستان کا ہر اہم موڑ کسی نہ کسی تقریر سے جڑا ہوا ہے۔ بانی پاکستان بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی 11/اگست والی تقریر سے لے کر صدر غلام اسحاق خان کی اگست 1990ء کی تقریر تک انتخاب کرنے کے لیے میں کتابیں کھنگال رہا تھا کہ اپریل 1993ء آگیا۔اور وزیراعظم میاں نواز شریف کو برطرف کرنے کے لیے بھی ایک تقریر قوم نے سن لی۔

یہ تقریریں سب کے لیے اہم ہیں۔ سب کی قسمت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ احباب ادب بھی اس سے متاثر ہوئے ہوں گے، مگر مجھے ان کی طرف سے کبھی کوئی منفی یا مثبت ردعمل موصول نہیں ہوا۔

☆ اصولی طور پر ''شب بخیر'' مکمل ناول کے درجے میں آتا ہے جبکہ آپ اسے کچھ اور ہی گردانتے پر مُصر ہے۔ مثلاً آپ کے ذہن میں کیا تھا اور بعد از تحریر بن کیا گیا؟

☆☆ یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی اور عنایت ہے کہ آپ 'شب بخیر' کو مکمل ناول کے درجے میں شمار کررہے ہیں، لیکن میں نے افسانے نہیں لکھے۔ ناول بھی پہلے تخلیق نہیں کیا تھا، اس لیے مجھے یہ اعتماد نہیں تھا کہ میں ناول نگاری کے تقاضے پورے کرپایا ہوں یا نہیں۔اس لیے میں نے اسے ''ایک تحریر۔ناول جیسی''۔ میں نے اسے صرف مکالموں پر استوار کیا ہے۔ میرے پاس بھی وقت نہیں تھا کہ موسم، گردوپیش اور ماحول کی تصویر کھینچوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے قاری کے پاس بھی اتنا وقت نہیں ہوگا۔ میری کوشش رہی کہ مکالموں سے ہی مقام اور آس پاس کو اجاگر کروں۔ میں اس میں کتنا کامیاب رہا۔ قارئین میں اس ناول کی مقبولیت سے تو یہ تاثر ملا۔ پاکستان میں ایک دو اخبارات نے اسے قسطوں میں چھاپا۔ بھارت میں بھی ایک ادبی رسالے میں یہ قسط وار شائع ہوا۔وہاں سے بھی قارئین نے اس کی داد دی۔سب سے زیادہ خوشی مجھے ڈاکٹر انور سدید کی حوصلہ افزائی سے ہوئی۔ یہ ہمارے سینئر ترین نثر نگاروں، مبصروں اور شعراء میں سے ہیں۔انہیں جب یہ ناول ملا تو انہوں نے روزنامہ 'خبریں' میں بہت بھرپور تبصرہ کیا۔ پھر مجھے ذاتی طور پر خط بھی لکھا۔ادبی حلقوں نے حسب معمول اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا، کیوں کہ میں نے کبھی نقاد سے اس سلسلے میں کوئی رابطہ نہیں کیا۔ان کے ہاں ازخود کتابوں پر توجہ دینے کی روایت نہیں ہے۔

☆ ایک زمانے میں آپ امریکہ، برطانیہ اور دیگر ممالک کے صاحبِ اختیار لوگوں کو تواتر کے ساتھ خطوط تحریر کرتے تھے۔ اُن کا نفسِ مضمون اور مخاطبین کے ردِعمل کی بابت کچھ بتلایئے؟

☆☆ اُس زمانے میں انگریزی اور اردو صحافت میں اربابِ اقتدار کے نام کھلے خط لکھنے کی روایت تھی۔ انگریزی میں OPEN LETTER، فارسی، عربی میں مکتوب مفتوح، نائن الیون کے بعد جب امریکہ، برطانیہ اور مغرب کے دیگر ممالک نے مسلم ممالک کے خلاف ایک مہم شروع کی، اسلام کو شدت پسندی کے مترادف قرار دیا، تو میں نے سوچا کہ ان ملکوں کے دانشوروں کو براہ راست مخاطب کیا جائے۔ ان کے ضمیر کو بیدار کیا جائے۔ لیکن یہ محسوس ہوا کہ ہمارے ہاں تو اپنی حکومتی پالیسیوں کے خلاف شدید ردِعمل ظاہر کرنے کا رواج ہے، لیکن ان ملکوں میں اپنی خارجہ پالیسیوں کو زیادہ تر من وعن تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اس پر اعتراضات نہیں ہوتے۔ یہی حال بھارت کا بھی ہے۔ وہاں کے ادیبوں، دانشوروں، صحافیوں کو کشمیریوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے حوالے سے کھلا خط لکھا، لیکن کسی نے جواب دینا گوارا نہیں کیا۔ بھارت کی جمہوری، شہری اور عدالتی آزادیوں کا دنیا میں بہت چرچا ہے۔ خود پاکستان میں بھی حقوق انسانی کے دعوے دار، آزاد میڈیا کے چیمپئن بھارت میں جمہوری تسلسل سے بہت مرعوب ہیں، لیکن اس جمہوریت سے کشمیر کے عوام کو کیا فائدہ ہوا ہے یا ہندوؤں کی چھوٹی ذاتوں کی کتنی محرومیاں دور ہوئی ہیں۔ یہ وہ نہیں دیکھتے۔

☆ اگر اس تاثر کو درست مان لیا جائے کہ آپ کی کامیابی اچھے دوستوں کی مرہونِ منت ہے تو اُن دوستوں کے ناموں کا منظرِ عام پر آنا اور تعاون کی نوعیت جاننا آپ کے قاری کا حق بنتا ہے؟

☆☆ میری ہی نہیں، ہر شخص کی زندگی میں اس کے ہم مکتب، ہم جماعت اور دوست معاونت کرتے ہیں، اس کا اعتراف بھی کرنا چاہیے۔ ہمارے گھریلو مالی حالات ابتدا سے ہی بہتر نہیں تھے۔ اس کے باوجود والد محترم نے ہمیں اچھی سے اچھی تعلیم دلانے کی کوشش کی۔ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ کامیابی کی راہ دکھانے میں ہمارے محترم استاد جناب محمد حیات خان سیال کا نمایاں کردار ہے۔ جھنگ سے لاہور جا رہا تھا، تو جناب بلال زبیری نے مختلف دوستوں کو خط لکھ کر مجھے متعارف کروایا۔ لاہور میں 'قندیل' کے مدیر جناب شیر محمد اختر نے قومی صحافت میں داخل ہونے میں کلیدی معاونت کی۔ جناب وارث میر ہفت روزہ صحافت سے روزنامہ اخبار نویسی میں لے گئے۔ جناب نذیر احمد ناجی نے لاہور سے کراچی بلا کر ایک نئی دنیا کے دروازے کھول دیئے۔ جناب قتیل شفائی نے ہاتھ پکڑ کر بہت کچھ سکھایا۔ پٹیالہ اسٹیشنری ہاؤس کے مالکان جناب نور محمد اور نور احمد ہمارے والد محترم کے دوست تھے۔ یہ اگر لاہور میں ہماری دستگیری نہ کرتے تو ہمیں بی اے کے بعد تعلیم جاری رکھنا ممکن نہ ہوتا۔ اور گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر نذیر احمد نے ہماری ایک غزل 'ماہ نو' میں پڑھی۔

عمر گزری کہ تری دھن میں چلا تھا دریا
جا بجا گھومتا ہے آج بھی پگلا دریا

اس غزل کی پسندیدگی نے گورنمنٹ کالج لاہور کے دروازے ہم پر کھول دیے۔ کالج میگزین 'راوی' کی ادارت ہمارا مقدر بن گئی۔ یہ وہ منصب ہے، جس پر اقبال، فیض، حنیف رامے اور بڑے بڑے دانشور ادیب شاعر فائز رہ چکے تھے۔

یہاں ملک کے ممتاز قانون داں اقتدار علی ہاشمی کا تذکرہ ناگزیر ہے، جنہوں نے ہمارے خلاف ہر قسم کے مقدمات کی کسی بھی فیس کے بغیر پیروی کی۔ کسی کی بھی کامیابی میں اس کے اہل خانہ سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اپنے والد، والدہ کی سرپرستی کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ ہماری بیگم بلقیس بانو نے ایسے برے حالات میں بہت اعتماد اور ہمت سے وقت گزارا۔ ہمیں اپنی صحافتی اور تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھنے دیں۔ پھر ہماری اولاد نے بھی بھرپور ساتھ دیا۔ بڑی صاحبزادی فرخندہ محمود بھی بہت صابر شاکر رہیں۔ بڑے صاحبزادے قاسم محمود نے ہماری وجہ سے کٹھن اوقات کا سامنا کیا۔ منجھلے بیٹے سلیم محمود، چھوٹے بیٹے نعیم محمود بھی اپنی منزلوں کی طرف گامزن رہے۔ سب سے چھوٹی صاحبزادی رخشندہ محمود نے بہت حوصلہ دیا۔ باشار رشید ہمارے داماد بھی بہت ساتھ دیتے ہیں اور اب ان کے بچوں سے زندگی کے نئے انداز معلوم ہوئے۔ عدیل شرجیل، دانیال عندلیب بڑی بیٹی کے گلشن کے پھول ہیں۔ ان کی مہک نے کئی نظمیں لکھوائی ہیں۔ رخشندہ کی صاحبزادی پریاں سب سے زیادہ محبت کا سماں پیدا کرتی ہے۔ وجدان باشار ہر وقت خوش رہتا ہے اور ہمیں بھی خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ سلیم محمود کی صاحبزادی عبیرہ اپنے انداز سے بہلاتی ہے۔ باسل محمود کا اسلوب اپنا ہے، نویرہ محمود مسرتیں تخلیق کر رہی ہے۔ یہ نواسے نواسیاں، پوتے پوتیاں سب سے اچھے دوست ہیں کامیابی میں زیادہ ان کا حصہ ہے۔

☆ سیاست میں آپ کی دلچسپی کے چرچے اکثر سننے میں آئے ہیں۔ مرادِ عملی سیاست سے ہے تو یہ دلچسپ احوال ہمیں بھی سنایئے؟

☆☆ سیاست ایک ایسا شعبہ اور پیشہ ہے جس سے کروڑوں انسانوں کی تقدیر بنتی یا بگڑتی ہے۔ اس لئے ایک صحافی، شاعر اور تجزیہ نگار کی حیثیت سے اس میں دلچسپی ناگزیر ہے یہ پیشہ ورانہ امور کا تقاضا بھی ہے، صحافتی ذمہ داریوں کا حصہ بھی۔ قوم کا درد رکھنے والے کسی بھی حساس شہری کو سیاست پر نظر رکھنا پڑتی ہے۔ کالج کے دور سے ہی ذہن جمہوری آزادیوں، ترقی پسند سوچ، سیکولر فکر کی طرف مائل تھا جس جنت کا خواب لئے اپنے آبائی گھر بار چھوڑے..... وہاں علامہ اقبال کی فکر اور قائداعظم کی پالیسیوں کے مطابق معاشرے کی تعمیر ایک پاکستانی کی حیثیت سے اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس لئے فلسفے میں داخلہ لیا کہ یہ اقبال

کا مضمون تھا۔ سوچتا یہی تھا کہ پاکستان کی فکری بنیادیں کمزور ہیں، فلسفے اور دیگر علوم کا اطلاق معاشرے میں نہیں ہو رہا ہے۔ علامہ اقبال کے خطبات مدراس۔

Reconstruction of Religous thought

کی روشنی میں مذہب اور سائنس کا امتزاج ہی وہ معاشرہ تشکیل دے سکتا ہے جس کا خواب قائد اور مفکر نے دیکھا تھا۔ پاکستان کی بانی جماعت مسلم لیگ اس سے بہت دور نظر آتی تھی۔ جب جناب ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی اسکا منشور اور پروگرام ان افکار سے بہت قریب نظر آیا۔ اس لئے اس سے ہمدردیاں ہوگئیں۔ اس کے ممبر کبھی نہیں بنے۔ اپریل 1970ء میں اخبار نویسوں کی انجمنوں نے اپنے مطالبات منوانے کیلئے ملک گیر ہڑتال کی۔ 9 روز تک مغربی اور مشرقی پاکستان میں ایک اخبار بھی شائع نہیں ہوا۔ ملک کے دونوں حصوں کے صحافی متحد تھے۔ جماعت اسلامی سے وابستہ صحافیوں نے اپنی الگ انجمن بنالی اور ہڑتال توڑ دی۔ ہڑتال جاری رکھنے والے 200 سے کچھ زیادہ صحافی ملک کے دونوں حصوں میں اخبارات سے نکال دیئے گئے۔ جن میں ہم بھی شامل تھے۔ جولائی 1970 میں پارٹی نے اپنا اخبار مساوات نکالا۔ تو بھٹو صاحب نے پورے سندھ کے لئے مجھے نمائندہ خصوصی مقرر کیا۔ حنیف رامے اس کے مدیر تھے ان دنوں کی اس وابستگی کے پیش نظر اکثر احباب نے خیال کیا کہ ہم پی پی پی کے باقاعدہ رکن ہیں۔ جب 1970ء کے انتخابات کے نتیجے میں اور سقوط مشرقی پاکستان کے بعد باقی ماندہ پاکستان میں پی پی پی کی حکومت قائم ہوئی تو برطرف اخبار نویسوں کی اپنے اپنے اخبارات میں واپسی ہوئی، ہم نے بھی اپنے پیشے کو ہی اولیت دی۔ کسی سرکاری ملازمت کو قبول نہیں کیا پھر ہم نے ''اخبار جہاں'' چھوڑ کر 1975ء میں اپنا ہفت روزہ ''معیار'' شروع کیا۔ یہ اپنی طرز کا ہفت روزہ تھا جس کے مندرجات، تحقیقی رپورٹیں آج بھی صحافتی حلقے یاد کرتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق نے پی پی پی کی منتخب حکومت کا تختہ الٹا تو ''معیار'' نے مارشل لاء کے خلاف مستقل لکھا۔ یہ رسالہ جمہوری طاقتوں کا ترجمان بن گیا۔ ہم مارشل لاء کی مخالفت کر رہے تھے۔ کچھ حلقے اسے پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت سمجھ رہے تھے۔ ''معیار'' کا ڈیکلریشن منسوخ ہوگیا۔ یہ ساری جدوجہد جمہوریت کی بحالی کے لئے تھی اور ہم صحافت کے پیشہ ورانہ تقاضے پورے کر رہے تھے۔ یہ عمل ہماری سیاست میں شرکت نہیں تھی۔ کبھی کسی جماعت کے رکن بنے، نہ کبھی اسمبلی یا سینیٹ کی رکنیت کے لئے کسی پارٹی کی طرف سے ٹکٹ کی پیشکش قبول کی۔

☆ بچپن سے پبلیشر بننے کی کوشش اور خواہش کے باوجود آپ اپنے ادارے کی مطبوعات معیار، ٹوٹ بٹوٹ، The Destination کو کامیابی سے ہمکنار کیوں نہ کر سکے؟

☆☆ یہ بہت اچھا سوال ہے اس کا قلق بھی رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمیں کاروبار کرنا نہیں آتا ہے۔ ایک بزنس مین کو یا اخبار رسالوں کے مالک کو بے حس ہونا چاہئے۔ اپنے اسٹاف سے کوئی ہمدردی نہیں دکھانی چاہئے۔ حکومت کا خوشامدی اور تجارتی اداروں کا مداح، پیسے خرچ کرنے کی بجائے بچانے چاہئیں۔ ہمیں کاروبار کرنا نہیں آتا، اسلئے یہ ادارہ قائم نہ رکھ سکے، لیکن اس میں بنیادی دخل مارشل لاء حکومت کا ہے جس نے ''معیار'' کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا۔ اس کے بعد سندھ ہائیکورٹ کا جس نے مارشل لاء حکومت کے غلط احکامات کے بارے میں صحیح فیصلہ دینے میں دو سال لگا دیئے۔ ایک سال مقدمہ چلا، اسٹے آرڈر نہیں ملا، دفتر چلتا رہا۔ عملے کی تنخواہیں دیتے رہے۔ دوسرے رسالوں کے ڈیکلریشن مہنگے داموں خرید کر ''معیار'' کی کمی پوری کرنے کی کوششیں کیں۔ حکومت ان رسالوں کی اشاعت پر بھی پابندی لگاتی رہی۔ سندھ ہائیکورٹ نے ایک سال تک فیصلہ محفوظ رکھا اور جب فروری 1980ء میں یہ حکم سنایا کہ سندھ حکومت کے احکامات غیر قانونی تھے۔ تو پورے ملک میں قبل از اشاعت سنسر تھا۔ دو سال میں ریڈرشپ ٹوٹ جاتی ہے، لوگ بھول جاتے ہیں، ہم نے پھر بھی گھر بنک کے پاس گروی رکھ کر معیار کی اشاعت شروع کی ..... لیکن سنسر نے اسے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ پھر جب تمام اخبارات و رسائل سے سنسر اٹھایا گیا..... ''معیار'' پر سنسر جاری رہا۔ 1985ء میں مارشل لاء کے خاتمے کے ساتھ ہی ختم ہوا۔ تو یہ ہے کہانی..... ''معیار'' ٹوٹ بٹوٹ اور The DESTINATION کی کاروباری ناکامی کی۔

☆ شام صاحب! کچھ لوگ آپ پر خشک مزاجی اور کسی قدر مغروریت کا الزام کس بنیاد پر لگایا کرتے ہیں؟

☆☆ یہ کون لوگ ہیں..... مجھے نہیں معلوم، کیونکہ میں نے تو کبھی عجز و انکسار کا دامن نہیں چھوڑا، اپنی ادبی تحریروں کی اہمیت تسلیم کروانے، غزلوں کو گلوکاروں سے پیش کروانے، ریڈیو ٹی وی کے پروڈیوسروں سے اس سلسلے میں اپنے تعلقات قائم کرنے کی طرف نہیں گیا۔ نقاد حضرات سے رسم و راہ نہیں بڑھائی۔ پھر اپنی صحافتی ذمہ داریاں پوری دیانتداری اور تندہی سے انجام دینے میں مصروف رہا ہوں۔ اس لئے ممکن ہے بعض حضرات کو ایسا تاثر ملا ہو..... ورنہ میں تو اپنے آپ کو کافی رنگین مزاج سمجھتا ہوں..... اس کے عملی ثبوت بھی پیش کر سکتا ہوں۔

☆ اچھا یہ فرمایئے! جس دور میں نوجوانوں کو انجینئر اور ڈاکٹر بننے کا خبط سوار تھا آپ کو فلاسفر بننے کا خیال کیوں آیا نیز آپ مسلم، گریک، میٹافزکس، لوجک، ایتھک میں سے کس فلاسفی کے زیادہ قائل ہیں اور آپ کے ہاں اس کے برتاؤ کی صورت کیا ہے؟

☆☆ میں پہلے کسی سوال کے جواب میں بتا چکا ہوں کہ فلسفے کی طرف کیوں جانا ہوا۔ گھر میں امام حمید، غزالی اور شاہ ولی اللہ کا ذکر رہتا تھا۔ پھر ملک کے بگڑتے حالات، میٹرک کا امتحان دیا تو پہلا مارشل لاء لگ گیا، اس لئے ذہن

میں کیا، کیوں، کہاں شروع ہوگئی۔ پیڑ سوال کرتے تھے کہ یہ کیا ہورہا ہے، ریت پوچھتی تھی کہ انسان کی یہ حالت کیوں ہے۔ ہوائیں دامن پکڑ کر استفسار کرتی تھیں حالات کب بدلیں گے۔ ہجرت کر کے آنیوالے اپنے خوابوں کی کرچیاں چنتے دکھائی دیتے تھے، جاگیرداروں کے مظالم سہتے کسانوں کی سپاٹ آنکھیں بہت کچھ کہتی تھیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ایسا ہونے سے کیسے رک سکتا ہے۔ اس کا جواب کس مضمون میں مل سکتا ہے۔ اقبال جنہیں مفکر پاکستان کہتے ہیں..... جو سب سے مقبول شاعر ہیں..... حکیم الامت ہیں..... انکا مضمون کیا تھا..... پتہ چلا کہ فلسفہ، اس لئے ایف اے میں انگریزی کے ساتھ فلسفے کا مضمون اختیار کیا۔

ایم اے پاس کرنے کے بعد ''قندیل'' ہفت روزہ کے لئے میں نے اسی جستجو میں انٹرویز کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ پاکستانی معاشرے میں ادیب کا منصب، پاکستانی معاشرے میں استاد کا منصب، اسی حوالے سے میں نے پاکستان میں فلسفی کا منصب کے لئے انٹرویوز کئے۔ علامہ اقبال کے فرزند جناب جاوید اقبال سے پہلا رابطہ اسی ضمن میں ہوا۔ فلسفے کے اساتذہ سے بھی ملا آج بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہماری سیاسی جماعتیں کسی فکری بنیادی فلسفے اور حکمت کے بغیر سیاست کرنا چاہتی ہیں جو ناممکن ہے فلسفہ صرف ایم اے اور ڈاکٹریٹ کے لئے نہیں بلکہ معاشرے میں اس کا اطلاق ہونا چاہئے۔ یونیورسٹی میں فلسفے کے شعبوں کو اپنی تدریس اور تعلیم کا معاشرے سے ناطہ جوڑنا چاہئے۔ ہر سال فلاسفیکل کانگریس کا انعقاد ضروری ہے ملک میں موجود فکری سوالوں کا جواب اسی کانگریس کو دینا چاہئے۔

☆ بھارت میں بلیک لسٹ ہونے کی روداد کیا ہے اور اس طرح کی صورتِ حال کا سامنا کسی اور ملک کی حوالے سے بھی ہوا ہے؟

☆☆ ''بھارت میں بلیک لسٹ'' ایک اذیت ناک اور تکلیف دہ تجربہ تھا اپنے صحافیانہ فرائض کی انجام دہی کے لئے شملہ معاہدے (1972) سے لے کر مختلف برسوں میں بھارت جانے کا اتفاق ہوتا رہا یہ غالباً 1997ء کی بات ہے کہ امریکی محکمہ اطلاعات کے تحت ہونے والے ایک ٹریولنگ سیمینار کے تحت دہلی اترے اسی سیمینار کے کچھ حصے پاکستان کے تین شہروں لاہور، اسلام آباد، کراچی میں ہو چکے تھے جس کے لئے بھارت کے مختلف اخبارات کے ایڈیٹر آئے ہوئے تھے پاکستان سے بھی کچھ ایڈیٹر ان کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ویزوں کا حصول بھی امریکی سفارت خانوں نے کیا تھا جب دہلی ایئرپورٹ پر اترے تو باقی سب ایڈیٹرز کو جانے دیا گیا ہمیں ایک الگ کمرے میں بٹھا دیا گیا اور کہا کہ کچھ پوچھنا ہے۔ ہم مہمان تھے امریکی محکمہ اطلاعات کے، سارے اخراجات بھی ان کے تھے، ذمہ داری بھی ان کی، ان کے عملے نے بہت شور مچایا اور کہا کہ ویزا تو ہم نے حاصل کیا ہے اگر کوئی اعتراض تھا تو ویزا جاری نہ کیا جاتا۔ سفارتی رابطے حرکت میں آگئے کوئی 3 گھنٹے بعد جانے کی اجازت دی گئی مگر میں بہت کبیدہ خاطر ہو چکا تھا اس روز کسی میٹنگ میں شرکت نہ کر سکا۔ دہلی کے علاوہ ہمیں ممبئی جانا تھا، واپسی پھر دہلی سے ہی تھی، واپسی پر بھی وہی ہوا کہ یہ بھارت میں داخل کیسے ہوئے اب وزارت داخلہ کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتے۔ پھر امریکیوں نے احتجاج کیا، سفارتی رابطے کئے اور ہمیں بھارت سے باہر نکلنے کی اجازت مل گئی اگلے برس 1998ء میں انبالے میں غالب کی یاد میں ایک مشاعرہ تھا مدیر تخلیق جناب اظہر جاوید کے توسط سے دعوت نامہ ملا، ویزا ہم نے خود حاصل کیا، لاہور سے دہلی روانہ ہوئے مجھے کھٹکا تو تھا اس لئے اظہر جاوید سے کہہ دیا کہ گزشتہ سال کا واقعہ دہرایا جا سکتا ہے اس لئے آپ تو باہر نکل جایئے گا منتظمین کو اطلاع دے دیجئے گا اگر وہ کچھ کر سکیں، وہی ہوا جس کا ڈر تھا اتفاق سے امیگریشن پر وہی شفٹ تھی جو گزشتہ برس تھی، کمپیوٹر میں وہی اندراجات تھے۔ انہوں نے پھر روک لیا، شروع میں تو ان کا رویہ نرم تھا، کہنے لگے کہ گزشتہ سال بھی آپ کا معاملہ طے ہو گیا تھا اب کے بھی ہو جائے گا لیکن بہرحال امریکنوں اور بھارتیوں میں بہت فرق ہے امریکیوں نے تو اپنے مہمان کو اجازت دلوا دی تھی لیکن انبالہ کے مشاعرہ کے منتظمین نے تو فکر تک نہیں کی، رابطہ ہی نہیں کیا۔ اس کے بعد امیگریشن والوں کا رویہ وہی ہو گیا جو غیر ملکی دہشت گردوں کے لئے ہوتا ہے تین چار گھنٹے گزر گئے تھے، پی آئی اے والے بار بار پوچھنے بھی آئے کہ انہیں ڈی پورٹ کر رہے ہو تو بتا دو تا کہ انہیں اسی پرواز سے واپس لے جائیں، ان سے یہی کہا کہ نہیں کلیئرنس مل جائے گی، آپ جہاز لے جاؤ۔ ایئرپورٹ امیگریشن کے آفس میں چار گھنٹے بٹھانے کے بعد کہا کہ اب آپ ٹرانزٹ سیل میں رہیں گے، ڈائریکٹر ہوم افیئرز تحقیقات کریں گے پھر پی آئی اے کی آئندہ پرواز جو تین دنوں بعد آئے گی اس سے چلے جایئے گا اب ہم ان کے اسیر تھے اتنی سہولت دی گئی کہ آپ پبلک ٹیلی فون بوتھ جو اسی سیل کے ساتھ لگا تھا وہاں سے آپ اپنے سفارت خانے سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ ٹرانزٹ سیل میں ایک ہجوم تھا زیادہ تر بھارتی مسلمان تھے جو سعودی عرب سے ڈی پورٹ کئے گئے وہ خوف زدہ تھے، رو رہے تھے۔ میں نے کہا کہ محمود شام یہ تجربہ بھی کر لو یہ بھی ایک اعزاز ہے۔ سفارت خانے سے رابطہ ہو گیا انہوں نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں ہم کوشش کرتے ہیں ہائی کمیشن میں جمیل الدین مفتی اطلاعات کے منسٹر تھے بہت سینئر افسر، اخبار نویسوں سے ان کے بہت دوستانہ روابط تھے۔ سفیر ریاض کھوکھر تھے میں انتظار کرنے لگا سب سے بہتر طریقہ یہی تھا کہ بیگ میں سے کچھ کتابیں نکال کر الٹ پلٹ کیں پھر اس تجربے کے حوالے سے کچھ آمد شروع ہو گئی۔ سیل کے ساتھ ہی ٹائلٹ تھا جس کی بدبو یہاں تک آ رہی تھی سونے کے لئے ایک بنچ الاٹ کر دیا گیا تھا ہم دوپہر کی پرواز سے ڈھائی بجے کے قریب پہنچے تھے 6 بجے کے قریب ٹرانزٹ سیل کے حوالے کئے گئے، پھر رات کے ساڑھے 12 بجے اطلاع ملی کہ ہائی کمیشن سے کچھ لوگ آئے ہیں آپ ڈائریکٹر امیگریشن کے دفتر میں پہنچ جائیں وہاں کچھ افسران سے ملاقات ہوئی، بتایا گیا کہ

24 گھنٹے آپ کو دہلی میں قیام کی اجازت دی گئی ہے، لیکن آپ ڈائریکٹر ہوم افیرز کے ہاں حاضری دیں گے وہ کچھ سوالات دریافت کرنا چاہیں گے۔ جمیل الدین مفتی خود تشریف لے آئے۔ انہوں نے کہا کہ رات بہت ہوگئی ہے اب کسی ہوٹل میں جانا مناسب نہیں ان کے گھر ہی قیام کریں پھر دیکھتے ہیں کہ صبح کیا کرنا ہے یہ پوری کہانی میری کتاب ''بھارت میں بلیک لسٹ'' میں تفصیل سے ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

کسی اور ملک میں ایسی نوبت نہیں آئی، تلاشی وغیرہ تو اب ہر جگہ ہوتی ہے اس پر بھی ایک نظم ''نامعلوم کی دہلیز پر'' کہہ چکا ہوں۔ ٹرانزٹ سیل میں لکھی گئی غزل اور نظمیں، ''چہرہ چہرہ مری کہانی'' کے نئے ایڈیشن میں شامل ہیں۔

☆ دنیا بھر کے لوگوں کے دکھ دُور کرنے کا طلب گار اپنے لوگوں پر ہونے والے ظلم جبر پر ایک عرصہ خاموش کیوں رہا؟

☆☆ میرا خیال ہے کہ میں خاموش تو کبھی نہیں رہا۔ جب سنسر تھا چیزیں چھپنے نہیں دی جاتی تھیں اس وقت بھی اشاروں کنایوں میں لکھا۔ نظمیں لکھتے رہے، غزلیں ہوتی رہیں۔ سب مختلف کتابوں میں موجود ہیں۔ 1958 سے لے کر تا حال، کبھی بھی کوئی عرصہ نہیں ہے جب ظلم و جبر پر کچھ لکھا اور کہا نہیں ہے، معلوم نہیں آپ کو یہ خیال کیسے آیا؟

☆ ''عروس البلاد'' کی زبوں حالی پر آپ نے اپنی منظومات کے اندر بین السطور بہت کچھ کہنے کی کوشش کی ہے مگر نثری پیرائے میں اس شہرِ بدنصیب کے بگڑتے نصیب اور اُس کے ذمہ داروں کی نسبت دیگر اہل قلم کی طرح آپ کے ہاں بھی خاموشی پائی جاتی ہے حالانکہ وقت کی ضرورت یہ ہے کہ قومی اور بین الاقوامی راکھشسوں کے ساتھ مقامی راکھشسوں کو بھی للکارا جائے؟

☆☆ کراچی وہ شہر ہے جس نے مجھے بہت کچھ دیا، عزت، شہرت، دولت، رابطے، تجربے 1990 سے 1997 تک کا عرصہ تو بہت ہی خون آلود رہا۔ دفتر سے واپس جاتے تو ایک سناٹا ہر قدم ملتا تھا۔ بہت نظمیں، غزلیں لکھیں، تجزیئے لکھے، یہ بھی کچھ غلط فہمی ہے۔ یہ تو شہر قائد کے رہنے والے ظالم، مظلوم سب جانتے ہیں کہ ہم نے بہت کچھ لکھا۔ بین الاقوامی راکھشوں کے ساتھ مقامی راکھشوں کو بھی للکارا۔ دھمکیاں بھی ملیں۔

☆ ریاست کی فعالیت کا ذکر آپ ایسے زمانے میں کر رہے ہیں جب دنیا بھر میں گلوبلائزیشن کی ہوائیں چل رہی ہیں اور ریاستیں اپنی ساکھ سے محروم ہوتی جارہی ہیں؟

☆☆ عالمگیریت، گلوبلائزیشن کا دور ہے سرحدوں کے بغیر مملکتیں، ایک حسین تصور ہے جو اسلام کے زیادہ نزدیک ہے اور وہ جو اقبال نے کہا۔ ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست لیکن یہ ان مملکتوں کیلئے قابل عمل ہے جو مملکت کے تمام قواعد وضوابط اور حدود و قیود کی پابندی کرتے ہوئے اپنے باشندوں کو پورے حقوق دے چکی ہیں۔ ساری بنیادی سہولتیں فراہم کر چکی ہیں اگر وہ ایک کامیاب کامران، مضبوط معیشت والی مملکت کی حیثیت سے اپنی سرحدیں غیر متعلق کر دیتی ہیں جس کا تجربہ آپ کو یورپی یونین میں ہوتا ہے، وہاں تو یہ مناسب ہے۔ ان کیلئے عالمی تجارتی تنظیم بھی موزوں ہے لیکن پاکستان بھارت، نیپال، افغانستان جیسی مملکتیں جہاں فرد بنیادی حقوق اور ابتدائی سہولتوں سے محروم ہے۔ وہاں مملکت کو اپنی ذمہ داریوں سے دستکش نہیں ہونا چاہئے۔

☆ کچھ لوگ آپ کو غیر جانبدار صحافی گردانتے ہیں، تیسری دنیا بلخصوص پاکستان میں یہ ممکن ہے کیا؟

☆☆ میں نے کسی حد تک کوشش کی ہے کہ حکومت اپوزیشن مختلف سیاسی جماعتوں، مذہبی تنظیموں، طالب علم تنظیموں کے ساتھ غیر جانبدار رہ سکوں۔ میرے دل میں ہر سیاسی لیڈر کا احترام ہے، تمام علمائے دین کی عزت ہے کبھی اپنی تحریر یا عمل سے کسی بھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ پھر پاکستان کے سب سے کثیر الاشاعت اخبار کے ایڈیٹر ہونے کے حوالے سے بھی پیشہ ورانہ طور پر یہ ضروری سمجھا کہ مجھے کسی بھی پارٹی یا نظریئے کا جانبدار نہیں ہونا چاہئے ورنہ دوسرے مجھ سے پھر یہ توقع نہیں رکھیں گے کہ میں ان کی خبروں، رپورٹوں میں توازن رکھ سکوں گا۔ پھر مجھے یہ خیال بھی ہمیشہ دامن گیر رہا کہ جس شخص کے ساتھ کچھ پیروکار ہیں جو اس کی دل سے عزت کرتے ہیں مجھے بھی اس کا احترام کرنا چاہئے اس لئے میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو، شیخ مجیب الرحمٰن، مولانا عبدالحمید خان بھاشانی، خان عبدالقیوم خان، چوہدری محمد علی، مولانا فرید احمد، مولانا مفتی محمود، پروفیسر غلام اعظم، فضل القادر چوہدری، مسیح الرحمان، جناب عطاء الرحمٰن، ایئر مارشل (ر) اصغر خان، ایئر مارشل نور خان، مولانا شاہ احمد نورانی، خان عبدالولی خان، چوہدری ظہور الٰہی، جی ایم سید، عبدالصمد اچکزئی، نواب محمد اکبر بگٹی، خان آف قلات، قاضی حسین احمد، جناب منور حسن سب سے نیاز مندانہ تعلقات رہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو سے تو طویل صحافیانہ رفاقت رہی۔ میاں محمد نواز شریف سے ملاقات بہت کم رہی لیکن انہیں بھی کہیں شکایت کا موقع نہیں ملا، چوہدری شجاعت حسین، چوہدری پرویز الٰہی، جنرل پرویز مشرف، جناب شوکت عزیز سب سے متوازن تعلق خاطر رہا۔ کسی سے جانبداری نہیں، جانبداری صرف مملکت سے، یہ مشکل تجربہ ہے۔

☆ ایک حلقہ آپ کو پیپلز پارٹی کا حامی اور دوسرا اندر خانے میاں برادران سے انڈر اسٹینڈنگ کا ذکر کرتا ہے جس کے ثبوت میں ''جنگ'' اور میاں صاحب کی لڑائی کے دوران آپ بہ آسانی اپنے اخبار کے حصے کا کاغذ لینے میں کامیاب ہوجاتے ہیں؟

☆☆ پاکستان پیپلز پارٹی کی بھی حمایت کا تاثر پیدا ہونا اپنی جگہ ایک جواز رکھتا ہے 1970ء سے اب تک اس کے کئی منظر نامے مل سکتے ہیں لیکن میاں

برادران سے انڈراسٹینڈنگ کا شبہ بے بنیاد ہے ان کے مکمل احترام کے باوجود میرا ان سے کوئی منفی یا مثبت رابطہ یا وابستگی نہیں رہی۔ یہ جو اخبار کے حصے کے کاغذ کا مسئلہ ہے اس میں میاں صاحب کا کوئی کرم شامل نہیں تھا بلکہ یہ جنگ کا اپنا کاغذ تھا، کسٹم والوں کو ڈیوٹی کی ادائیگی کر کے اٹھایا جاتا تھا۔ حکومت کے احکامات کی روشنی میں کسٹم افسر ادائیگی کے باوجود نیوز پرنٹ لے جانے نہیں دے رہے تھے ہم نے عوامی دباؤ استعمال کیا ''جنگ'' کے کارکن بڑی تعداد میں تھے دوسری طرف کراچی پورٹ ٹرسٹ کی یونین کے عہدیداروں نے ساتھ دیا۔ ٹرالر پر جنگ کی کاغذی ریلیں لدی ہوئی تھیں اسے اپنی قیادت میں نکلوا کر لے چلے۔ پورٹ کے پھاٹک اتنی بڑی تعداد میں ورکرز دیکھ کر پھر کے پی ٹی یونین کے عہدیداروں کے حکم پر کھل گئے اتنی سی بات تھی بے چارے میاں صاحبان کو تو پتہ بھی بعد میں چلا۔

☆ اردو صحافت کے چار بڑوں میں آپ کو سرِ فہرست گردانے والے کس قدر درست ہیں اور ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟

☆☆ یہ میرے علم میں نہیں ہے کہ اردو صحافت میں چار بڑے کون ہیں اور میرا ان میں شمار کس مقام پر ہے، مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہے یہ ضرور ہے کہ میں 1960ء سے کسی نہ کسی طرح عملی صحافت سے وابستہ ہوں۔ نصف صدی میں ایک سال رہ گیا ہے کوشش کی ہے کہ کسی قدر سچ بول سکوں۔ ایمانداری، دیانتداری سے ذمہ داری پوری کردی۔ ٹیکنالوجی کے حوالے سے اردو صحافت میں لیتھو طباعت سے اب کمپیوٹر کی صفحہ بندی تک سارے مراحل سے گزرا ہوں۔ ایوب خان کے مارشل لاء سے آج تک پاکستان کی تاریخ میں جتنے اہم ڈرامائی موڑ آئے ہیں اس کی رپورٹنگ، تجزیئے کئے ہیں تاریخ ہمیں کہاں جگہ دے گی یہ تو آنے والی نسلوں کو ہی معلوم ہوگا۔

☆ آپ کو بے شمار قومی اور بین الاقوامی راہنماؤں کے انٹرویوز کا موقع میسر رہا ہے۔ کن کی شخصیت اور خیالات نے آپ کو زیادہ متاثر کیا؟

☆☆ صحافت کا ایک دلکش پہلو بھی ہے کہ آپ کو ان شخصیتوں کے قریب جانے، گفتگو کرنے کا موقع مل جاتا ہے جو دنیا کی تاریخ بگاڑنے یا سنوارنے میں کلیدی کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں چواین لائی وزیراعظم چین، ذوالفقار علی بھٹو، صدر اور وزیراعظم پاکستان، اندرا گاندھی، وزیراعظم بھارت، اٹل بہاری واجپائی وزیراعظم بھارت، جناب یاسر عرفات سربراہ فلسطین، عبدالحمید خان بھاشانی صدر نیشنل عوامی پارٹی۔ ذوالفقار علی بھٹو شہید سے تو ایک ذہنی ہم آہنگی بھی تھی ان کے خیالات و افکار میں تو ہم اپنے خیالات کا عکس ہی دیکھتے تھے۔ اندرا گاندھی کی کم سخنی نے ہمیں متاثر کیا، ہمارے سوالات طویل ہو جاتے تھے، ان کا جواب نپا تلا، مختصر، یاسر عرفات کے ہاں قربانی، ایثار، جدوجہد اور چواین لائی کی سادگی، گہرائی، فکر نے بہت متاثر کیا۔

☆ پوری دنیا کی سیاحت کے بعد سوئیزرلینڈ کی ثقافت پسند آنے کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ سوئٹزرلینڈ میں شخصیت پرستی نہیں ہے، بادشاہت نہیں رہی، کوئی ہیرو نہیں ہے سب اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ 800/سال سے جمہوریت چلی آرہی ہے مقامی حکومتیں بھی بہت مضبوط ہیں جنگوں میں سوئزرلینڈ ہمیشہ غیر جانبدار رہا، شرح خواندگی 100/فیصد، زرمبادلہ کے ذخائر آئندہ 200/سال کے لئے کافی، اسمبلی میں سے 7/وزراء لئے جاتے ہیں ان میں سے ہی چار باری باری ملک کے صدر بنتے ہیں یہی باری صوبوں اور مقامی حکومتوں میں چلتی ہے۔

☆ محمود شام صاحب! ایمانداری سے بتلایئے کہ آپ کی صحافیانہ شہرت و ناموری آپ کے تخلیقی سفر میں کس قدر معاون و مفید رہی؟

☆☆ پہلے تو یہ گمان غالب رہتا تھا کہ صحافت، تخلیقی رجحان کو متاثر کردیتی ہے لیکن اب جب گزشتہ نصف صدی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میری تخلیقی صلاحیتوں، انفرادیت کی تلاش اور شاعری نے صحافت میں اپنے الگ لہجے اور اسلوب میں مدد دی۔ ہماری صحافتی تحریروں میں بھی زبان کی چاشنی رہی الفاظ کے انتخاب میں ادبی پس منظر نے ہی تحریک دی۔ اخبار نویسی کی بدولت اپنے عہد کی سچائیوں، تاریکیوں، منافقتوں، مصلحتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ قریباً تمام اہم ممالک کی سیاحت کا اتفاق بھی صحافت کی بدولت ہی حاصل ہوا اس سے ذہنی آفاق میں وسعت بھی ہوئی اور روشنی بھی نصیب ہوئی لیکن صحافیانہ شہرت اور ناموری کو ادبی حلقوں میں کبھی اپنی بیساکھی نہیں بننے دیا بلکہ ایک اصول کے تحت اخبار کو اپنی ادبی کاوشوں کی تشہیر کے لئے استعمال نہیں کیا۔

☆ اپنے آپ کو کھوجنے کا سفر آج کل کس مرحلے میں ہے؟

☆☆ یہ تلاش تو اب زیادہ شدت سے جاری ہے آپ کے مرتب کردہ سوالات نے بھی مجھے اپنے آپ کو جاننے میں بہت مدد دی ہے۔ مجھے خود اپنی ذات کے ایسے بہت سے گوشوں میں جھانکنے کا موقع ملا ہے جو اب تک مجھ سے اوجھل تھے۔

کہاں ہو کیوں ہو ہر اک سانس پوچھتی ہے مجھے
کبھی میں اپنے سوالوں میں یوں گھرا بھی نہ تھا

مشرقی اور مغربی پاکستان کے رہنماؤں کے انٹرویوز کو جب میں نے دوبارہ ''روبرو'' میں ترتیب دیا تو شروع میں ایک اظہاریہ ''پیاس تیس سال کی'' لکھا جس میں یہی جستجو تھی۔

میں کون ہوں۔ کیوں ہو۔ کہاں ہوں۔ میں راجپورے سے اسی کھوج میں نکلا تھا۔ کھلی چھت کی مال گاڑی میں بھی اپنے آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ لاہور۔ گجرات، منڈی بہاء الدین، جھنگ، پھر لاہور، کراچی پھر ریاض، استنبول،

قاہرہ، طرابلس، دمشق، بغداد، لندن، کوپن ہیگن، اسٹاک ہوم، واشنگٹن، ٹورنٹو، بیجنگ، پیرس، برسلز، بنکاک، نوم پن لاؤس، دہلی، ڈھاکہ، کہاں کہاں نہیں خاک چھانی۔ اور کبھی کوئی جھلک دیکھنے کو ملتی تو اپنی خلوت میں یا کسی آستانہ پر قصور میں بھی بلھے شاہ کے حضور اپنے آپ کو ڈھونڈنے گیا۔ داتا صاحب کے ہاں بھی حاضری دی۔ اجمیر شریف، نظام الدین اولیا، شورکوٹ میں سلطان باہو کے دربار میں۔

☆ حال ہی میں آپ نے پرائیڈ آف پرفارمنس سے انکار کر کے بہت سوں کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا اور کچھ کو یہ کہنے کا موقع فراہم کر دیا کہ آپ اس سے بڑے ایوارڈ کے خواہش مند ہیں؟

☆☆ مجھے کسی بھی چھوٹے بڑے ایوارڈ کی تمنا نہیں رہی۔ شاید اسی لیے کہ صحافی کی حیثیت سے اچھی طرح جانتا ہوں کہ ایوارڈ کس کس طرح حاصل کیے جاتے ہیں۔ شروع سے یہ خیال رہا کہ کسی بھی مطلوبہ مقصد کا حصول ہے۔ کاوش کا اصل صلہ اور عام لوگ اس کی داد دیں۔ جیسے پاک فضائیہ کے لئے اپنا نغمہ ایک سائیکل سوار کو گاتے دیکھا تو اسے میں نے ستارہ امتیاز جانا۔ چترال میں ایک عام سا نوجوان ملا۔ اس نے معیار میں میری ایک برسوں پرانی تحریر کا حوالہ دیا۔ مجھے یہ تمغہ حسن کارکردگی لگا۔ میں نے کبھی اپنی کوئی کتاب ادبی ایوارڈز کے سلسلے میں ارسال نہیں کی۔ حالانکہ رائٹرز گلڈ والے یقینی ایوارڈز کا وعدہ کرتے تھے۔ پہلے بھی کئی ادوار میں جناب ذوالفقار علی بھٹو، محترمہ بے نظیر بھٹو پھر جنرل پرویز مشرف کے دور میں ایوارڈز کی پیشکش ہوئی۔ میں نے اپنے اصول سے آگاہ کیا۔ اور معذرت کی۔ اس لئے اعلانیہ انکار کا مرحلہ نہیں آیا۔ جس سے فریقین کے لئے بدمزگی ہو اب کے نہ جانے کیا ہوا۔ 14 اگست کی رات کو ٹی وی چینلوں پر پٹی چلی۔ دوستوں نے فون کر کے مبارکباد دی تو میں بہت زیادہ پریشان ہوا کہ کسی نے مجھ سے بات ہی نہیں کی۔ نہ میں نے کوئی کوشش کی۔ یہ ازخود اعلان کیسے ہو گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کونسا ایوارڈ ہے۔ بڑا چھوٹا میں نے انکار کی خبر اسی دلیل کے ساتھ دی کہ میں نے کبھی کوئی ایوارڈ نہیں لیا۔ اس لئے میں خود کو اس کا بھی مستحق نہیں سمجھتا۔ مجھے کسی قسم کا ایوارڈ نہیں چاہئے۔

☆ آج کل اقتدار کے ایوانوں میں یہ آیا اور وہ گیا کی افواہیں تواتر سے گردش کر رہی ہیں کیا بنگلہ دیش کی طرز پر کوئی عارضی انتظام کا ڈول تو نہیں ڈالا جا رہا؟

☆☆ اقتدار کے ایوان تو مستقل ہیں۔ یہاں قیام کرنے والے آتے جاتے رہتے ہیں۔ پاکستان میں نام کی جمہوریت ہے۔ ایک فرد ایک ووٹ کا اصول بھی ایک تہمت ہے۔ کیونکہ مقتدر ایوانوں میں لائے جانے اور رخصت کئے جانے کے فیصلے ووٹ سے نہیں ہوتے ہیں۔ ہماری غیر جمہوری اور غیر سیاسی قوتیں اپنے زعم میں طے کرتی ہیں کہ کس قسم کا نظام بہتر رہے گا۔ بار بار کے تجربے ملک کو کمزور کر رہے ہیں۔ قوم میں بداعتمادی، شکوک وشبہات پیدا کر رہے ہیں۔ ہر قسم کے قدرتی معدنی، بے مثال افرادی قوت، آٹھ ہزار سالہ ثقافتی تمدنی پس منظر رکھنے والا ملک ناکام ریاست کہلا رہا ہے۔ غیر جمہوری قوتوں کی بوئی ہوئی خونی فصلیں سوات، فاٹا میں کاٹی جا رہی ہیں۔ یہ ناگ ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی انسانیت کو ڈس رہے ہیں اس لئے اب غیر سیاسی قوتیں اپنے پیشہ ورانہ فرائض کو ہی صحیح طریقے سے انجام دے لیں۔ تو ملک ایک کامیاب ریاست بن جائے گا۔ سیاسی جماعتوں کو اپنے اندر جمہوریت لانا ہوگی۔ عہدے تجربے اور میرٹ کی بنیاد پر ملیں موروثی حوالے سے نہیں۔

☆ آپ کے ہاں قومی اور بین الاقوامی حالات کی گونج ہمیشہ سے نمایاں رہی ہے مگر گذشتہ کچھ دنوں سے آپ اور آپ کا قلم زیادہ ہی بے باکی کا مظاہر کر رہے ہیں؟

☆☆ اپنے آس پاس یہ ہمیشہ نظر رہی ہے۔ اردگرد بہنے والا خون شعری تجربے میں ڈھلتا رہا ہے۔ میرا عہد مجھ میں اور میں اپنے عہد میں ڈھلتا رہتا ہوں۔ کبھی میں تاریخ میں اور تاریخ کبھی مجھ میں داخل ہوتی رہتی ہے۔ قومی اور بین الاقوامی حادثات، سانحات انسانیت کو جس طرح زخم زخم کرتے ہیں۔ وہ میری نظموں کا ہمیشہ موضوع بنتے رہے ہیں لیکن اب میں ایک کثیر الاشاعت روزنامے میں ہوں۔ اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ عالمی اور ملکی سانحوں پر ہم وطنوں کے ضمیر پر دستک دوں۔ اسی روز بہت سے معاملات پر اشعار ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ایک مقبول روزنامے میں فوری چھپ بھی جاتے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ احساس ہو کہ قلم زیادہ بے باک ہو گیا ہے۔ یہ بھی ہے کہ اب جتنی آزادی ہے اور حکمرانوں میں ماحول میں جتنی برداشت ہے۔ سننے کا حوصلہ ہے۔ پہلے نہیں تھا۔

☆ اس جرأت اور بے باکی کا سرا مستقبل کی کسی مہم جوئی سے بھی جوڑا جا سکتا ہے جس میں آپ کی شرکت کا یقین یا گمان ہو؟

☆☆ میرے خیال میں یہ اندیشہ درست نہیں ہے کہ میں مستقبل میں کسی مہم جوئی میں شرکت کرنا چاہونگا۔ پہلے ایسے مواقع بہت آتے ہیں لیکن یہ کبھی سوچا ہی نہیں کہ سرکار سے کسی طور وابستگی ہو۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ حکومت کے کسی محکمے میں شامل ہو کر میں ملک یا انسانیت کی خدمت نہیں کر سکتا۔ وہاں سوچنے اور کچھ کرنے کی آزادی نہیں ہوتی ہے۔ ایک سوچنے اور لکھنے والے کو کسی ڈسپلن کا پابند نہیں ہونا چاہئے۔ اب تو ویسے بھی عمر کا یہ آخری حصہ ہے۔ کسی بھی حکومتی سیٹ اپ میں جا کر اپنی عاقبت کو خراب کیوں کریں۔

☆ ہمیشہ سے لاکھوں کروڑوں پاکستانیوں کی طرح آپ کے ہاں بھی ایک قوم بننے کی خواہش شدت سے پائی جاتی ہے۔ مستقبل قریب وبعید میں اس خواہش کی تکمیل کے کس قدر امکانات ہیں؟

☆☆ پاکستان قائم کر کے ہم نے ایک بڑا چیلنج قبول کیا تھا۔ پانچ سے آٹھ ہزار سالہ ثقافتی تمدنی پس منظر رکھنے والی سرزمین میں بعض مختلف لسانی اور نسلی

وحدتوں کو ایک قوم میں سمونا آسان کام نہیں تھا اور نہ ہے۔ پھر ایسی سنجیدہ کوششیں بھی تسلسل سے نہیں کی گئیں۔ کبھی جمہوریت کبھی مارشل لائی، مداخلتیں بہت ہوئیں۔ کوئی نظام بھی روانی سے نہیں چل سکا اس لئے لسانی، صوبائی، علاقائی، نسلی، فرقہ وارانہ اختلافات زیادہ سر اٹھاتے رہے ہیں۔ ایک پاکستانی ہونے کے ناطے حقوق نہیں مل سکے۔ میرٹ کی پاسداری نہیں کی گئی۔ قانون کا یکساں اطلاق نہیں ہوا ہے۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو کے بعد کوئی ایسا قومی لیڈر نہیں آیا۔ جسے پورے پاکستان میں چاروں صوبوں میں سب زبانیں بولنے والوں میں ایک سی مقبولیت حاصل ہو۔ ایک قوم بنانے کے لئے اس طرح کی ذہین، مدبر اور مقبول قومی شخصیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اب ایسی کوئی قیادت نہیں ہے اس لئے اب امیدیں کمزور پڑ رہی ہیں۔ ایک قوم کا احساس پختہ نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ ذیلی قوم پرستی زیادہ جڑ پکڑ رہی ہے۔ پہلے تو صرف پنجابی، سندھی، پٹھان اور بلوچ کا حوالہ تھا اب مہاجر شناخت بھی غالب ہوگئی ہے۔ سرائیکی حوالہ بھی نمایاں ہوگیا ہے۔ پھر مذہبی حوالہ بھی اپنا غلبہ جمارہا ہے۔ فرقہ وارانہ وابستگی بھی اپنا رسوخ بڑھا رہی ہے۔ یہی حوالے جب ان مسائل کے حل میں زیادہ نتیجہ خیز رہتے ہوں۔ جو ایک شہری ہونے کے ناتے ہی طے ہو جانے چاہئیں۔ تو یہ فطری امر ہے کہ پھر شہری ایسی کسی شناخت کو اپنے پاکستانی ہونے کے حوالے پر ترجیح دیں گے۔ بے چارے صدر پرویز مشرف نے بجا طور پر سب سے پہلے پاکستان، کا نعرہ بلند کیا۔ تو دائیں بائیں بازو سب نے ہی اس کی زبردست مخالفت کی۔ یہ کیسی قوم ہے۔ جو اپنے آپ کو ترجیح دینا بھی پسند نہیں کرتی۔ حالانکہ دنیا بھر میں آپ کی پہچان یہی ہے۔ سبز پاسپورٹ ہی آپ کی نشانی ہے۔ دنیا بھر میں آپ کو پاکستانی ہی سمجھا جاتا ہے۔ دشمن آپ کے پاکستانی کی بجائے سندھی، پنجابی، بلوچی، پشتون، سرائیکی، مہاجر میں تقسیم سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور آپ بھی ان حوالوں سے تو صرف پریشر گروپ بنا رہے ہیں۔ ایک ریاست کو کامیاب نہیں بنا رہے ہیں۔

☆ دو دو سورج گرہن اور چاند گرہن کے علاوہ ماہ اگست میں پانچ ہفتے اور پانچ اتوار ایک مدت کے بعد آئے ہیں جن کو ماہرین فلکیات کسی بڑی اٹھک پٹک سے منسوب کر رہے ہیں۔ بطور ایک دانشور اور صحافی آپ اپنے خطے میں کس قسم کی تبدیلیاں دیکھ رہے ہیں؟

☆☆ میں علم نجوم سے بے خبر ہوں لیکن یہ احساس ہے کہ ستارے آپ کی اور ملکوں کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ماہرین فلکیات ہی پیش گوئی کر سکتے ہیں کہ کیا ہونے والا ہے۔ میرا ایمان تو یہ ہے کہ نتیجہ ان کوششوں کا نکلتا ہے۔ جو کی جاتی ہیں۔ خواہشیں کبھی کسی عملی صورت میں بغیر کوشش کے نہیں ڈھل سکتیں۔ ہم اگر کچھ نہیں کر رہے تو یہ نہیں ہے کہ زمانہ بھی کچھ نہیں کر رہا۔ پہلے جو استعماری قوتیں ہمارے خطوں پر عملاً راج کر کے اپنے ہوس اقتدار کی تسکین کرتی تھیں۔ اب بھی دنیا بھر میں ان کے مفادات اور دلچسپیاں ہیں۔ اس لئے ان کے تحفظ کے لئے وہ منصوبے بناتی رہتی ہیں۔ واشنگٹن صرف امریکا کا نہیں پوری دنیا کا دارالحکومت ہے۔ امریکا اب واحد سپر پاور ہے۔ اس کے مفادات پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ فوجیں کسی نہ کسی مقصد کے لئے کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔ وہ اپنی سرزمین کو کسی بھی جنگ سے دور رکھ کر اسے امن اور ترقی کا مستقل گہوارہ رکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے ہر خطے کے بارے میں اس کے تھنک ٹینک بیس سے پچیس سالہ منصوبے بنا کر دیتے رہتے ہیں۔ ہمارے پڑوس میں تو اس کے کئی ہزار فوجی بیٹھے ہیں اس لئے ہمارے خطے کے بارے میں سنجیدگی سے پلاننگ کر رہا ہے۔ موجودہ صورتحال، انتظام اور نقشہ اس کے حق میں نہیں ہے۔ وہ تمام تر کوشش کے باوجود مطمئن نہیں ہے۔ اس لئے وہ اپنی مرضی کی تبدیلیاں لانے کا خواہشمند ہے۔ اس لئے نئے نقشے بنا رہا ہے۔ ہم چاہے اس سے نفرت کرتے ہوں۔ یا اس کی حمایت۔ ہم اس کے ہاتھوں میں کھیلتے ہیں۔ اور بالآخر وہی ہو جاتا ہے جو کئی برس پہلے امریکا نے سوچا ہوتا ہے۔ ہم بحیثیت قوم متحد نہیں ہیں۔ پھر اسلامی ملکوں میں کوئی اتحاد نہیں ہے۔ تیسری دنیا کو قریب لانے والی قیادتیں نہیں ہیں۔ اس لئے تبدیلیاں امریکا اور یورپی یونین کی کوششوں سے رونما ہونگی۔ جس کے لئے بہت زیادہ سرمایہ کاری ہو رہی ہے۔ ہمارے ریگستانوں، پہاڑوں میں چھپے قدرتی وسائل، گیس، تیل، تانبا، سونا، سمندروں میں موجود تیل کے ذخائر، سمندری مخلوق، ہماری منتظر ہیں۔ ہم انہیں دریافت نہیں کر پائے۔ یہ نہ صرف ہماری ضرورت پوری کرتے اور ہم دنیا بھر کی احتیاج پوری کر سکتے تھے۔ عالمی طاقتیں تو ہماری طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھی رہیں گی ان کو توانائی کی ضرورت پوری کرنے کے لئے تیل گیس چاہیے۔ خوراک کی قلت ختم کرنے کے لئے زرعی زمینیں درکار ہیں۔ انہیں جہاں جہاں یہ وسائل نظر آتے ہیں۔ وہ وہاں خود پہنچیں گی یا اپنے نمائندے بھیج کر ان وسائل کو اپنی دسترس میں رکھنا چاہیں گی۔ ان کے پاس توانائی کے وسائل، تیل کے ذخیرے ختم ہو رہے ہیں اس لئے وہ جلدی میں ہیں۔

☆ آج کل آپ کی تحاریر کا اختتام اکثر وقت کی قلت کی جانب توجہ دلانے پر ہوا کرتا ہے۔ کس قسم کے خدشات آپ کے خیال میں ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں اور کس طرح اُن سے نبرد آزما ہوا جا سکتا ہے؟

☆☆ تاریخی تناظر میں بھی وقت کم لگتا ہے۔ پھر سوچنے والا محسوس کرنے والا اپنی عمر کے مراحل کے حوالے سے بھی وقت کم رہ جانے کے خوف میں مبتلا ہوتا ہے۔ قومی سطح پر کوئی مدبرانہ قیادت نہیں ہے۔ قانون کا اطلاق سب جگہ، سب لوگوں کے لئے یکساں نہیں ہے۔ قومی قدرتی وسائل کو دریافت نہیں کیا جا رہا ہے۔

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

اللہ نہ کرے۔ اللہ نہ کرے۔ اللہ نہ کرے۔ میرے خدشات درست ثابت ہوں۔

''پہلی جیل یاترا''

(۱۹۸۰ء کی ایک غیر مطبوعہ تحریر)

محمود شام

ایف آئی اے والے کسی کام سے میری خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔

انہوں نے فون پر پوچھا ہے کہ میں گھر پر ہوں۔

میں نے کہا بھی ہے کہ آج تو چھٹی کا دن ہے۔کل پر رکھ لیں۔

ان کا کہنا ہے کہ کام بہت ضروری ہے۔اس لیے وہ گھر پر ہی ملنے آ رہے ہیں۔

میں اپنی اہم حیثیت پر خوش ہو رہا ہوں کہ ایف آئی والوں کو مجھ سے کام پڑ گیا ہے۔

پھر وہ جب پہنچتے ہیں۔تو ہمارے گھر والے انہیں ہمارے اسلام آباد سے آنے والا دوست سمجھ بیٹھتے ہیں۔کیونکہ نام ایک جیسا ہے۔مشابہتیں اکثر فریب دے جاتی ہیں۔گھر والے ان کو اندر لے آئے ہیں۔کسی خاندانی خوشی میں ہم سب مٹھائی کھا رہے ہیں۔ایف آئی اے والوں کو بھی مٹھائی پیش کر دی گئی۔

اب ان کے افسر کہہ رہے ہیں کہ ان کے ایک سینئر آفیسر اسلام آباد سے آئے ہوئے ہیں۔وہ ایف آئی اے کے دفتر میں ہم سے ضروری میٹنگ کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا بھی ہے کہ اگلے روز کیوں نہ کر لیں۔

ان کا اصرار ہے کہ آج ہی ضروری ہے۔

میں اپنی گاڑی لے کر چلنا چاہتا ہوں۔وہ کہتے ہیں کہ اس کی کیا ضرورت ہے،ہم آپ کو واپس چھوڑ دیں گے۔

میں بہت متاثر ہو رہا ہوں کہ اسلام آباد سے آنے والا افسر خاص طور پر مجھ سے میٹنگ کرنا چاہتا ہے۔کتنا اہم ہو گیا ہوں میں۔

گھر والے بھی مجھے وی آئی پی سمجھ کر رخصت کر رہے ہیں۔

گلشن اقبال۔شہر کے ایک کونے پر۔ایف آئی اے کا کوئنز روڈ کا دفتر دوسرے کونے پر۔راستے بھر میں دنیا جہاں کی باتیں ہوتی ہیں۔سیاست۔مارشل لا،ہفت روزہ 'معیار'۔آزادیٔ صحافت۔بھٹو صاحب کی گفتاری ہم کوئنز روڈ پر ایف آئی اے کے کراچی ہیڈ کوارٹرز میں پہنچ گئے ہیں۔

یہاں ہفت روزہ ''معیار'' کی ایک رپورٹ کے بارے میں بات چیت ہو رہی ہے۔جس میں پیپلز پارٹی کی برطرف کی جانے والی حکومت کے دور میں بعض شخصیات کے بیرون ملک سفر جانے پر عائد کی جانے والی پابندی کی تفصیلات دی گئی تھیں۔یہ فہرست کیوں شائع کی گئی۔کیسے ملی۔

اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ معاملہ کچھ اور ہے۔کسی افسر سے میٹنگ نہیں ہے۔یہ تو مجھے بہانے سے یہاں لایا گیا ہے۔اور بغیر کسی وارنٹ کے لایا گیا ہے۔

میں ان سے پوچھ رہا ہوں کہ کیا میں زیر حراست ہوں۔

وہ اس سے نہ انکار کر رہے ہیں۔اور نہ ہی اقرار کر رہے ہیں۔

انسپکٹر فاروق لودھی کو میں بہت پہلے سے جانتا ہوں۔انہیں لکھنے لکھانے کا شوق بھی ہے۔لیکن پولیس والا تو پولیس والا ہی ہوتا ہے۔اور اسے تو صرف اوپر کا حکم چاہیے۔پھر وہ تمام حیلے بہانے خود تراش لیتا ہے۔

پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔

یہ فہرست کیسے ملی۔

یہ تو آفیشل سیکرٹ دستاویز تھی۔

اسے چھاپنے کی جرأت کیسے کی گئی۔

ملی کیسے۔یہ دستاویز ہاتھ کیسے لگی۔

میں کہہ رہا ہوں کہ ایک ایڈیٹر کی حیثیت سے میں یہ بتانے کا پابند نہیں ہوں۔اپنے ذریعے (Source) کا تحفظ تو میں عدالت میں بھی کروں گا۔

وہ بار بار پوچھ رہے ہیں۔اور ساتھ والے کمرے میں جا کر کسی سے فون پر بات بھی کر رہے ہیں۔

مجھے نماز جمعہ کے بعد لایا گیا تھا۔اب دھوپ دم توڑ رہی ہے۔کھڑکی میں سے سورج کی آخری زرد زرد کرنیں باہر کی دنیا سے میرا رشتہ جوڑ رہی ہیں۔اب تھوڑی دیر میں اندھیرا پھیل جائے گا۔اندھیرا تو ویسے بھی پھیلا ہوا ہے۔مارشل لاء ایک اندھیرا ہی ہے۔جو سب اجالے نگل لیتا ہے۔تحریر کی آزادی۔تقریر کی آزادی۔بنیادی حقوق سب تیرگی کی نذر ہو چکے ہیں۔

یہ فہرست آپ کو کہاں سے ملی۔کس نے دی؟

ایک ہی سوال ہے جو دن کی روشنی میں کیا جانا شروع ہوا تھا۔اور اب شام کے سائے بھی گہرے ہو رہے ہیں پھر بھی وہی سوال ہے۔

ان بے چاروں کی بھی عجیب زندگی ہے۔

جو اوپر سے کہا جاتا ہے۔صرف اتنا ہی جاننا چاہتے ہیں۔اس سے زیادہ جاننا ہی نہیں چاہتے۔زیادہ جاننے سے ڈر لگتا ہے۔خود بھی زیادہ نہیں جاننا چاہتے۔عام لوگوں کو بھی زیادہ جاننے نہیں دیتے۔زیادہ جاننا بہت خطرناک ہے۔زیادہ جان جائیں۔پھر کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے۔کچھ کریں گے تو جو کچھ نہیں کرتے۔وہ بے نقاب ہو جائیں گے۔وہ اکیلے رہ جائیں گے۔وہ پہچان لیے جائیں گے۔حالانکہ ان کا دعویٰ ہے کہ سب کچھ وہی کرتے ہیں۔

اندھیرا بہت گہرا ہو گیا ہے۔

ایف آئی اے کے ہیڈ کوارٹر میں اب خاموشی پھیل رہی ہے۔

صبح سے جوڑ توڑ کرنے والے لاکھوں کا ''مک مکا'' کرنے والے اب جا چکے ہیں۔ دن میں کمانے کا وقت تھا۔ اب رات لٹانے کے لیے ہے۔

یہ جو مجھ سے پوچھ پوچھ کر تنگ آ گئے ہیں۔

ان کو بھی کہیں جانا ہو گا۔

اب وہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے ہفت روزہ ''معیار'' کے شمارے مورخہ 31 جولائی 1977ء میں یہ فہرست شائع کر کے آفیشل سیکرٹ ایکٹ کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس لیے مجھے اس سنگین جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔

آج 4 اگست 1977ء ہے۔

آج سے ٹھیک ایک ماہ پہلے 5 جولائی کو پاکستان پر دوبارہ اندھیر مسلط ہوا تھا۔ نئے پاکستان کا پہلا مارشل لاء۔

آفیشل سیکرٹ ایکٹ میں گرفتاری۔

میں پہلے تو کچھ کانپا ہوں۔ سیکرٹ ایکٹ۔ سرکاری راز افشا کرنے کا جرم۔ جس میں مدت کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔ چودہ سال قید بھی۔ کم از کم دس سال بھی۔ اب میں کچھ نہیں لکھ سکوں گا۔ میری آزادی ختم ہو گئی ہے۔ میں اپنے گھر والوں سے۔ دوستوں سے شاید کبھی نہ مل سکوں۔

لیکن کوئی میرے پاس آ گیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ تو بہت بڑا اعزاز ہے۔ لکھنے والوں کو تو یہ مدینہ بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ جس کو ملا وہ امر ہو گیا۔

اس مارشل لاء میں یہ کسی بھی ایڈیٹر کی پہلی گرفتاری ہے۔

تاریخ نے مجھے اس رتبے کے لیے چنا ہے۔ تو کوئی وجہ تو ہو گی۔

میں اب زیادہ اہم ہو گیا ہوں۔ تاریخ کے اوراق میرے لیے کھل رہے ہیں۔

سچائی کی تلاش میں تو ان منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔

اب وہ مجھے سول لائنز تھانے کے حوالات میں لے آئے ہیں۔

ایف آئی اے والوں کے پاس اپنا لاک اپ نہیں ہے۔

کتنے افسوس کی بات ہے۔ اتنا بڑا ادارہ۔ اور ایسی بے سروسامانی کہ اپنی حوالات بھی نہیں ہے۔

ایف آئی اے والے تھانے والوں کے حوالے کر کے چلے گئے ہیں۔

رات گہری ہو رہی ہے۔

تھانے والوں کا اخبار والوں سے گہرا رابطہ ہوتا ہے۔ سول لائنز پولیس اسٹیشن کی حدود میں قریباً سب بڑے اخبارات کے دفاتر ہیں۔ کرائم رپورٹرز کو علم ہو گیا ہے کہ ایک صحافی اس تھانے میں بند ہے۔ تو وہ فون کر کے تھانے والوں سے پوچھ رہے ہیں۔ دلچسپی صرف خبر کی حد تک ہے۔ مارشل لاء ابھی تازہ تازہ ہے۔ جوان ہے اس لیے سب ہی خوفزدہ ہیں۔

تھانے والوں نے مجھے عام حوالاتیوں کیساتھ نہیں رکھا ہے۔ شاید ہدایت یہی ہے کہ خاص قیدی ہے سنگین جرم میں ملوث ہے۔ دوسرے قیدیوں میں بھی یہ جراثیم پھیل سکتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے مجھے دفتر کے ایک کمرے میں ایک بینچ دے دیا ہے۔ کہ جتنی رات بچ گئی ہے اس پر گزار لوں۔

میں نے یہ فہرست کہاں سے حاصل کی۔

میں نے اسے شائع کیوں کیا۔

یہ تو اس حکومت کی تیار کردہ فہرست تھی۔ جواب برطرف کی جا چکی ہے۔ راندۂ درگاہ ہو چکی ہے۔

جس کے تمام اقدامات غیر قانونی۔ غیر آئینی۔ غیر انسانی قرار دیئے جا رہے ہیں۔

یہ فہرست ایسے پاکستانیوں کی تھی۔ جن کے بیرون ملک سفر پر پابندی تھی۔ ان افراد کو پابندی کا پتہ اسوقت لگتا تھا جن وہ ایئرپورٹ پر اپنی تمام تیاریوں اور سامان سمیت پہنچتے تھے۔ ان کا پاسپورٹ بھی ضبط کر لیا جاتا تھا۔ ان میں سیاستدان بھی تھے۔ تاجر بھی۔ گلوکار بھی۔ مصور بھی۔ یہ حکومت کی مرضی تھی کہ وہ کسی کے سفر پر بھی پابندی عائد کر سکتی ہے۔

برطرف حکومت کے مظالم کی داستانیں ٹیلی ویژن پر بیان کی جا رہی تھیں۔ اخبارات میں شائع ہو رہی تھیں۔ ہمیں یہ فہرست کہیں سے ملی۔ تو ہم نے یہ سوچ کر شائع کر دی کہ ہم بھی گزشتہ حکومت کے مظالم کی روداد شائع کر رہے ہیں۔ لیکن ہمیں شاید اسکی اجازت نہیں تھی۔ مارشل لاء والوں نے برطرف حکومت کے سیکرٹ کو اپنا سیکرٹ سمجھا۔ اور ہمیں اسکی خلاف ورزی میں گرفتار کر لیا۔

رات شاید گزر گئی ہے۔ تھانے میں صفائی ہو رہی ہے۔

آنکھوں آنکھوں میں رات کٹ گئی ہے۔ کوئی خواب اچھا نہ برا۔

تھانے والے ناشتے کا پوچھ رہے ہیں۔

میں صرف چائے کے لیے کہہ رہا ہوں۔

ایف آئی اے والے آ گئے ہیں۔

مجھے عدالت میں پیش کیا جانا ہے۔

میرا کسی وکیل سے اب تک رابطہ نہیں ہوا ہے۔

معلوم نہیں کہ مزید پوچھ گچھ کے لیے ایف آئی اے کو میری ضرورت ہے کہ نہیں۔ یا مجھے جیل بھیج دیا جانا ہے۔

جیل اس حوالات سے تو بہتر ہو گی۔ اتنی افراتفری تو نہیں ہو گی۔

ایف آئی اے کی جیپ سے شہر کتنا اچھا لگتا ہے۔ کوئنز روڈ۔ ضیاء الدین روڈ۔ پاکستان چوک۔ ایم اے جناح روڈ۔ سٹی کورٹس۔ ان سڑکوں سے روز ہی گزرتے رہے ہیں۔ لیکن اب یہ نئی نئی لگ رہی ہیں۔ کل تک میں ان پر اپنی مرضی سے گھومتا پھرتا رہا ہوں۔ جدھر چاہتا تھا جا سکتا تھا۔ اب میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اپنی مرضی سے اس جیپ سے نیچے نہیں اتر سکتا۔ یہی فرق ہے بنیادی حقوق ہونے نہ ہونے میں۔

مجھے ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر۔ عبدالعزیز اشرفی کی عدالت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ انسپکٹر فاروق لودھی نے کاغذات پیش کیے ہیں۔

''معیار'' کے وکیل موجود ہیں۔ اقتدار علی ہاشمی۔ نام میں اقتدار شامل ہے۔ لیکن وکالت ہمیشہ اقتدار کے خلاف کرتے ہیں۔

ہمارے وکیل کا کہنا تو یہ ہے کہ یہ مقدمہ بدنیتی پر مبنی ہے۔ اسے خارج کیا جانا چاہیے۔ جہاں تک مزید ریمانڈ کا تعلق ہے۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ مزید کسی پوچھ گچھ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ایف آئی اے والے بھی زیادہ اصرار نہیں کر رہے ہیں۔ کیونکہ مزید پوچھنے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے۔ کوئی سیٹھ کوئی اعلیٰ افسر ہوتا تو اس سے معلومات تو زیادہ مل ہی سکتی تھیں۔ کچھ اور بھی مل سکتا تھا۔ جو بچوں کے چائے پانی کے کام آ جاتا۔ مجھ سے اس قسم کی کوئی امید نہیں ہے۔ ہماری مالی حالت کا علم ایف آئی اے والوں سے زیادہ کسے ہوگا۔

ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر نے ہمیں جوڈیشل ریمانڈ میں بھیج دیا ہے۔

جوڈیشل ریمانڈ کا مطلب ہے کہ اب ہمیں باقی وقت تھانے کے حوالات میں نہیں جیل میں گزارنا ہوگا۔

سنا ہے کہ عادی مجرم اس ریمانڈ سے بہت خوش ہوتے ہیں۔

حوالات کی دنیا بہت تنگ ہوتی ہے۔ جیل کی دنیا بہت وسیع۔

اب ہماری منزل کراچی سنٹرل جیل ہے۔

جیل پہلی بار جانا ہے۔ دیکھیں کیسی گزرتی ہے۔

یہ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے پہلے ماہ میں ہی 4 اگست 1977ء کی ایک دوپہر کی روداد ہے۔

☆

اطاعت گزاری کوئی ادیبوں سے سیکھے

''ادبی انٹرویوز کی روایت ہمارے ہاں زیادہ قدیم نہیں ہے لیکن ہمارے ابتدائی ادبی جرائد میں مقالے، افسانے، نظمیں، غزلیں سب کچھ ہوتا تھا ادیبوں، شاعروں سے انٹرویو شاذ ہی ہوتے تھے۔ اچھے ادبی انٹرویوز کی روایت بھی مغرب سے ہی آئی ہے۔ کسی ادیب شاعر کے انٹرویو کے لیے انٹرویو لینے والے کا پڑھا لکھا ہونا بھی ضروری ہے۔ کم از کم اس ادیب اور شاعر کا مطالعہ ناگزیر ہے جس کا انٹرویو لیا جا رہا ہے۔ انٹرویو نگار اگر وسیع مطالعہ رکھتا ہو تو یہ انٹرویو مکالمے کی شکل بھی اختیار کر جاتا ہے اور یہ مکالمہ قارئین کے لیے دلچسپ بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس وقت خطرناک بھی ہو سکتا ہے جب مکالمے میں انٹرویو لینے والا زیادہ بولنے لگے جائے۔ ایک لکھنے والے کی تخلیقات کے ذریعے قارئین اس کے اسلوبِ نگارش، زبان پر عبور، الفاظ کے رکھ رکھاؤ سے تو آگہی حاصل کرتے رہتے ہیں لیکن قاری کو تخلیق کار کی ذات کے قریب لانے میں، روزمرّہ کے معاملات جاننے میں، ادب اور زندگی سے متعلق نظریات کے بارے میں، گرد و پیش اور عہد کے سلسلے میں ادبی انٹرویو ہی معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں یہ ساری باتیں قارئین کے حوالے سے کر رہا ہوں اہلِ قلم کے حوالے سے نہیں۔ ہم اہلِ قلم میں صرف اپنا نام دیکھ کر اپنی تخلیق پڑھنے کے علاوہ کسی اور چیز کے مطالعے کی عادت ہی نہیں رہی۔ رسالہ آیا تو اس میں سب سے پہلے یہی دیکھتے ہیں کہ اپنی تخلیق کہاں شائع ہوئی ہے۔ مقام مرضی کے مطابق ملا تو خوش ہو گئے۔ مرضی کے مطابق نہیں ملا تو کڑھ کر رسالہ رکھ دیتے ہیں کہ باقی چیزیں بعد میں دیکھیں گے۔۔۔۔''

(''خواتین و حضرات'' سے ایک اقتباس)

''بابِ سخن تا قیامت کھُلا ہے''

پروفیسر گوپی چند نارنگ (دہلی، بھارت)

محمود شام پاکستان کے سربرآوردہ صحافی، ادیب، شاعر و دانشور ہیں۔ وہ ان دنوں روزنامہ 'جنگ' کراچی کے گروپ ایڈیٹر ہیں۔ زندگی بھر انھوں نے اردو صحافت کی آبیاری کی ہے اور مختلف اخبار و رسائل سے بطور مدیر، Correspondent یا کالم نویس وابستہ رہے ہیں، وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی رہے ہیں۔ مقدمات میں ماخوذ بھی ہوئے ہیں اور سیاسی طور پر معتوب بھی رہے ہیں۔ وہ جہانیاں جہاں گشت آدمی ہیں اور مختلف قومی رہنماؤں کے ساتھ ملکوں ملکوں گھومے پھرے بھی ہیں، ہوس سیر و تماشا نہ سہی، دید و دانش کی نظر سے انھوں نے دنیا کو دیکھا پرکھا بھی ہے۔ انھوں نے سفرنامے بھی لکھے ہیں اور متعدد مجموعے ان کے سیاسی و سماجی مضامین کے بھی شائع ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ اُن کی ایک پہچان شاعر کی بھی ہے۔ ہر چند کہ اُن کے پانچ چھ مجموعے شاعری کے شائع ہو چکے ہیں لیکن ان کی بنیادی پہچان بطور سینئر و منفرد صحافی کہیں زیادہ نمایاں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب ایک حیثیت راسخ ہو جاتی ہے تو دوسری کو دبا لیتی ہے۔ بہر حال اُن کی ذات میں ایک شاعر بھی کارگر ہے جو شاید ان کی دوسری مصروفیات کی وجہ سے اتنا نمایاں نہیں ہو سکا جتنا ہونا چاہیے تھا۔ وہ بطور صحافی جو نہ کہہ سکتے ہوں گے بطور شاعر زیادہ پُراثر طریقے پر کہہ لیتے ہوں گے۔ Poetic License بہر حال اپنی گنجائش رکھتا ہے۔ اس طرح کتھارسس بھی ہو جاتا ہوگا اور پڑھنے والوں کے لیے لطف و اثر کا سامان بھی۔

افسوس اس وقت ان کا کوئی شعری مجموعہ دستیاب نہیں، بس ادھر ادھر سے جو تھوڑا بہت کلام دیکھنے کو ملا، اسی کے پیش نظر ان کی شعری و تخلیقی جہت کے بارے میں یہ دو لفظ لکھ رہا ہوں۔

محمود شام نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی، نظموں میں آزاد بھی ہیں اور پابند بھی۔ صحافت کی دنیا میں شب و روز سنگین واقعات سے سابقہ پڑتا ہے اور رفتہ رفتہ انسانی المیے کے بہت سے پہلوؤں کے تئیں احساس کند بھی ہو جاتا ہے۔ زندگی ایک گزران ہے کہ گزرے جاتی ہے۔ حالاتِ حاضرہ میں نشیب و فراز آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں، اور ملکی و قومی، سماجی و تاریخی اتار چڑھاؤ کا جوار بھاٹا ذہن و قلم کو جھنجھوڑتا بھی رہتا ہے۔ شعر کہتے ہوئے سماجی سچائی شعری سچائی میں transform ہو جاتی ہے۔ شاعر بنیادی طور پر زندگی کو باطن کی آنکھ سے دیکھتا ہے، چونکہ تخلیقی ذہن شعور و لاشعور دونوں کا تال میل ہوتا ہے۔ واقعاتی فضا میں تعقل کی حکمرانی ہوتی ہے جبکہ شاعری کی دنیا میں احساس و تخیل کی، چنانچہ شاعری میں روزمرہ کی گزران کی اور واقعاتِ حاضرہ کی اچھی خاصی تقلیب ہو جاتی ہے۔ غزل تو یوں بھی واقعیت سے گریز پا رہتی ہے۔ اس کی دنیا ہی الگ ہے۔ یہاں واقعیت تجریدیت کی حدوں کو چھونے لگتی ہے۔ اس نظر سے محمود شام کی غزلوں کو دیکھا جائے تو بعض اشعار ایمائیت اور رمزیت کے پردوں سے سرگوشیاں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

پہلے تقسیم ملک بھی تھا جہاد
اب محلوں میں سرحدیں ہیں کھنچی
دار بن کر سجی ہے چورنگی
چہرے چہرے پہ دہشتیں ہیں کھنچی

در بدر جغرافیہ تاریخ ہیں
ایسی حکمت کر گئے ایجاد ہم

جس سے دنیا ہوگئی زیر و زبر
ہیں اسی بحران کی بنیاد ہم

کتنا گنجان غم کا جنگل ہے
لوگ ہیں اپنے ہی مکان میں گم

بانٹنا چاہا عقائد نے مجھے
احسن الخالق تھا بٹنا کیسے

پہلے دو شعر آج کی دردناک صورت حال پر اچھا خاصا طنزیہ تبصرہ ہیں، پہلے میں 'تقسیم ملک'، دوسرے میں 'چورنگی' جیسے لفظ مسائل کو مقامیت سے جوڑ بھی رہے ہیں، تاہم ایمائیت سے معنیاتی فضا خاصی سیال ہوگئی ہے۔ تیسرے اور چوتھے شعر میں بھی اشارے واضح ہیں لیکن 'جغرافیہ'، 'تاریخ' اور 'بحران' اشعار کی لطف اندوزی کو گہرا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ پانچواں اور چھٹا شعر اور بھی عمدہ ہے کہ ان کی ملفوظی ساخت تہہ داری کا حق ادا کرنے پر قادر ہے۔ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا یہ آج کے شعر نہیں، اور کیا ان میں غزل کے آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے شعریت کا حق ادا نہیں کیا گیا ہے اور کیا ان کے بین السطور میں روحِ عصر جھانکتی ہوئی نظر نہیں آتی؟ ان باتوں کا جواب اثبات میں ملے گا۔

یہی حقیقت مجھے محمود شام کی نظموں میں بھی نظر آتی ہے، بلکہ نظموں میں سماجی و تاریخی حوالے زیادہ قوی، زیادہ وسیع اور زیادہ متنوع نظر آتے ہیں۔ غزل تجریدیت کی ماورائی زبان بولتی ہے جبکہ نظم Topical ہوتی ہے۔ بات فقط ابہام کی نہیں بلکہ ایمائیت اور تہہ داری کی ہے۔ اگر ملفوظی ساخت برہنہ گفتاری کی نہیں اور متن وسیع اطلاقیت کا حامل ہے تو نظم قائم ہو جاتی ہے اور لطف و اثر،

معنیاتی دردمندی، طنز وتحریض، یا بے انصافی واستحصال پر احتجاج کا حق بھی ادا کرسکتی ہے۔ایسی نظموں میں مجھے 'بیٹی سب کی ہی بیٹی ہوتی ہے' یا 'باجوڑ' یا 'سوات' باوجود واقعاتی Pointers کے اچھی خاصی موثر نظمیں نظر آئیں جو اپنی الگ شعری جہات اور ذائقہ رکھتی ہیں۔البتہ ادھر انھوں نے 'دعائے شفائے کاملہ' کے نام سے جو نظم لکھی ہے وہ ان کی دوسری اس نوع کی نظموں سے کہیں آگے ہے۔یہ خاصی طویل نظم ہے جو تمام وکمال پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔فقط کچھ مصرعے غور کے لیے پیش کرتا ہوں:

.....گریباں آسماں کا اب زمیں کے ہاتھ میں ہے
فرشتوں کے لیے اب کتنے نوگو ایریا ہیں
کہ شاہی مسندیں، دفتر تو محترمہ کے آنچل میں چھپے ہیں
سب اک تصویر رکھنے سے پوتر ہو رہے ہیں
کرسیاں عہدے شہیدوں کے لہو سے دھل رہے ہیں
.....کہیں آیات بکتی ہیں
بہت سستی
فلک کی آنکھ تکتی ہے

.....مقدس خانقاہیں وردیاں دھونے لگی ہیں
سیاسی تاجروں کو عدلیہ پھر قرض حسنہ دے رہی ہے
شہنشاہوں کو تازہ آکسیجن کی ضرورت ہے
مگر اس کی درآمد بند ہے ایل سی نہیں کھلتی

حفاظت سخت ہوتی جارہی ہے
نہتی لڑکیاں ملائیت سے لڑ رہی ہیں
ہر اک بستی میں چیچنیں سائرن کی
فشار خوں بڑھاتی ہیں
دلوں پر ہاتھ رکھے شہرای سی جی کراتے ہیں
وطن ہے آئی سی یو میں
سبھی سے التجا ہے کہ
شفائے کاملہ کی اب دعا مانگیں

موضوع کی سنگینی اور معنیاتی فضا ہر پارے کے ساتھ گہری ہوتی جاتی ہے۔نظم کا ارتقا جاری رہتا ہے، حتیٰ کہ اختتام تک پہنچتے پہنچتے نظم پوری المناک فضا کا احاطہ کرلیتی ہے، اور آخری مصرعوں میں دعا کی اجابت کی آرزومندی آج کے انسان کا استعارہ بن جاتی ہے۔کہا جاسکتا ہے کہ بعض الفاظ غیر شاعرانہ ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا نظم میں یہ لفظ بولتے ہوئے لفظ نہیں؟ زبان میں لفظ بجنسہٖ ادنیٰ یا اعلیٰ نہیں ہوتے، شاعری میں ان کا شاعرانہ صَرف اور دروبست اُن کو اعلیٰ وادنیٰ بناتا ہے۔اگر ملفوظی تشکیل سے جو بات کہی گئی ہے وہ اور کسی طرح ادا نہیں ہوسکتی اور اسی طور پر کہی جاسکتی ہے اور اسی کی وساطت سے آج کی دردناک صورت حال، بے حسی اور سفاکی کی فضا کو ابھارا جاسکتا ہے تو یہی اس لفظیات کا جواز ہے۔شعریات روایت کے ساتھ ساتھ قائم بھی رہتی ہے اور تاریخ کی زد میں بدلتی بھی رہتی ہے۔یہ سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ آج کی نظم اس طرح کیوں نہیں کہی جاسکتی؟ یا کیا بدلے ہوئے حالات میں شعریات بدل نہیں رہی؟ اگر بقول ولی 'بابِ سخن' تا قیامت کھلا ہے تو ماننا پڑے گا کہ آج کی شاعری کا ایک اسلوب یہ بھی ہے۔یاد رہے کہ شاعری کا سینہ امکانات کے لیے کھلا رہتا ہے شرط شاعر ہونے کی ہے۔اور محمود شام شاعر ہیں۔شاعر بھی ایسے جن کا روم روم اپنے وطن کی مٹی اور اُس کی محبت سے سرشار ہے۔

جمہوریت کی بات

''رضا صاحب بھول جائیں پرانے قصوں کو۔اب تو جمہوریت کی بات کریں۔کل ہی امریکی سفیر آئے تھے، چھوٹی سی پارٹی تھی ہمارے ہاں۔وزیر اعلیٰ تھے، آئی جی اور کراچی کے انچارج برگیڈیئر۔امریکی سفیر نے صاف صاف کہہ دیا اب کبھی مارشل لاء نہیں لگے گا۔امریکا اب تیسری دنیا میں مارشل لاء پسند نہیں کرتا۔لیکن اقتدار میں فوج کا حصّہ رہے گا۔''

''اس کا کیا مطلب بیگم سلیمان؟''

''یہی سوال وزیر اعلیٰ نے بھی کیا تھا۔تو امریکی سفیر نے کہا کہ فوج اور امور خارجہ میں سویلین کا عمل دخل نہیں ہوگا۔فوج اپنے معاملات خود طے کرتی رہے گی۔امریکا سے بھی فوج کا براہ راست تعلق رہے گا۔اسی طرح امور خارجہ میں بھی امریکا سے تعلق براہِ راست ہوگا۔''

''میرے خیال میں تو بیگم سلیمان یہ بہت اچھا ہے۔کچھ نہ کچھ سکون رہے گا۔بزنس چلتا رہے گا۔ورنہ تو بڑی گڑبڑ رہتی ہے۔سویلین سے کنٹرول نہیں ہوتا۔''

(''شب بخیر'' سے اقتباس)

زمینی حقیقتوں کا آفاقی اظہار

ڈاکٹر محمد علی صدیقی (کراچی)

میں محمود شام کی شاعری سے ''نئی شاعری'' کی تحریک کی وساطت سے ساٹھ کی دہائی میں واقف ہوا۔ اس واقفیت کو مزید تقویت اس وقت ملی جب افتخار جالب کی مرتبہ کتاب ''نئی شاعری'' (۱۹۶۶) میں ان کا مضمون بہ عنوان ''میری صورت حال'' پڑھا سوئے اتفاق یہ مضمون اس کتاب میں شامل دیگر تمام مضامین سے ان معنوں میں مختلف تھا کہ اس مضمون میں وہ تحریکی ابال نظر نہیں آیا جو بعض دیگر مضامین میں موجود تھا۔ محمود شام نے اس مضمون میں کہا تھا کہ تمام سیاسی نظریات سے مطابقت ڈھونڈنے کی بجائے صرف انسان اور انسان دوستی کے قائل ہیں۔

اس زمانے میں محمود شام کی شاعری میں روایتی شاعری کی چمک دمک کے بجائے ''غریب الفاظ'' سے بڑے مفاہیم اخذ کرنے کا رجحان نظر آیا تھا۔ یہ رجحان آج تک اسی طرح باقی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ شاعروں کے ہجوم میں اپنے مشاہدات کے پس پشت انسانی درد کو بے تکلفی کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت سے حیرت انگیز فائدہ اٹھانے کے ماہر ہو چکے ہیں۔

''نئی شاعری'' کی بوطیقہ وٹ گن اسٹائن کے نظریے کے فلسفہ لسانی تشکیلات پر استوار تھی۔ وٹ گن اسٹائن نے بعد میں ان خیالات سے رجوع کر لیا تھا۔ افتخار جالب اپنے موقف پر ڈٹے رہے ہر چند کہ وہ کافی ہدف تنقید بنے۔ قابل تصدیق ریاضیاتی زبان کی کسوٹی پر قدیم اور جدید اردو شاعری نہ اتر سکی یہ کیونکر ممکن تھا کہ اردو شاعری کے میر، غالب، اقبال اور فیض کی شاعری کی پوری عمارت سر بسجود ہو جائے۔

محمود شام نے ''نئی شاعری'' میں شامل اپنے مضمون میں نئی شاعری کے داعیہ کے آگے سر تسلیم خم نہیں کیا تھا اور وقت نے ثابت کیا ہے کہ وہ اپنے بعض ہم عصروں کے مقابلہ میں زیادہ درست تھے۔ محمود شام کا mindset قصّہ زمین بر سر زمین کے شعری اظہار میں ایک نوع کی طرحداری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ خواہ وہ حسن اور محبت کی شاعری ہو یا خود شناسی اور آفاقی حقیقتوں کے عرفان کی شاعری ہو یا کڑوی حقیقتوں کے شہر آشوب کی شاعری ہو محمود شام کی شعری لغت شاعری کے ان تینوں ابعاد سے محرمانہ سلوک کرتی ہے۔

میرا مطالعہ ''محلوں میں سرحدیں'' پر مرتکز ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس سے پیشتر کے شعری مجموعوں کے شعری رس (essence) کو نظر انداز کر رہا ہوں۔ محمود شام کی شاعری مدھم اور کم آنچ کے جذباتی خمیر کی شاعری ہے اور وہ اس دھیمے اور مدھم انداز کی شاعری کو طاقتور اور موثر بنانے پر قادر نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں انسان دوستی کے حوالے سے متصوفانہ انداز نظر کی ایک زیریں سطح نظر آتی ہے جو وجودی انداز نظر کو بھی ایک نیم متصوفانہ رنگ دیدیتی ہے۔

محمود شام نے ۱۹۸۶ء کے بعد کراچی شہر کے دگرگوں حالات (جنھیں نسلی فسادات کا نام دیدیا گیا ہے) پر اس قدر بھرپور نظمیں تحریر کیں ہیں۔ ان نظموں میں وہ بلند آہنگی نظر نہیں آتی جو بعض طبّاع پر حاوی ہو جاتی ہے۔ کراچی کے بعض شعراء نے ۱۹۷۲ کے لسانی فسادات پر بھی شاعری کی ہے۔ رئیس امروہوی کا شعری مجموعہ ''آوازنے'' اس نوع کی شاعری کا سب سے زیادہ قابل توجہ مجموعہ ہے۔ جون ایلیا، اطہر نفیس، رضی اختر شوق اور دیگر شعرا نے بھی ۱۹۷۲ء کے درد آشوب کی شاعری کی ہے لیکن محمود شام کی ۱۹۸۶ کے بعد کی شاعری میں رنج وملال کی وہ لہر نظر آتی ہے جس کے بعد ناظر اور منظر میں کامل اتحاد کی شرط پوری ہو جاتی ہے۔

محمود شام کی شاعری میں انسانی درد والم کو سماجی اور سیاسی مناظر ہی میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ شاعری ثابت کرتی ہے کہ ادب کی سماجیات (Sociology of Literature) میں سیاسی مسائل کس درجہ اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر ان مسائل سے صرف نظر کیا جائے تو پھر شاعری اپنے بہم میں بانجھ ٹھرے گی۔ اگر آپ اس شاعری کو ترقی پسند (progressive) شاعری کہنا نہیں چاہتے تو آپ اسے بہر صورت engaged poetry سمجھے بغیر نہیں رہ سکتے اور ان حضرات کیلئے جو شاعری میں engagement یا سیاسی ردعمل دیکھنا نہیں چاہتے وہ عالمی نظام کے ادبی اور ثقافتی ایجنڈے ہی کو تقویت دیتے نظر آتے ہیں۔ محمود شام عالمیانے (globalization) کے ادبی اور ثقافتی ایجنڈے سے متحارب ہیں جیسا کہ ان کی شاعری سے عیاں ہے۔ میں ایڈورڈ سعید سے متفق ہوتے ہوئے یہ کہنا چاہوں گا کہ اس نوٹ کی شاعری ''بلند جدیدیت'' (High Modernism) کی شاعری ہوتی ہے اور سیاسی تناظر سے غیر متعلق نہیں ہو سکتی۔

محمود شام کے شعری مجموعے ''محلوں کی سرحدیں'' کی شاعری دیگر شاعروں کی اپنی شریں زباں کی شاعری کیلئے نہیں جانی جائیگی بلکہ اس شاعری میں تیز و تند حالات پر ردعمل کبھی بہت مدھم لہجہ اور کھردرا لہجہ گہرے اور دیرپا تاثر پیدا کرنے کا مثالی ہے۔ یہ انداز جذبات میں بہ آسانی بہہ جانے والی ادبی روایت کا خاصہ نہیں ہے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جب چیزیں احساس تناسب کو بری طرح جھنجھوڑتی ہیں تو بسا اوقات بلند آہنگی کا لہجہ عود کر آتا ہے لیکن جو شاعر اس لہجہ میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی آسانی سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا وہ اپنے مزاج کی wave-length ہی کو قرار واقعی اہمیت دیتا ہے۔ محمود شام کی شاعری خود شناسی، جمالیاتی اور اخلاقی اقدار کے ارتباط کی ضرورت اور ہماری زندگیوں میں آہستہ آہستہ در آنے والے بنجر پن کی عکاس شاعری ہے۔ شام نے میر کی شاعری کا مطالعہ ''محلوں کی سرحدیں'' (۱۹۹۹) کی شاعری کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ان

کا شعری مجموعہ جدید دور کے درد آشوب کیلئے مناسب ڈکشن کی شاعری ہے۔

میں محمود شام کی شاعری کے مثلث کے ان تینوں البعاد کی مرحلہ وار تقسیم کر رہا ہوں تا کہ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے کی طرف سفر واضح ہو جائے اور اس کے بعد محمود شام کی شاعری کے اسی حصے کی طرف آؤں گا جسے کراچی آشوب کہنا زیادہ مناسب ہوگا جب ماہنامہ تخلیق کے شمارہ اگست ۱۹۹۵ء میں ''اجڑتے شہر پر لکھی گئی نظمیں'' شائع ہوئیں تو ملک کے ادبی حلقوں میں ایک ''طوفان'' سا آ گیا جو لوگ سڑکوں پر پڑی ہوئیں لاشوں سے نظریں بچا کر اپنے گھروں کی راہ لیا کرتے تھے وہ ان نظموں کا سامنا نہ کر سکے۔ محمود شام کی ''کراچی'' اس پورے دور کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس نظم سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

میں نے پوچھا کہ ملاقات کب اپنی ہوگی
خشک پتوں پر لکھا اس کا یہ پیغام ملا

بین کرتی ہوئی گلیوں نے یہ پیغام دیا
حاکمِ وقت نہ جب قتل پہ مہلت مانگیں
جب محافظ ہی نہ خود اپنی حفاظت مانگیں
شہر لوگوں کو اماں دے کے نہ اجرت مانگیں
خدمتِ خلق پہ مامور نہ خدمت مانگیں
بھائی بہنوں کی جوانی سے نہ غیرت مانگیں
باپ بیٹیوں سے نہ جب مالِ غنیمت مانگیں
مائیں بچوں سے نہ جب دودھ کی قیمت مانگیں
جب زمیں پیار میں گر گر کے سنبھلتی ہوگی
کیا سماں ہوگا ملاقات جب اپنی ہوگی۔۔۔۔

شاعری حسن آفرینی کا دوسرا نام ہے۔ محمود شام کی شاعری میں فلاکت اور بربادی کی تمثالیں (images) اسی لئے درد بوتی ہیں اور دکھ کاٹتی ہیں کہ اس نے شاعری میں زندگی کی اجمالی اقدار کے زاویہ کو بہت اہمیت دی ہے اور زندگی سوز حقیقتوں کا عرفان اسی وقت ہو سکتا ہے جب شاعر جمالیاتی اقدار کے پسِ پشت زندگی کی ناآسودگیوں کو محسوس کر سکتا ہو۔ آپ محمود شام کی سہ البعادی شاعری میں سب سے پہلے جمالیاتی اقدار کے ساتھ گہری پیوستگی پر غور کیجیے۔ مثلاً

ملاحت اس کے بدن میں تو مدتوں سے تھی
ہماری طبع میں افتاد کچھ دنوں سے تھی
بدن کی شاخ تھی لرزاں حیا کے جھونکوں سے
چمک عجیب ان آنکھوں میں حسرتوں سے تھی
کیوں ترے جسم کی قربت میں تھے وارفتہ کھلا
اس کی خوشبو میں بھی شامل تھی زمیں کی خوشبو

مرے سوا جو کوئی تیرا آئینہ ہوتا
نہ جانے تیری جنوں سازیوں کا کیا ہوتا
تجھے تو خواہش تکمیلِ ذات لے بیٹھی
کہاں سے سامنے آنے کا حوصلہ ہوتا
رنگوں کے سیل میں کھوئی ہوئی لڑکیاں
خواہش کی سیج پر سوئی ہوئی لڑکیاں
شبنم سے بھیگتی پھولوں کی پتیاں
جیسے کہ رات بھر روئی ہوئی لڑکیاں
پنجروں میں بولتی چڑیوں کی ٹولیاں
رسم ورواج سے دھوئی ہوئی لڑکیاں
کوؤں کے شور سے سہمی ہوئی کونپلیں
غیرت کے کھیت میں بوئی ہوئی لڑکیاں
ٹیلوں پر پھیلتی بیلوں پہ کونپلیں
غربت کی پیٹھ پر ڈھوئی ہوئی لڑکیاں

آپ نے دیکھا کہ شعری احساس کی انفرادیت انسانی زندگی کو کن زاویوں سے دیکھ رہی ہے۔ اب ہم دوسرے رخ کی طرف آتے ہیں۔ جمال پسندی موقوف ہے خیر و شر، خوب و زشت اور سیاہ و سفید کو ایک دوسرے سے متمیز کر سکنے کی اہلیت پر۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب خدا سے بھی بچوں کی طرح سوال کرنے کی جسارت پیدا ہوتی ہے۔ جب جمال پسندی فطرت کی سرگوشیاں سننے لگے تو پھر شاعر کے ذہن میں شعر کی انسان بیزار زندگی کے بارے میں مختلف النوع سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

جب خدا بننے کی آزادی تھی
آدمی آدمی رہتا کیسے
بانٹنا چاہا عقائد نے مجھے
احسن الخلق تھا، بٹتا کیسے

تیرے بھرم سے تو مری بے بسی قائم ہے
جو میرے بس میں ہوتا تو میں خدا ہوتا
زمیں پر اتنے خداؤں کی مارا ماری ہے
تری خدائی کی ہیبت ترے جہاں سے گئی

درج بالا اشعار کی بنیاد جس خود شناسی پر ہے وہ یہ اشعار لکھواتی ہے:

رات گئے کُل دنیا اپنی لگتی ہے
دن میں اپنی ذات پرائی لگتی ہے
اک صورت کی کھوج میں پھرتے عمر ہوئی

اب ہر صورت جانی جانی لگتی ہے
ایک الجھے ہوئے سوال کی گرد
زندگی ہے فقط ملال کی گرد
سب یہ ہنگامے ہائے رنگ وبو
شام ایک لمحہ وصال کی گرد
ادھ کھلی کھڑکیاں کچھ کہتی ہیں
چپ کھڑی لڑکیاں کچھ کہتی ہیں

تعجب ہوتا ہے کہ ایک پیشہ ور صحافی ہونے کے باوجود محمود شام اپنے آپ سے بھی قریبی رابطہ قائم رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ وہ اپنے بچپن کی معصوم حرکتیں اور شوخیاں، سرشام سے سوجانے والے مکان اور یادوں کے بلاوے زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اردگرد کے کھیت، کھلیان، باغ، ان باغوں میں چہچہاتے ہوئے پرند اور دن ڈھلتے وقت کی یادوں کی معصومیت نے محمود شام کو انہیں شہر کی پرفریب زندگی کے خطروں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیا ہے۔ اپنی نظم ''سوچیں ایک طویل دن ڈھلتے وقت'' میں اس طرح خطاب کرتے ہیں۔

اب مجھے یہ کہنا ہے
دم بخود منڈیروں سے
چلمنوں کی حیرت سے
بے زبان دریچوں سے
لفظ میرا سرمایہ
لفظ ہی مری پونجی
لفظ تھے مرا اثاثہ
لفظ ہی مرے موتی
میں نے بانٹ ڈالے ہیں
ایسے بانجھ لوگوں میں
ذہن جن کے مغوی تھے
نور تھا نہ آنکھوں میں

اب تو وہ بھی مفلس ہیں
اور میں بھی بے مایہ
لفظ اب کہاں ڈھونڈیں
زندگی فقط چھایا
دن ہے ختم ہونے کو
دونوں وقت ملنے کو
دل ہے ڈوب جانے کو

اور ہونٹ سلنے کو

جب دل کی یہ حالت ہو اور اردگرد اندھیرا چھایا ہوا ہو اور انسان کے ہاتھوں انسان کی تذلیل ہو رہی ہو اور انسان یہ سوچ رہا ہو کہ آخر یہ سب ماجرا کیا ہے تو محمود شام کی شہر آشوب کی شاعری بھی منفرد لہجہ اختیار کر لیتی ہے۔

عزم موہوم، خوف نامعلوم
شہر مغموم، صورتیں ہیں کھنچی
پہلے تقسیم، ملک بھی تھا جہاں
اب محلوں میں سرحدیں ہیں کھنچی
ایک مدت سے ہم نہیں روئے
آنکھ دہکی ہوئی بھنویں ہیں کھنچی
دار بن کر سجی ہے چورنگی
چہرے چہرے یہ دہشتیں ہیں کھنچی
جب سے ہم راز قاتلوں میں ہوئے
جسم چٹخا ہوا رگیں ہیں کھنچی

حالات دیکھ دیکھ کے آتش بجاں نہ ہو
یہ آگ ہونے والی ہے گلزار غم نہ کر

بخشے ہیں پاسباں تو ہمیں لوٹتے ہوئے
ملتے ہیں ملک وہ بھی مگر لوٹتے ہوئے

محلّے مملکت در مملکت ہیں
عجب تاریخ میں ہنگام آیا

مرا جسم کٹ رہا ہے، مرا خون بٹ رہا ہے
مری زخم زخم جاں سے یہ زمانہ بے خبر ہے

کہیں آگ بانٹتے ہیں، کہیں خون چاٹتے ہیں
نئے شعبدہ گراں سے یہ زمانہ بے خبر ہے

مرے شہر میں دلوں میں، نئی سرحدیں کھنچی ہیں
نئے ممکنہ جہاں سے یہ زمانہ بے خبر ہے

زمانہ سرکش ہے، شہر برہم ہے، اجنبی ہیں تمام اپنے
ہر ایک دستے پہ گرم خوں کے دیے جلانا ہی زندگی ہے

اور پھر بالآخر شاعری اور انسانیت کے ساتھ کمٹمنٹ کا وہ فکری زاویہ پیدا ہوتا ہے جسے محمود شام کی شاعری کا مخصوص پہلو قرار دیا جا سکتا ہے۔

''زندگی کا رت جگا''

قتیل شفائی (●)

میرے خیال میں ظہیر کاشمیری کے بعد محمود شام ہی غالباً وہ رند مشرب ادیب ہے جس نے داڑھی کو نشانِ امتیاز بنا رکھا ہے۔ شروع شروع میں تو اسے یہ تبرک اپنے خاندانی ماحول سے ملا مگر آخر آخر اس نے شاید اسے لینن کی سنت سمجھ کر اپنائے رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ایک روایت پسند گھرانے میں پیدا ہوا۔ پٹیالے سے جھنگ تک کا سفر اس نے ۱۹۴۷ء میں کیا۔ چونکہ یہ سفر بچپن میں طے ہوا تھا اس لئے وہ ''پٹیالہ رنگ'' سے آشنا ہونے کی بجائے ''جھنگ رنگ'' میں ڈوب گیا اور جب کچھ اور بڑا ہوا تو اس نے لاہور کا رخ کیا یہاں اس نے کالج کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود پرانی روایت کی گٹھری سر سے نہ اتاری بلکہ اس کے ہاتھ میں فرسودہ عقائد کا ایک سانپ جیسا عصا بھی تھما دیا گیا، اور پٹیالے کا یہ مسافر زندگی کے سفر میں بھی جھنگ سے آگے نکل نہ سکا۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں غالباً ۱۹۶۴ء کی بات ہے محمود شام کی کچھ نظمیں اِدھر اُدھر گھومتی گھامتی مجھ تک پہنچیں۔ میں نے محمود شام کی وضع قطع اور اس کے حلقہ احباب کے پس منظر میں جب ان نظموں کا مطالعہ کیا تو مجھے یوں لگا جیسے محمود شام نے یہ نظمیں کسی سے لکھوائی ہیں یا محمود شام ان نظموں میں جھوٹ بول رہا ہے، کہاں محمود شام کہاں سوچ کے نئے زاویے۔ جی چاہا کبھی محمود شام ایسے عالم میں دکھائی دے کہ اس کا اوپر کا چھلکا اتار دوں۔ چنانچہ ایک دن ایسا بھی آیا کہ اس چلغوزے کے اندر کا سفید اور مزیدار محمود شام باہر آ گیا۔ وہ دن اور آج کا دن۔ اس نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ اس نے فن کے سائنسی نظریوں کو ایسا اپنایا کہ فرسودگی کی تمام پرچھائیاں ہوا ہو گئیں وہ صحافت میں گیا تو اپنی الگ سے پہچان کرالی۔ اس نے ادبی نثر لکھی تو اس پر اس کی اپنی چھاپ رہی، وہ شاعر کے روپ میں ظاہر ہوا تو انفرادیت نے اس کے قدم چومے۔ وہ ہر معاملے میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کا قائل ہے۔ صحافی کے طور پر اس نے انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا تو اندرا گاندھی سے لے کر پہاڑوں سے اترتے ہوئے جوگی تک اس کے نرغے میں آ گئے۔ کتابیں لکھیں تو بھٹو صاحب سے لے کر رمضانیوں تک کا احاطہ کر لیا اور جب شاعری پہ کمند پھینکی تو اپنی بیماری کے دوران نظموں کی ایک پوری کتاب لکھ ڈالی اور اس کتاب کو اپنی بیماری کا ہم نام بنا دیا۔ اب محمود شام کا نیا مجموعہ کلام آ رہا ہے۔ آپ دیکھیں گے جن موضوعات کے پتھروں کو دوسروں نے چوم کر چھوڑ دیا ہے ان پہاڑ جیسے پتھروں کا بوجھ محمود شام نے بآسانی اٹھا لیا ہے۔ اس نے شاعری کے ماؤنٹ ایورسٹ کو بھی سر کر لیا ہے۔ اس کے راستے میں کیا کیا مصیبتیں آئیں اس نے کسی کی پروا نہیں کی۔ ناہموار چٹانوں نے اسے ڈرایا برف کے طوفاں اُمڈتے رہے اور کبھی کبھی تو اس نے برفانی آدمیوں کے پاؤں کے نشانات بھی دیکھے لیکن اسے تو نظریہ فن کی اس چوٹی تک ضرور پہنچنا تھا جہاں لینن، ماؤزے تنگ اور مارکس کے مجسمے جگمگا رہے ہیں۔ جہاں اس کا اپنا وطن اس کے لئے آغوش وا کئے ہوئے ہے جہاں سائنسی اشتراکی چاندنی کے خمیر سے ایک ایسے معاشرے کا سویرا بھر رہا ہے جو پاکستان کے مستقبل کا سویرا ہے۔ رشوت اور منافع خوری سے پاک، دھاندلی اور بے انصافی سے مبرا۔ قومی وحدت اور ملی یگانت کا پیامبر۔ بھوک اور ایمانداری، اور افلاس کا دشمن اور اہل فن کا ہمدرد و غمخوار۔ یہی وہ سویرا ہے جس کیلئے محمود شام نے زندگی بھر کا رت جگا قبول کر رکھا ہے۔

محمود شام کو ہم ایک بڑے اخبار نویس کے طور پر جانتے ہیں۔ وہ اردو کے سب سے بڑے روزنامہ اخبار جنگ کا ایڈیٹر انچارج ہے اور اس سے پہلے کئی روزناموں، ہفتگی جریدوں اور ماہانہ رسائل کا ایڈیٹر رہ چکا ہے۔ لیکن میں نے اس کے تمام صحافیانہ اوصاف کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اول و آخر ایک شاعر ہی سمجھا ہے۔ شاعر بھی ایسا نہیں جو شاعروں کے بہت بڑے ریوڑ میں سر جھکائے چلتی ایک بھیڑ جیسا ہو بلکہ محمود شام اپنی انفرادیت کا خوبصورت لباس زیب تن کئے سب سے الگ تھلگ چلتا ایک طرح دار شخص دکھائی دیتا ہے۔ اس کے اندر شعر گوئی میں کوئی اجتماعی سانحہ نہیں برتا گیا کہ سانچے میں الفاظ ڈالو اسے تھوڑا سا کھڑکاؤ پھر کھول کر الٹو تو اس میں سے گھڑے گھڑائے اشعار نکل آئیں۔ نہیں ایسا نہیں۔ محمود شام کا جو شعر قرطاس و قلم کے وسیلے سے ہم تک پہنچتا ہے وہ براہِ راست اس کے ذہن رسا سے ہم تک پہنچتا ہے۔ اس کا ذہن سب سے الگ سوچتا ہے۔ ٹھیک سوچتا ہے یا خراب سوچتا ہے اس سے بحث نہیں جو کچھ ہے اس کا اپنا ہے اور اس اپنے پن کے آثار ہمیں تب سے دکھائی دینے لگے تھے جب اس نے ۶۵ء کے معرکوں میں ''بہو تو تیز تر بہو'' جیسا نغمہ لکھ کر اہل نظر کو متوجہ کر لیا تھا۔ وہ پھر شدید طور پر علیل ہوا۔ ہسپتال میں رہا۔ آپریشن کے بعد جب گھر واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک ایسے شعری مجموعے کا مسودہ تھا جس کا نام اس نے اپنی بیماری کے نام پر رکھا تھا۔ کارڈیو سپازم اس نام نے اس کے مداحوں کو چونکایا۔ بہت بہت باتیں ہوئیں۔ اچھی بری باتیں ہوئیں لیکن اس کا مجموعہ جب لوگوں کے مطالعے میں آیا تو سب مان گئے۔ یہ واقعی پڑھنے کی چیز ہے۔ اوروں سے ہٹ کر ہے۔

''محلوں میں سرحدیں'' اس کا چھٹا مجموعہ کلام ہے۔ اپنے نام اور کلام کے بامعنی ہونے کا اعلان کرتا ہوا یہ مجموعہ کراچی میں خون بشر کی ارزانی اور آپس کی محبتوں پر نفرتوں کی یلغار کا المناک تاثر دیتا نظر آتا ہے لیکن اس مجموعہ کلام میں ان موضوعات کو صحافیانہ انداز سے کھینچی ہوئی کیمرے کی تصویریں نہیں بنایا گیا بلکہ ایک مصور کے موقلم سے بنائے مصوری کے شہ پاروں جیسا رویہ اختیار

باقی: صفحہ نمبر پر ملاحظہ فرمائیے

کیا گیا ہے۔ میری باتوں سے یہ تاثر لینا بھی غلط ہوگا کہ محمود شام کے دل و دماغ پر صرف کراچی چیک کر رہ گیا تھا بلکہ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارا شاعر کراچی کا شہری ہے اور جو کچھ کراچی میں ہوا وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اس نے تو ظاہر ہے کہ شعور میں نہیں تو کہیں دور۔۔۔۔لاشعور کی گہرائیوں میں جمع ہو جانے والا مواد اس کے فن کی بنیاد تو یقیناً بنا لیکن کراچی کے المیے کو اس نے ایک سمبل بنا کر پورے پاکستان بلکہ پوری دنیا میں رونما ہونیوالے المیوں کو اپنے دائرہ فن میں لانے کی کوشش کی ہے اور ان المیوں پر ہی کیا موقوف ہمیں قدم قدم پر المیوں کے ساتھ ساتھ طربیوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ ہم اپنے آس پاس صرف غموں کی دھند ہی نہیں دیکھتے خوشیوں کی چکا چوند بھی ہمیں اپنے آغوش میں لیتی ہے۔ یہی باعث ہے کہ غم دوراں کے ساتھ ساتھ غم جاناں کے روایتی مضامین بھی اس مجموعے میں آپ کو ملیں گے لیکن اپنی الگ پہچان کے ساتھ اور خاص طور پر جب کہیں محبت کا ازلی و ابدی مضمون محمود شام کی زبان قلم پر آ گیا ہے تو اس کا بانکپن عجیب و غریب تاثر دیتا نظر آتا ہے۔ (میرا تو ایمان ہے کہ جو شاعر محبت کے معاملات کو عمدگی اور نفاست سے پیش نہیں کر سکا اسے از سر نو شاعری کا آغاز کرنا چاہیے) محبت کی اقلیم میں بھی کئی ایسے محلے ہیں جن میں سرحدیں بنا دی گئی ہیں۔ آپ انصاف کی نظر سے محمود شام کی شاعری پڑھیے اور ہم سب کو بتائیے کہ اس نے محلوں میں بنائی گئی سرحدوں کی کہاں کہاں نشاندہی کی۔۔۔۔انہیں کہاں کہاں سے نہیں ہٹایا۔۔۔۔محمود شام کے فکر و خیال آپ سے منصفی چاہتے ہیں۔

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے

○○○

''پاکستان اور چین کے جتنے قریبی تعلقات ہیں وہ صرف حکومتوں کی سطح پر نہیں ہیں بلکہ عوام کے دلوں کے درمیان ہیں۔ کوئی پاکستانی بھی چین جائے وہ وہاں کی زندگی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں آتا ہے۔ چین کے معاشرے میں موجود معاشی انصاف، معاشرتی توازن نئے نئے آفاق کی تسخیر کی جدوجہد، اپنے دست و بازو کے سہارے بڑی بڑی طاقتوں سے انسانیت کے وقار کے لیے ٹکر لینے کی صلاحیت، اپنے وطن، اپنی زمین سے والہانہ محبت سے انتہائی متاثر ہوتا ہے۔ چین جانے والے جانتے ہیں کہ انہیں ایسی فضاء، ایسا ماحول کسی اور ملک میں نظر نہیں آتا۔ خواہ وہ روس ہی کیوں نہ ہو جہاں سوشلسٹ نظام کا سب سے پہلے تجربہ کیا گیا۔ ہمارے ہاں سب چین جانے والے ابتداء میں چین سے ضرور متاثر ہوئے ہیں۔ اس حد تک متاثر کہ انھوں نے اپنی زندگی کو فوراً چینیوں کی طرز پر ڈھال لینے کا عزم کر لیا۔ لیکن ہمارا معاشرہ اور یہاں کے حالات ان اثرات کو جلد ہی زائل کر دیتے ہیں۔ میرے دوست سینیٹر کمال اظفر' افرادی قوت کے سلسلے میں ایک وفد کے لیڈر کی حیثیت سے چین گئے تو انھوں نے آتے ہی یہ عزم کیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کو چینی زندگی کے نمونے پر ڈھال لیں گے۔ صبح ورزش کریں گے تعیّشات کے قریب نہیں جائیں گے، صرف گرم پانی پیئے گے۔ مگر یہ تاثرات ان پر بھی دوسروں کی طرح عارضی ہی ثابت ہوئے۔ خود میرا بھی یہی حال تھا۔ دراصل چین کے نظام اور چینی زندگی کو جذباتی سطح سے ہٹ کر دیکھنے اور مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔۔۔۔''

(خواتین و حضرات'' سے اقتباس۔)

مولانا کوثر نیازی کی کتاب ''چین کا سفرنامہ'' کی تقریب رونمائی'

منعقدہ اسلام آباد 1974ء میں پڑھا گیا۔

○○○

شبِ سیاہ خیر سے گزار دے

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

خدا جانے یہ کھلی آنکھوں کا خواب تھا یا میرا واہمہ تھا کہ 5 جولائی 1998ء کو میرے سامنے ذوالفقار علی بھٹو کے دور سے لے کر بینظیر بھٹو کے پہلے زوال تک پوری تاریخ متحرک فلم کی طرح چلنے لگی مجھے اس دور کے سب واقعات لحہ بہ لحہ دکھائی دے رہے تھے۔ کبھی ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوریت مجسم صورت میں سامنے آجاتی، کبھی جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے کردار اور واقعات دکھائی دینے لگتے۔ میں نے پاکستانی قوم کو مارشل لاء کے کوڑے کھاتے اور کراہتے ہوئے بھی دیکھا۔ میں نے محمد خان جونیجو سے بھی ملاقات کی ہے اور بینظیر بھٹو کی حکومت آرائی کے متعدد مناظر بھی دیکھے، اس تمام عرصے میں اقتدار اور سیاست کے ایوانوں کے مکین بدلتے رہے لیکن جس رنگین اور سنگین کہانی کی ابتدا پاکستان کے ''قبضہ گروپ'' کے پہلے حکمران نے کی تھی وہ رنگین اور سنگین داستان ہر دور میں دہرائی جاتی رہی، یہ پاکستان کے خاص لوگ ہیں یہ بیس خاندان ہیں جو اس ملک پر حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئے اور گزشتہ ساٹھ سال سے حکومت کر رہے ہیں ان کے بارے میں قول اوّل اور قول آخر یہ ہے:

''زندگی ان کی ہے، دن ان کے ہیں، راتیں ان کی ہیں، زلفیں ان کے شانوں پر پریشان ہوتی ہیں، گیسوان کے لیے مہکتے ہیں، گلاس ان کے لیے کھنکتے ہیں، گھنگھرو ان کے لیے چھنکتے ہیں، لمحات ان کے لیے بہکتے ہیں، جام ان کے لیے چھلکتے ہیں۔''

یہ نثری شاعری نہیں بلکہ دل کے زخموں سے رستا ہوا وہ خون ہے جو ایک کتاب کے صفحات پر جم گیا۔ یہ کتاب میں نے گزشتہ گیارہ گھنٹوں کی طویل نشست میں پڑھی ہے۔ اس کتاب کے مصنف نے اپنے کرداروں کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ اس نے ان کو دور سے بھی دیکھا ہے اور قریب سے بھی، اس نے ان کی سب عادات واطوار وخصائل کا مشاہدہ کیا ہے۔ وہ گواہی دے رہا ہے کہ:

''وقت ان کا غلام ہے، ان کے مقدر کو دوام ہے۔ ہر طرف احترام ہے، ہر جانب سے سلام ہے، عمر کا ہر لمحہ ان کے لیے انعام ہے۔ ہر سانس ان کے لیے آرام ہے۔ یہ بادشاہ بھی ہیں، بادشاہ گر بھی ہیں، ان کے پاس پیسہ بھی ہے، طاقت بھی۔''

''زن، زر، زمین کی صدیوں پرانی تثلیث یہاں بھی اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ رقص فرما ہے۔'' بظاہر یہ سیاسی فلسفے کی کتاب نہیں اس میں کسی نوع کی سیاسی فکر بھی پیش نہیں کی گئی لیکن یہ کتاب سیاست سے بے بہرہ بھی نہیں بلکہ عملی سیاست کا اور بالخصوص پاکستان کی سیاست کا صادق نمونہ ہے۔ اس کے کردار جنرل سلطان، جنرل رحمت، جنرل جہاں تاب، انتخاب فاروقی، بیگم خان، سیٹھ احمد جیلانی، میر اقبال علی کالپوری، بیگم بخاری، اسد الٰہی، ارسلان وحید، بیگم سرخاب، ایچ ڈی (حق داد)، نجیب، وقار عثمانی، ساجدہ رضوی، سوناری وغیرہ سب فرضی کردار ہیں، ان کرداروں کی حرکت وعمل کو ناول کی حرکت وعمل بھی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن یہ سب زندہ کردار ہیں اور ایک بالکل نئی تکنیک میں فکشن کے ذریعے نہ صرف زندہ کر دیے گئے ہیں بلکہ اس تمام ڈرامے کو خلوت سے جلوت میں اور غیاب سے ظاہر میں لے آئے ہیں جو اس ملک کے اعلیٰ سیاسی اور سرکاری حلقوں میں ہر دور میں کھیلا جاتا رہا ہے کھیلا جا رہا ہے۔'' حکومت بدل جاتی ہے، چہرے بدل جاتے ہیں لیکن حالات نہیں بدلتے۔ ان میں چند خاص لوگ ایسے بھی نظر آتے ہیں جن کی کمر میں ''آٹو گیئر'' لگے ہوئے ہیں، وہ حالات کے ساتھ ازخود بدل جاتے ہیں اور ہر حکومت کے ہراول دستے میں دیکھے جاتے ہیں اور ہر محفل میں پائے جاتے ہیں لیکن کوئی یہ نہیں سوچتا کہ:

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا
جب لاد چلے گا بنجارہ

اس کتاب کے ہر ورق پر چانکیہ کی اولاد سے اور میکیاولی کے فرزندوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ یہ ہماری قوم کا عبرت نامہ ہے جس سے کوئی حکمران سبق حاصل نہیں کرتا نہ مکافاتِ عمل پر غور کرتا ہے۔

اس کتاب کا نام ''شب بخیر'' ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناول ''آخر شب کے ہم سفر'' میں ایک بہت بڑا المیہ ابھارا گیا تھا۔ یہ المیہ پاکستان کی تقسیم پر اور بنگلہ دیش کی تخلیق پر منتج ہوا تھا۔ وہی المیہ اس کتاب میں پھر عمل پذیر نظر آتا ہے۔ مجھے ''شب بخیر'' کے مصنف سے ذاتی تعارف حاصل نہیں ہے۔ بس اتنا معلوم ہے کہ وہ ملک کا ایک معروف دانشور، ادیب شاعر اور صحافی ہے، کبھی اس کو ذوالفقار علی بھٹو تک رسائی تھی اور وہ اسی دور کی خبریں عینی شاہد کے طور پر چھاپا کرتا تھا لیکن پھر حادثہ یہ ہوا کہ بھٹو صاحب کو بنجارہ لاد کر لے گیا۔ ان کا ٹھاٹھ یہیں پڑا رہ گیا۔ بھٹو صاحب کی باقیات سے بینظیر بھٹو ابھریں اور ملک پر چھا گئیں۔ قوم ان کی یرغمال بن گئی لیکن اب حالات کچھ اور تھے۔ ''شب بخیر'' کا مصنف اب اس مقام پر تھا کہ گزشتہ برسوں کا تجزیہ کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی اور مطالعے کا حاصل بیان کیا تو تفصیل کو تجرید میں یوں بیان کیا:

''سب ایک دوسرے کی غلطیوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، سیاستدان غلطیاں زیادہ کرنے لگتے ہیں تو مارشل لا والے آجاتے ہیں۔ مارشل لاء والے غلطیاں کرنے لگتے ہیں تو وہ خود سیاستدانوں کو لے آتے ہیں ان دونوں کی غلطیوں کا خمیازہ ملک کو، قوم کو اور عوام کو بھگتنا پڑتا ہے۔''

''تاج وتخت کبھی عشق کی نذر ہو گئے، سلطنتیں ہوس کے سیلاب میں بہہ گئیں، قومیں اپنے بڑوں کو بوالہوسی کے سبب اپنی شناخت کھو بیٹھیں''۔ اور پھر آبروئے شیوۂ اہل نظر جاتی رہی۔

اس کتاب میں دکھایا گیا ہے کہ کبھی جانور شکار ہوتے ہیں، کبھی انسانوں کو شکار کیا جاتا ہے اور کبھی پوری قوم پر شب خون مار لیا جاتا ہے۔ کبھی آدھا ملک ایک سیاستدان اور باقی ماندہ ملک کو دوسرا سیاستدان شکار کر لیتا ہے۔ لیکن حالات کی گردش جاری رہتی ہے۔ حکمرانوں اور بیوروکریٹوں اور چاپلوسوں کی روش کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ اس کتاب میں قومی مجرموں کو بے نقاب کیا گیا ہے لیکن انہیں موسوم نہیں کیا گیا۔ نہ ان کا احتساب کیا گیا ہے نہ فرد جرم عائد کی گئی ہے۔ مصنف نے جس کا نام محمود شام ہے ان سب کو قومی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ فیصلہ پڑھنے والے عوام خود کریں، کیونکہ مظلوم صرف عوام ہیں، باقی سب ظالم' جابر' قاہر اور اپنی ہوس اور حواس کے غلام ہیں'۔۔۔۔ اختتام پر دل سے ایک ہی دعا نکلتی ہے۔

اے خدا یہ شب سیاہ بخیر گزار دے! اے خدا' اے خدا!!

مقام واردات سے ایک خط

بہت ہی محترم معزز اور انتہائی منظم ہم وطن ڈاکوؤ' سب سے پہلے تو میں دلی معذرت چاہتا ہوں کہ آپ نے ہمارے گھر کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا اور میں آپ کے خیر مقدم کے لیے موجود نہ تھا حالانکہ مجھے برسوں سے آپ کی آمد کا انتظار تھا۔ اس بات کی بھی معافی چاہتا ہوں کہ آپ جو توقعات لے کر آئے تھے وہ پوری نہ ہو سکیں۔ جس طرح مختلف حکومتیں عوام کی توقعات پوری نہیں کر سکیں اسی طرح ہمارے گھر سے بھی آپ نے جو امیدیں باندھی تھیں وہ بر نہ آئیں۔ آپ تشریف لائے، اور آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا۔ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔ آپ کو مال کی تلاش تھی، مال کی تلاش میں لوگ کہاں کہاں نہیں جاتے، اس کی طلب میں لوگ الیکشن لڑتے ہیں، حکومت میں عہدے قبول کرتے ہیں، انہیں اگر مال ہی نہ ملے تو کتنی مایوسی ہوتی ہے۔ آپ کو یقیناً درست اطلاعات نہیں ملیں۔ آپ کے ذرائع قابل اعتبار اور مستند نہیں ہیں۔ ملک میں یہ بہت ہی غلط تمدن جڑ پکڑ رہا ہے کہ اب ذرائع صحیح اطلاعات نہیں دیتے۔ اس لئے خبریں غیر مصدقہ رہتی ہیں۔ ان خبروں پر ہی سیاسی پارٹیاں اپنے ردعمل داغ دیتی ہیں، اداریے لکھ دیئے جاتے ہیں، ان پر ٹاک شوز بھی ہو جاتے ہیں لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ آپ کو بھی اپنے ایسے ذرائع ڈھونڈنے چاہئیں جو مصدقہ خبریں دیں۔ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔ بے چارے تنخواہ دار پورے مہینے کام کر کے کچھ کماتے ہیں، آپ کو ایک واردات میں اتنا کمانا ہوتا ہے جس میں آپ اپنے سرداروں، اداروں اور سرکاروں کو حصہ دے سکیں۔

مجھے آپ کی دید کا بڑا اشتیاق تھا، میں نے خزانے پر ڈاکے ڈالنے والوں کو قریب سے دیکھا ہے۔ آئین پر رہزنی کرنے والوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ قانون توڑنے والوں سے آشنائی رہی ہے۔ یہ جو آپ کی طرح بڑی محنت اور خلوص سے ڈاکے ڈالتے ہیں ان کو میں نے قریب سے نہیں دیکھا۔ آپ نے تو قومی یکجہتی کا مظاہرہ کیا۔ گروپ میں اردو بولنے والے بھی تھے، سندھی بھی سرائیکی بھی۔ آج کل ویسے ہی مفاہمت کا دور ہے، جو بھی واردات ہو رہی ہے مل جل کر کی جا رہی ہے۔ اس تفہیم کا مظاہرہ آپ نے بھی کیا ہے۔ زبانیں بھی ساری تھیں، لباس بھی سارے تھے، یعنی پوری تیاری سے آپ آئے۔ چھٹی کا دن آپ نے ڈیوٹی کی، معلوم نہیں ہدف کیا دیا گیا تھا اور وہ پورا نہ ہونے پر کیا سزا طے ہو گی۔ مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے۔ اگر آپ پہلے رابطہ کر لیتے تو ایسے سیٹھوں کے نام مل جاتے جن کے ہاں اتنی دولت گھر پر ہوتی ہے کہ انہیں خود بھی معلوم نہیں کہ یہ سرمایہ کتنا ہے، کہاں سے آیا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کی ان سے آشنائی ہو، آپ ان کے سرمائے میں اضافہ کرتے ہوں، آپ ان کے لئے بھاگ دوڑ کرتے ہوں یہ کیسی خوش کن بات ہے کہ آپ نے کتابوں کو بالکل ہاتھ نہیں لگایا حالانکہ بچپن سے ہم پڑھتے آئے ہیں کہ علم سب سے بڑی دولت ہے۔

یہ بھی قابل قدر بات ہے کہ آپ نے سچ کے سوا کچھ نہیں بولا۔ صرف اتنا کہا، پارٹی کہتی ہے کیش لے کر آؤ، معلوم نہیں یہ کونسی پارٹی ہے جو آپ کو اتنی مشکل میں ڈال رہی ہے۔ جو کیش بینکوں میں پڑا ہے، مارکیٹوں میں ہے، پٹرول پمپوں پر ہے، ایک صحافی، ادیب کے گھر پر کیسے ہو گا۔ یہ بھی امر قابل تحسین ہے کہ آپ کو جدید ترین ٹیکنالوجی سے بہت لگاؤ ہے۔ موبائل فون، لیپ ٹاپ، سی ڈیز اور اس سے متعلقہ آلات میں آپ نے دلچسپی ظاہر کی۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ ہمارے ڈاکوؤں کی موجودہ نسل نئی ٹیکنالوجی سے بے بہرہ نہیں ہے۔ ہمیں اپنے مستقبل کے محفوظ ہونے کا یقین ہو گیا ہے۔ موبائل فون کے استعمال سے بھی آپ پوری طرح واقف ہیں اس کو جام کرنے کے جتنے طریقے ہیں آپ نے ان کو ناکام بنانے کا عزم ظاہر کیا۔ اس سے آپ کے ''کمپیوٹر لٹریٹ'' ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اقبال اپنی کشت ویراں سے ناامید نہیں ہے

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

محمود شام

(گھر آنے والے ڈاکوؤں کے نام مکتوب)

''وجودِ عدم کی سرحد پر''

سحر انصاری (کراچی)

ہم اپنی زندگی کے تغیرات کو وقت کی گردش اور لمحات کے مسلسل سفر ہی سے پہچانتے ہیں۔ بدلتے ہوئے موسموں کا ادراک بھی ہوا کے لمس' درختوں کے ظاہری روپ اور موسموں سے حاصل ہونے والے سود و زیاں سے ہوتا ہے۔ لیکن ان جانے پہچانے موسموں کے سوا اور بھی موسم ہوتے ہیں جن کا ادراک ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ ایسے موسموں کی پہچان کے لیے طبعِ حسّاس اور دیدۂ بیدار کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہمارے جانے پہچانے شاعر محمود شام نے اپنی شاعری کے نئے مجموعے کے ذریعے ایک نئے موسم کی نشان دہی کی ہے جس کا نام انھوں نے ''قربانیوں کا موسم'' رکھا ہے۔ ہم تیسری دنیا کے باشندے قربانیوں ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا کوئی ایک جواب نہیں۔ لیکن محمود شام جیسا دردمند دل' پختہ شعور اور ایک مستحکم کمٹ منٹ رکھنے والا شاعر اور ادیب اپنے فن میں اس کے خدوخال واضح کرتا رہتا ہے جن کی یکجائی سے ہم ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ناآسودہ انسان پر گزرنے والے موسموں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

محمود شام صحافت کی تو ایک اہم شخصیت ہیں ہی لیکن ادب خصوصاً شاعری اُن کی ایک بڑی پہچان ہے۔ ہر چند کہ شاعری کے باب میں ان کا رویہ بڑا محتاط ہے۔ وہ مشاعروں میں نہیں جاتے۔ گلوکاروں سے اپنا کلام نہیں گواتے اور دوستوں سے اپنے اوپر مضامین اور مدیر کے نام اپنے حق میں تعریفی خطوط بھی نہیں لکھواتے۔ گویا انہوں نے وہی راہ اختیار کی ہے جسے ادب و شعر کی سچی اور حقیقی راہ کہا جا سکتا ہے۔ دھیمے دھیمے انداز میں' غیر محسوس طریقے سے آگے بڑھنا اور ایک دن یہ ثابت کر دینا کہ درد و غم جمع کر کے دیوان کیسے بنایا جاتا ہے۔

محمود شام ایک حساس دل اور خلّاق ذہن کے انسان ہیں۔ گردو پیش کی زندگی سے وہ متاثر ہوتے اور اسی سے اپنی شاعری کے موضوعات' اشارات اور علامات اخذ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی ایک طویل نظم ''کارڈیوسپازم'' اس کی بہترین مثال ہے۔ محمود شام میرے عزیز اور قریبی دوست ہیں۔ ادب و شعر کے علاوہ ان کی نجی اور ذاتی زندگی بھی میرے لیے اہم رہی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ کس طرح ان کے معالج نے اس بیماری کا انکشاف کیا کہ معدے کے منہ پر ایک نامیاتی رکاوٹ بن جاتی ہے جو حلق سے آنے والی غذا کو معدے تک پہنچنے نہیں دیتی۔

محمود شام ایک نظریاتی شاعر ہیں۔ انھوں نے انسان کی بہتری' امن اور جمہوریت کی بقا اور ہر قسم کی عصبیت کے اور ظلم کے خلاف سوچا اور لکھا ہے۔ اپنے نظریات کی بنا پر انھیں متعدد بار قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ ''قربانیوں کا موسم'' ایسے کلام کا عکس ہے جو پاکستان کی مختلف جیلوں میں اسیری کی زندگی بسر کرتے ہوئے معرضِ تخلیق میں آیا۔

لیکن محمود شام زنجیروں اور زندانوں ہی کے اسیر نہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ضمیر کے قیدی ہیں۔

ہم تو اک عمر سے ہیں شام گرفتارِ ضمیر
اپنے وجدان کے مرکز کو خدا مانتے ہیں

دراصل اس باشعور اور باضمیر روّیے سے محمود شام کی شاعری اور ان کی قربانیوں کی سمت متعین ہوتی ہے۔ پھر اس کتاب میں شام نے صرف اپنے ذاتی ابتلا و آزمایش کا تذکرہ نہیں کیا ہے بلکہ ایک مکمل عہد' قربانیوں کے پورے موسم کی شاعرانہ تصویریں پیش کی ہیں۔ ان میں اُن شخصیتوں کی بھی قربانیاں ہیں جن کے چہرے آپ آسانی سے پہچان سکتے ہیں اور ان کا دُکھ درد بھی ہے جو بے چہرہ وجود اور گمنام فرد کی طرح وقت کے جبر کا ایندھن بن جاتے ہیں۔ وہ المیے محمود شام کی نظموں اور غزلوں میں صاف پہچانے جا سکتے ہیں جن کی سطح انفرادی بھی ہے اور اجتماعی' قومی اور بین الاقوامی بھی۔ اس کے اظہار میں محمود شام کا لہجہ کہیں غمگین ہے' کہیں طنزیہ' کہیں باغیانہ ہے کہیں رجائیہ۔

کھڑے ہیں اب تو وجود و عدم کی سرحد پر
بس ایک لغزشِ پا پر ہے فیصلہ ہونا

جو آدمی بھی مکمل نہ بن سکے تھے ابھی
انھیں بھی اب تو میسر ہوا خدا ہونا

کبھی انا کی فصیلیں' کبھی ضمیر کا طوق
یہ عمر قید ہے اس سے کہاں رہا ہونا

آپ نے دیکھا کہ محمود شام کس طرح عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ کیوں کہ زنداں محض قید و بند اور در و دیوار کا نام نہیں ضمیر کا طوق اور ضمیر کی زنجیر آدمی کو عمر بھر اس میں رکھتی ہیں۔

محمود شام اپنے اس احساس میں اپنے ماحول اور اپنے عہد کو بڑی خوبی سے شامل کر لیتے ہیں۔ اس طرح بات الگ سے اوڑھی ہوئی نہیں لگتی بلکہ تخلیقی کرب کا ایک ناگزیر حصّہ بن کر سامنے آتی ہے۔

بجھتی ہے بارشوں سے' نہ لوگوں کے خون سے
اپنی زمیں کی پیاس بھی کتنی غضب کی ہے

اخبار پڑھ کے سب ہی نکل آئے چوک میں
دیکھا نہ یہ بھی' لوح پہ تاریخ کب کی ہے

اخبار' لوح اور تاریخ۔ یہ محمود شام کی صحافیانہ زندگی کی تثلیث ہے۔ اس کے اندر کتنے ان کہے واقعات اور کتنی راتوں کی بیداری کا کاجل اپنا روپ دکھاتا ہے۔ بین السطور اس آخری شعر میں بہت کم کہہ دیا گیا ہے۔ ہمارا معاشرہ ترقی اور تنزلی کی کن جہتوں سے گزر رہا ہے۔ اس کا احساس اور شعور محمود شام کو خوب ہے اور وہ اس کے اظہار پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔

ہونے کے تجربوں میں ہی اک عمر کٹ گئی
بے چہرہ گردنوں میں ہی اک عمر کٹ گئی

اس زعم میں کہ ہم تو بہت سربلند ہیں
کوتاہ قامتوں میں ہی اک عمر کٹ گئی

محمود شام نے غزل کو ایک رچاؤ کے ساتھ قبول کیا ہے۔ انھوں نے ایک طرف تو غزل کے امکانات کو یہاں تک پیش نظر رکھا کہ اس میں ڈائری' ٹیلی فون' فٹ پاتھ' کاریں اور دوسرے ایسے الفاظ لے آئے ہیں جنہیں ہم زندگی میں برتتے ہیں لیکن غزل میں لکھتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ دوسری طرف انھوں نے غزل کی خالص روایت کو بھی بڑی خوبی سے جدید طرزِ احساس کے قریب کر دیا ہے۔ چند شعر دیکھیے۔

تیرا چہرہ تو کبھی دھیان سے ہٹتا ہی نہیں
کوئی رُت ہو تری آنکھیں ہی اُبھر آتی ہیں
دیکھی جاتی نہیں پیڑوں سے بھی تنہائی مری
ٹہنیاں جھکتی ہیں کھڑکی میں سے در آتی ہیں

پانے کی آرزو بھی جو ہوتی تو کس طرح
کھونے کی لذتوں میں ہی اک عمر کٹ گئی

کوئی ملتا ہے جب ترے جیسا
ٹوٹ جاتا ہے پھر مرے جیسا

وہ نقشہ جس میں زمیں گھومتی ہے صدیوں سے
کبھی اسے بھی لہو میں اُتار کر دیکھو

وقت کی گرد تو کھاتی ہے فقط جسموں کو
روح کس خوف سے جسموں میں چھپی رہتی ہے

اپنی یادوں کی حسیں شاخ پہ رہنے دو ہمیں
ٹوٹ جاتے ہیں تو ملتے نہیں پتّے دیکھو

صبح سے دیکھتا ہوں شہر میں منظر کیا کیا
رات بھر زندگی آنکھوں میں رُکی رہتی ہے

غزل کا یہ رچا ہوا انداز محمود شام کی غزل کا محض ایک رُخ ہے۔ لیکن جہاں لہجے میں تیکھا پن نمایاں ہو کر معاشرے پر تنقید کی ایک مؤثر شکل اختیار کر لیتا ہے وہاں ایسے اشعار تخلیق ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

لے اُڑی روشنی ہی جراتِ بینائی مری
اب تو میں دن کے اجالے سے بھی ڈر جاتا ہوں

وہ خامشی ہے کہ سب ہو گئے ہیں پتھر کے
یقیں نہ ہو تو کسی کو پُکار کر دیکھو

شہر سے رہتی ہے اک جنگ مسلسل دن بھر
شہر جب ہانپنے لگتا ہے تو گھر جاتا ہوں

کتنے کندھے تو کئی سر ہیں اٹھائے پھرتے
کسی کندھے پہ تو اک سر بھی عجب لگتا ہے

فیصلے کرنے لگے خود ہی سبھی فریادی
شہ کا دربار تو کیا جانیے' کب لگتا ہے

نئے خیال کہیں سے اُٹھا کر لا نہ سکے
ہمارے سر تو کلاہوں میں ایسے قید ہوئے

محمود شام استحصالی قوتوں کے خلاف سوچتے اور شاعری میں اس کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ ایسی کلاہوں کو گرا دینا چاہتے ہیں جو نئے خیالوں کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ انہیں اس بات سے خوشی ہوتی ہے کہ اب عوام کی عدالت اپنے فیصلے خود کرنے لگی ہے۔ غزل کا پیرایہ اس ضمن میں محمود شام کا برابر ساتھ دیتا ہے۔ لیکن ان کی نظمیں ''عمر آشوب''۔ ''کراچی پریس کلب''۔ ''آف ڈیوٹی ایر ہوسٹس''۔ ''بنتِ وطن''۔ ''قندھار میں ایک رات''۔ ''وہ بہت یاد آیا''۔ محمود شام کے قوت اظہار کی ایک دوسری جہت پیش کرتی ہیں۔

محمود شام نے سیر و سیاحت بھی بہت کی ہے۔ انھوں نے دنیا کا تقابلی مطالعہ بھی کیا ہے۔ جنیوا ہو یا بنگلور اور کولکتہ، قندھار ہو یا رتّو کوٹ۔ ہر جگہ

انہیں انسان اور اس کے مسائل کا شعور رہا۔ وہ ظلمت کے خلاف سوچتے اور اُجالوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ان کی یہ ساری تگ ودو ایک آفاقیت ایک عالمگیر اخوت کا پیغام دیتی ہے لیکن ان کا بنیادی حوالہ اُن کا اپنا وطن اور اس میں سانس لینے والے کروڑوں باشندے ہیں جن کی تقدیر کو وہ عرصۂ ظلم وظلمت سے باہر دیکھنا چاہتے ہیں۔

آخر میں وہ بات بھی کہہ دوں جو''قربانیوں کا موسم'' پڑھتے وقت برابر میرے ذہن پر دستک دیتی رہی۔محمود شام کی یہ کتاب ایک خاص پس منظر ایک خاص ایقان کے ساتھ اُس دور میں آئی ہے جب ایقان شکنی اور نظریوں کی شکست وریخت کے کئی مہیب تجربوں نے کرۂ ارض کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔نظریے اور آدرش پر جان دینے والوں کے سامنے ایک تاریک بند گلی نے اپنا دہانہ کھول دیا ہے۔ایسے وقت جب بہت سے لوگ وقت کی رو میں بہہ نکلے ہیں۔یہ سوچنا پڑے گا کہ بعض نظریوں کی ناکامی پسپائی یا ان کی غلط تعبیر کے بعد کیا انسانی مسائل ختم ہو جائیں گے۔نظریے تو ان مسائل کو حل کرنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ جب تک انسان ظلم واستبداد' ناانصافی اور محرومی' عسرت وافلاس کی چکی میں پستا رہے گا۔اُس کی بہتری کی راہیں تلاش کرنے والے سوچتے رہیں گے۔ نظریے بناتے رہیں گے اور جہد وعمل کے پرچم لہراتے رہیں گے۔ یہی عزم مجھے محمود شام کی اس کتاب میں نظر آتا ہے۔ مایوسی کے دور میں اس طرح کی مثبت فکر بہت تقویت پہنچاتی ہے۔ذرا سنیے محمود شام کیا کہہ رہے ہیں:

وقت سے جنگ کی عادت تھی' ابھی تک ہے وہی
زندگی ایک مشقت تھی' ابھی تک ہے وہی
دھوپ نے برف جمادی بھی ہے بالوں پہ تو کیا
دل میں احساس کی شدت تھی' ابھی تک ہے وہی

○

''نہتی لڑکی''

میں ملتان ایئرپورٹ پر اتر کر ایک رکشے میں بیٹھا ہوں ایک روز قبل اپنے عوامی ریفرنڈم کے سلسلے میں بینظیر بھٹو یہاں پہنچی ہیں رکشے والا بتا رہا ہے کہ بہت بڑا جلسہ ہوا جی ان کے والد کا جو جلسہ ہوا تھا وہ اس وقت بڑا جلسہ تھا لیکن یہ اس سے بھی بڑا جلسہ ہے جلسہ گاہ چھوٹی پڑ رہی تھی۔ رکشے والا جلسے کی اور بینظیر بھٹو کی تقریر کی تعریف میں رطب اللسان ہے بینظیر کا سفر جاری ہے اس ۳۳ سالہ دبلی پتلی نہتی لڑکی نے پورے ملک میں ایک ہلچل مچا دی ہے لاہور، گوجرانوالہ، فیصل آباد، جہلم، راولپنڈی اور پشاور میں لوگ جاگ اٹھے ہیں وہ جو کونوں میں سہمے ہوئے تھے خوفزدہ تھے سب باہر نکل آئے ہیں اور اپنے حق کے لیے نعرے بلند کر رہے ہیں کسی کے جانے کی بات کر رہے ہیں کسی کے آنے کی بات کر رہے ہیں شہر شہر بھٹو لہر ہے۔ بینظیر پاکستان کی تقدیر بینظیر قوم کی تقدیر ہر شہر میں یہ نعرہ گونج رہا ہے۔

رکشے والے سے میں پوچھ رہا ہوں کہ بینظیر کہاں ٹھہری ہے وہ بتا رہا ہے کہ بیگم نادرہ خاکوانی کے ہاں ہیں وہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رانا ممتاز احمد نون کے ہاں ٹھہری ہیں گھر کے باہر ایک ہنگامہ ہے کارکنوں کے لیے شامیانہ لگا ہوا ہے گھر کے اندر اتنی جگہ نہیں ہے پنجاب سے تعلق رکھنے والے سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے ارکان کی میٹنگ چل رہی ہے یہی منظر چند برس پہلے ہوتا تھا جب بھٹو مرحوم کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کارکن باہر جمع ہوتے تھے اندر میٹنگ چل رہی ہوتی تھی کچھ میٹنگیں ہم نے گیارہ سیاسی جماعتوں کے اتحاد والی دیکھی ہیں جن کی میٹنگوں میں جو بھی ہوتا ہے اندر ہی ہوتا ہے باہر کوئی کارکن نہیں ہوتے معلوم نہیں کہ ان جماعتوں کے کارکنوں کو اندر ہونے والی میٹنگ سے یا موضوعات سے دلچسپی نہیں ہوتی یا انہیں کارکنوں کا باہر جمع ہونا اچھا نہیں لگتا۔ بات تو یہ ہے کہ اگر اندر ہونے والے فیصلوں کا تعلق عوام سے ہو کارکنوں سے ہو تو انہیں دلچسپی بھی ہوتی ہے اور انہیں جاننے کی بے تابی بھی ہوتی ہے لیکن اندر جن موضوعات پر بات ہوتی ہے ان کا جب عوام سے تعلق نہ ہو تو انہیں دلچسپی ہی نہیں ہوتی۔

(''پاکستان پر قربان'' سے اقتباس)

○

''دل کے آنگن میں مہکتا ہے کوئی''

شاہدہ حسن (کراچی)

کل صبح عین اُس وقت جب ابھی میں آج کی اس تحریر کا آغاز ہی کر رہی تھی کہ میری نظر اخبار کے صفحات پر شائع اُس نمایاں خبر پر جا پڑی جس میں جناب محمود شام کے گھر ڈاکہ کی تفصیلات موجود تھیں۔ ساتھ ہی ڈاکوؤں کے نام لکھا ''شام جی'' کا وہ مکتوب بھی جو خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر رقم کیا گیا تھا اور ہمارے منافقانہ سماجی اور فکری نظام پر ایک بھرپور طنز کے مترادف تھا۔ ایک پل کے لیے تو جیسے میری ساری سوچیں منجمد ہو گئیں۔ مگر پھر میں ان تمام بکھرے ہوئے خیالات کو دوبارہ یکجا کرنے کی کوشش کرنے لگی جو شام صاحب جیسی درویش صفت' اور قوم و وطن اور اپنے بنیادی عقائد سے گہری وابستگی رکھنے والی شخصیت کے حوالے سے میرے ذہن کے مختلف گوشوں میں موجود تھے۔ مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ دل اچانک ایک عجیب سے اندیشے کی لپیٹ میں آ گیا۔ کہیں شام صاحب بھی ''ترکِ وطن'' کرنے کے بارے میں نہ سوچنے لگیں۔ رفتہ رفتہ سبھی جا رہے ہیں۔ کوئی کسی سمت' کوئی کسی سمت۔ آج سے کم و بیش بیس سال قبل جب اسّی کی دہائی میں میرے والدین کے گھر زبردست ڈاکہ پڑا تھا اور ڈاکہ ڈالنے والوں نے سنگین نتائج کی دھمکیاں دی تھیں تو نتیجتاً میرے والدین اور سارے کنبے نے یکا یک ترکِ وطن کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس فیصلے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اپنے پیاروں کی مسلسل جدائی نے میرے اندر کی حساس شاعرہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میٹھی نیندوں سے محروم کر دیا۔ آج بھی جب کسی گھر میں ڈکیتی کی واردات ہوتی ہے۔ مجھے Night mares آتے ہیں اور وہی سیاہ نقاب پوش چہرے' میرے وجود کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیتے ہیں۔

دراصل زندگی کے اس سفر میں' جب مختلف مواقع پر مجھے ملک سے باہر جانے کا موقع ملا تو اس حقیقت کا بھی ادراک ہوا کہ وطن ایک روح کی مانند ہوتا ہے۔ اپنے وطن کے وجود' اسکی سلامتی اور اس کی بقا کی تمنا، ہر انسان کی سائیکی سے اتنے گہرے انداز میں وابستہ ہوتی ہے جیسے بچہ' اپنی ماں کی کوکھ سے جُڑا ہوتا ہے۔

ترکِ وطن کی صورت میں لوگ اپنے جسم تو ہمراہ لے جاتے ہیں مگر روح اپنے وطن ہی میں چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ بات جتنی میرے مشاہدے میں ہے اُس سے کہیں زیادہ جناب محمود شام کے مشاہدے میں ہے جن کی ساری زندگی، بار بار غیر ملکی سفر پر جانے اور پھر سفر سے لوٹ کر اپنے وطن کی مٹی کو ایک نئی شدت کے ساتھ بوسہ دینے کی کیفیتوں میں گزری ہے۔ جناب محمود شام کی شخصیت کی کیمیا میں وطن سے گہری محبت کا عُنصر کچھ اس طرح شامل ہے کہ وہ

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

کے مصداق ہمیشہ تازہ آرزوؤں اور نئے ولولوں کی بات کرتے ہیں۔ ان کی ہر تحریر کے باطن سے خواہ وہ شعر کی صورت میں ہو یا نثر کی، یا کوئی کالم ہو یا رپورتاژ۔ کوئی انٹرویو یا سفرنامہ یا ناول۔ ایک آرزومندی، رجائیت اور نئی تمنا کی سرشاری جھلکتی رہتی ہے۔ انھوں نے خدا کی اس کائنات کو خوب گھوم پھر کر دیکھا ہے۔ مختلف معاشروں، تہذیبوں، انسانی گروہوں اور ان کی عملی کارگزاریوں سے واقف ہیں۔ نتیجے کے طور پر ایک ایسے Vision (وژن) کے حامل ہیں جو فردِ واحد کو تمام عالمِ انسانیت سے ہم رشتہ کر دیتا ہے اور اُس میں گدازیٔ قلب' اخلاص و رواداری اور احترامِ آدمیت کی اعلیٰ صفات بیدار کر دیتا ہے۔

اُن کے ساتھ اور اُن کے اہلِ خاندان کے ساتھ پیش آنے والے حالیہ افسوس ناک واقعے کی مذمت کرتے ہوئے میں جناب محمود شام کی خدمت میں رابندر ناتھ ٹیگور کی نظم کی یہ خوبصورت لائنیں پیش کرنا چاہوں گی۔

" Where the mind is without Fear
and the head is held High
Where knowledge is Free
Where the World has not been
broken up into fragments
Where words come out from
the depth of truth
Where tireless striving stretches
into arms towards perfection
Where the mind is led forward
by thee into ever widening
thought and action
Into that Heaven of Freedom
Let my country awake."

خواتین و حضرات! تہذیبی شہروں میں درندے گھُس بھی آئیں تو اُن کا کچھ زیادہ نہیں بگاڑ سکتے کہ ایسے شہروں کی بنیادوں میں کچھ ایسی مثبت اقدار اور توانا روایات کی بخشی ہوئی قوتیں موجود ہوتیں ہیں جو انھیں کمزور نہیں پڑنے دیتیں۔

تہذیبی شہروں کا اصل تعارف وہ علمی شخصیات ہوا کرتی ہیں جو اپنی فکری اور باطنی زندگی کے تقاضوں کو نہ صرف خود نبھاتی ہیں بلکہ اپنے حلقۂ اثر میں اُن تمام لوگوں کو بھی شامل کیے رکھتی ہیں جو اپنے انفرادی وجود کی معنویت کو

دریافت کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ بظاہر خاموش طبع مگر مزاج میں اضطرار کی بہت سی کیفیات چھپائے محمود شام مجھے صحافی سے زیادہ شاعر محسوس ہوتے ہیں۔ ماں کی آغوش میں چھپ کر بچپن کے ابتدائی دنوں میں ایک انجانے سفر پر روانہ ہونے والے محمود شام کی سماعتوں میں ایک مال گاڑی کی آواز آج بھی رچی بسی ہے۔ وہ مال گاڑی جس کے ڈبے پر کوئی چھت نہ تھی۔ چلچلاتی دھوپ تھی اور غلامی سے آزادی کی جانب دوڑتی معصوم زندگی، رستے بھر بلوائیوں، فسادیوں اور حملہ آوروں سے بچتی بچاتی جیسے خوابوں کے کسی نگر کی طرف جا رہی تھی۔ لاہور آیا تو آزاد وطن کی عطر بیز ہواؤں نے رخساروں پر بوسے دیے اور ہاتھ تھام کر ہمیشہ کے لیے اپنی کشادہ آغوش میں سمیٹ لیا۔ پاکستان کا خواب دیکھنے اور دکھانے والے قومی شاعر علامہ اقبال کی رہائش گاہ کے بالکل متصل ایک مہاجر کیمپ میں ڈیرے ڈال دیے۔ کچی مٹی پر سر رکھ کر، پہلی بار آزاد وطن کی سرزمین پر سوئے تو دل نے تہنیت دی کہ بس اب یہی جنت، مستقل ٹھکانہ اور آماجگاہ ہے۔ عمر کا ابتدائی حصّہ، ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال کی رومانوی داستانوں کے تحیّر انگیز شہر ''جھنگ'' میں گزرا۔ شیشم کے پیڑوں، پگڈنڈیوں، سرسبز کھیتوں کے بیچ تخلیق کی رعنائیوں کو دیکھا تو دل میں گداز اور کشادگی پیدا ہوئی۔ محمود شام کہتے ہیں:

مجھے چناب نے پالا تو سندھ نے سینچا
مرے مزاج سے دریا دلی کبھی نہ گئی

پھر محمود شام پگڈنڈیوں اور کچے راستوں سے نکل کر، دریائے چناب کی زرخیزیاں سمیٹتے ہوئے بالآخر سندھو دریا تک آ پہنچے اور بحیرہ عرب کی موجوں کے اتار چڑھاؤ سے وابستہ ہو گئے۔ یہیں سے دنیا کے مختلف گوشوں تک رسائی ہوئی اور عالمی معاشرے کی ظاہری اور باطنی تبدیلیاں ان کے مشاہدات کا حصّہ بنیں۔

ان پر لکھے گئے مضامین میں ارباب اقتدار کے اعترافات بھی شامل ہیں اور شام صاحب کے خاندان، ملازمت، تعلیم، تصانیف و تالیفات کے بارے میں تفصیلات بھی۔ مشاہیر کے مکتوبات بھی ہیں اور منفرد اور تاریخی تصاویر بھی۔ ان تفصیلات کی شمولیت نے ان کی شخصیت کی قدر و قیمت کا مستحکم کر دیا ہے۔

میں ان خوش نصیبوں میں ہوں جنہیں شام صاحب نے اپنی پہلی شعری کتاب ''کارڈیو سپازم'' اُن دنوں اپنے دستخط کے ساتھ دی تھی جب میں محض ایک طالبہ تھی اور شعر گوئی کے آغاز کے دنوں میں تھی۔ دنیا کو Dream World سمجھتی تھی اور اس کے رومانوی حُسن اور جمالیاتی کشش سے مسرتیں حاصل کرتی تھی۔ شام صاحب کی نظم پڑھی تو اسکی علامتی اہمیت پر بہت دیر تک سوچتی رہی۔ کارڈیو اسپازم ایک مرض، ایک ذاتی ابتلا جسے انسانی معاشرے کے حوالے سے شام صاحب نے ایک اجتماعی وژن کے ساتھ پیش کیا تھا اور دنیا کے نظام میں موجود طبقاتی فرق کو اجاگر کیا تھا۔ اُس وقت سے آج تک مجھے ان کی تمام پیرایۂ اظہار میں، معاشرے کے اجتماعی دکھوں کے مداوے کی یہی آرزو نظر آتی ہے۔

حضرت علیؓ نے کہا ہے جب کسی انسان کی عقل بڑھ جاتی ہے تو اس کی گفتگو کم ہو جاتی ہے۔ محمود شام کم گو اور نرم گفتار ہیں مگر تحریروں میں بلا کے ذہین، اور انتہائی فعال ہیں۔ حقیقت کا متلاشی ذہن مسلسل سوالات اٹھاتا ہے۔

کیوں ہوں، کہاں ہوں، کون ہوں اور کس لئے ہوں شام
مدت سے میں ہوں اپنے سوالوں کے سامنے

محمود شام کہتے ہیں:

وہ خامشی ہے کہ سب ہو گئے ہیں پتھر کے
یقیں نہ ہو تو کسی کو پکار کر دیکھو

معاشرہ منجمد ہو جائے، بے معنی چیخ و پکار بڑھ جائے، منافقانہ مکالمے عام ہو جائیں، دلوں کا نفاق، خوبصورت الفاظ میں ڈھل کر ڈسنے لگے، تو پورا ماحول بدنما ہو جاتا ہے۔ ایسے میں ایک سچا تخلیق کار، اصل مکالمے کی تلاش میں ہوتا ہے۔ محمود شام دریاؤں کے شہر سے نکل کر اب سمندر کے کنارے آباد اس شہر میں آ بسے ہیں۔ اسلئے ان کا باطنی وجود بھی بے شمار لہروں کے بیچ و تاب کی زد پر ہے۔

درد، فرقت، ملال اور راحت
شام یہ سب ہیں تیری تصویریں

کبھی کہتے ہیں۔

کچھ تو کہتی ہے سرِ شام سمندر کی ہوا
کبھی ساحل کی خنک ریت پہ جائیں تو سہی
شام یہ روشنی، یہ رنگ کے پھیلے ہوئے جال
اک ذرا ان کے طلسمات میں آئیں تو سہی

شہر کراچی کی محبوبیت کے حوالے سے کہتے ہیں:

شام اس شہر میں کیسے نہ لگے دل کہ جہاں
رنگ کے سیلِ رواں اور ہمیں پیاس بھی ہے

ایک اور کیفیت کو لکھتے ہیں:

شہر سے رہتی ہے اک جنگ مسلسل دن بھر
شہر جب ہانپنے لگتا ہے تو گھر جاتا ہوں

ان کے شعری لہجے میں ''یادیں'' اپنے رنگ بکھیرنے لگتی ہیں تو کہتے ہیں!

کبھی سایا، کبھی خوشبو بن کر
دل کے آنگن میں مہکتا ہے کوئی

لفظ، لہجہ، لمس لمحے سب اُسی سے مشکبار
ایک خوشبو ہے مرے احساس پر چھائی ہوئی

جھنگ کے پس منظر میں کہی ہوئی اس ابتدائی غزل میں مظاہر فطرت اور انسانی

محسوسات کے باہمی رشتے کے حسن کو پیش کرتے ہیں۔

عمر گزری کہ تری دُھن میں چلا تھا دریا
جا بجا گھومتا ہے آج بھی پگلا دریا
بنتی جاتی ہیں گہر کتنی ہی بھولی یادیں
یہ مرا دل ہے کہ ٹھہرا ہوا گہرا دریا
تھل کے سینے پہ پگھل جاتی ہے جب چاند کی برف
دور تک ریت پہ بہتا ہے سنہرا دریا

محمود شام کی تصانیف میں ''شب بخیر'' کی صورت میں مکالماتی انداز میں لکھا وہ تاثراتی ناول ہے جسمیں پاکستان کی سیاسی تاریخ کے تاریک پہلوؤں پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ ''مملکت اے مملکت'' جیسی قابل قدر تصنیف میں فکر کو مہمیز کرتے ہوئے ایک اجتماعی سماجی شعور کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

علمائے کرام، اہلِ تدریس، زمینداروں، جاگیرداروں، ناظمین شہر، خفیہ اداروں، امریکہ اور برطانیہ کے نام لکھے جانے والے ان خطوط میں پاکستان کے Survival اور قومی بقاء کے حوالے سے انتہائی اہم سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ قومی زندگی کے حوالے سے ''امریکا کیا سوچ رہا ہے'' جیسی اہم تصنیف میں محمود شام نے موجودہ زمینی حقائق کے ضمن میں ایک دور اندیش اور محبِ وطن قلم کار کے نقطۂ نظر کو انتہائی اخلاص کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اب آخر میں میں اپنی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے جناب محمود شام کا یہ شعر دہراتے ہوئے آپ سے رخصت طلب ہوں گی کہ

سارے عہد کا بوجھ تھا سر پر، دل میں سارے جہان کا غم
وقت کا جلتا بلتا صحرا، ہم نے جس دم پار کیا

(سہ ماہی ''عبارت'' کے محمود شام نمبر کی تقریب پذیرائی میں پڑھا گیا۔)

''بندھے ٹکے الفاظ''

کراچی میں جب ویزا لینے برطانوی ڈپٹی ہائی کمیشن جانا ہوا تو ابتدائی جائزہ لینے والی برطانوی خاتون میرے پاسپورٹ کی ورق گردانی کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ میرے سفر صرف جمہوری دور میں رہے ہیں۔ مارشل لاء کے گیارہ سال میں کوئی اندراج نہیں ہے۔ پھر 6 اگست 1990ء کے بعد بھی کوئی سفر نہیں ہے۔ اس لئے اس کے لبوں پر یہ سوال آیا کہ کوئی وجہ کہ آپ پاکستان ہی نہیں آئیں۔

میں نے کہا کہ میں باہر کیوں رہوں گا۔ میرا سب کچھ یہاں ہے۔

اس خاتون کو یہ جواب پسند نہیں آیا۔

میرے سوال کا جواب دیجئے۔

میں نے کہا کہ ایسی کوئی وجہ نہیں کہ میں پاکستان واپس نہ آؤں۔

یہ جواب خاتون کو درست لگا۔ نوکر شاہی کہیں کی بھی ہو، برطانیہ کی، یا ہماری۔ انہیں ایک جیسی زبان چاہئے۔ اور بندھے ٹکے الفاظ۔ ویزا سیکشن میں برطانیہ والے بھی تو پولیسیوں کو ہی بھیجتے ہیں۔ کوئی اسکالر تو نہیں آتے۔ جو زبان کا تنوع جانتے ہوں۔ لوگوں کو پہچانتے ہوں۔

برطانیہ کا ویزا ان دنوں سب سے مہنگا بھی ہے۔ اور مشکل بھی۔

یہ جو کبھی ہم پر حکمرانی کرتے تھے۔ اب ہماری ویزا فیس کے محتاج ہیں۔ ویزا سے انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن ویزا فیس واپس نہیں کرتے۔

(''برطانیہ میں خزاں'' سے اقتباس)

''بے تاج بادشاہ''

چوہدری شجاعت حسین صدر پاکستان مسلم لیگ..... ملک کے بے تاج سیاسی بادشاہ ہیں۔ صدر جنرل پرویز مشرف ان کی بہت قدر کرتے ہیں۔

''جناب صدر، میں جسٹس افتخار محمد چوہدری کو آپ سے ملوانا چاہتا ہوں۔''

''کیوں چوہدری صاحب۔''

''چیف جسٹس ناظم حسین صدیقی ریٹائر ہو رہے ہیں۔ ان کی جگہ انہیں مقرر کیا جا سکتا ہے۔''

''آپ چیف آف اسٹاف کو بتا دیں اور آ جائیں۔''

''اسٹاف میں کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔''

''دیکھ لیں، چوہدری صاحب۔ میرا ملنا کیا ضروری ہے۔''

''آپ سے ملاقات ضروری ہے تا کہ ذاتی طور پر آپ کی ان سے شناسائی ہو جائے۔''

''جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ چوہدری صاحب کل شام 7 بجے مل لیتے ہیں۔''

(اپ سیٹ 2008 سے اقتباس)

''بند گنبد میں آزادیٔ افعال''

شمشاد احمد (کراچی)

محمود شام اپنی ریش مبارک کے ساتھ دنیائے صحافت میں ایک بڑا نام ہیں۔ انھوں نے یہ شہرت اور عظمت اپنے اندر کے مظلوم شاعر کا گلا گھونٹ کر کمائی ہے۔

تیسری دنیا کا فن کار چھوٹا ہو یا بڑا۔ فن اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اسے زندہ رہنے کے لیے کسی نہ کسی کو ٹھوکا بیل بننا پڑتا ہے۔ شاعر محمود شام نے صحافت کر لی۔

جب اُن کا شعری مجموعہ ''نوشتہ دیوار'' شائع ہوا اُس وقت صحافی محمود شام سنٹرل جیل حیدر آباد میں سچ بولنے کی سزا بھگت رہا تھا۔ اس طرح ''نوشتہ دیوار'' تقسیم و تشہیر کے مراحل سے نہ گزر پائی اور اکثر احباب تک تو اس کی پیدائش کی مٹھائی تک نہ پہنچی۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے اتفاقاً میرے ہاتھ لگ گئی۔ میں نے عادتاً جلدی جلدی ایک ہی نشست میں صاف کر ڈالی۔ اور ڈھیر میں ڈال دی لیکن ذہن میں، کہیں گہرائی میں ہلکی ہلکی کھٹ پٹ ہوتی رہی۔ مجبوراً ایک بار پھر ذرا اطمینان سے مطالعہ کرنا پڑا۔

''میں تحقیق میں ہوں'' کے ٹائیٹل تلے دس نظموں کا ایک گلدستہ ہے۔ یہ نظمیں الگ الگ عنوانات کے باوجود آپس میں مربوط ہیں اور ان میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ ایک مرکزی خیال ارتقائی منازل طے کرتا ہوا، روایتی ڈرامے کی صورت نقطۂ عروج تک پہنچتا ہے پھر پھوار کی مانند بکھر کر ہر سو پھیل جاتا ہے۔

ان نظموں میں ایک ہیرو ہے اس کے سامنے بڑا واضح آدرش ہے۔ اس آدرش سے ہٹانے والی ہر دنیاوی مصروفیت اس کی ٹھوکر کی زد میں ہے۔ خصوصاً گھٹیا دنیاوی آسائشوں کے پیچھے اندھے چوہوں کی اندھی دوڑ، انسانی خون پسینے کے گارے سے وجود میں آنے والی بلند و بالا عمارات، سڑکوں پر دوڑتا ہوا مصروفیت کا بے مقصد جنگل۔ ہیرو یہ سب کچھ دیکھتا ہے اور ان پر حقارت کے تیر برساتا، کبھی ان پر کڑھتا، کبھی روشنی کا پیغام دیتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اُسے اپنی منزل کا پوری طرح سے ادراک ہے۔ اور اُسے اپنے بالکل سامنے اونچے پہاڑ کی چوٹی پر چمکتی روشنی بالکل صاف اور واضح نظر آ رہی ہے۔

یہ سوشلسٹ آرڈر کا سپاہی ہے۔ خلوص، لگن اور اپنے مقصد کی سچائی پر یقین محکم اس کا سرمایہ ہیں۔

سوشلسٹ نظام کے داعی اور سب سے پہلی سوشلسٹ ریاست تباہ و برباد ہو چکی ہے۔ اس کی شکست و ریخت کی وجوہات کچھ بھی ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب تک استحصالی نظام اور اس کے گماشتہ زندہ ہیں یہ سپاہی زندہ رہے گا۔ محمود شام اس سپاہی کو نئے انسان کا نام دیتے ہیں۔

انسان کب، کیوں اور کیسے اس کرۂ ارض پر وارد ہوا؟

آسمانی کتابوں میں ان سوالوں کا ضرورت سے زیادہ سیدھا سادا حل موجود تھا اور جدید سائنس اور فطری ذہن سے بے بہرہ ذہن اسے آنکھیں بند کر کے قبول کر لیتا ہے۔

قادر مطلق کے ایک اشارے پر کائنات عالمِ وجود میں آئی۔ آدم و حوا کی تخلیق ہوئی۔ ساتھ ہی اُن کی تخلیق کا مقصد بھی متعین کر دیا گیا۔ ہر چیز اُوپر سے آئی، اس لئے انسان کی تقدیر ایک طے شدہ امر قرار پائی۔ انسان کے لیے ایک دائرہ کار مقرر کر دیا گیا تھا، وہ صرف اور صرف اس دائرے کے اندر متحرک رہ سکتا تھا۔ اس صورت میں روبوٹ کا احتساب کیسا؟

جزا اور سزا کیا معنی؟

بند گنبد میں آزادیٔ افعال کیسی؟

اس مسئلے کی آڑ لے کر استحصالی گروہوں نے انسان کا خوب خوب استحصال کیا۔ دنیا بھر کی نعمتیں صرف اپنے لئے مخصوص کر لیں۔ معاشی طور پر مظلوم طبقے کی معاشی بدحالی، اُن پر ہونے والے ظلم، ان کی جبری زبان بندی۔ سب کچھ خدا کی طرف سے ان کے گناہوں کی سزا قرار دی جاتی رہی۔

استدلال کے پجاریوں نے ان مسائل کا جدید سائنسی انداز میں جائزہ لیا اور ان آسمانی فرمودات کو یکسر رد کر دیا۔

کائنات کا وجود ایک کائناتی حادثے کا مرہون منت قرار پایا۔ حضرت انسان کو ایک ارتقائی سلسلے کی کڑی تسلیم کیا گیا۔ اس طرح سپریم خالق کے تصور کی مکمل نفی ہو جاتی ہے۔ انسان ایک خود کار روبوٹ کی بجائے ایک باشعور زندہ اکائی قرار پاتا ہے۔ یہی نہیں انسان چاند کی انجانی سرزمین کو اپنے مقدس قدموں سے روند آیا ہے۔ مریخ تک رسائی ہو چکی ہے۔ سولر سسٹم کے دوسرے سیارے بھی زد میں ہیں۔ اور کتنی کہکشائیں حضرت انسان کی منتظر بیٹھی ہیں۔

اب تک کی تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ اکثر سیارے یا تو بیحد گرم ہیں یا پھر اتنے ٹھنڈے کہ درجہ حرارت کی حد تک ان میں زندگی کی پیدائش اور نمو نا ممکن ہے۔ وسیع و عریض درمیانی فاصلوں میں کچھ مقامات ضرور ہوں گے۔ جہاں معتدل درجہ حرارت کے امکانات ہوں۔ لیکن زندگی کی بقا کے لیے دو دوسرے عناصر۔ پانی اور ہوا کا بیک وقت معتدل درجہ حرارت کے ساتھ موجود ہونا لازمی ہے۔ اور اس خوشگوار حادثے کے آثار کہیں نہیں پائے جاتے۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس لامنتہا کائنات میں صرف اور صرف اس کرۂ ارض کو

انسان کو وجود بخشنے اور اس کی نمو اور بقا کا شرف حاصل ہے۔ اور انسان اس بحرِ بیکراں میں واحد باشعور مخلوق ہے۔

''میں تحقیق میں ہوں'' کی پہلی نظم ''میں اپنے لیے ہوں''۔ انسان کی اس عظمت اور اہمیت کا اعتراف ہے۔

''میں ہوں اور تحقیق میں ہوں۔
کہ میرے لئے سب سے کامل سچائی یہی ہے
کہ میں تو فقط خود کو محسوس کرتا ہوں''

پرانے روایتی تصوّرات کو رد کر کے انسان ایک بے بس کھلونے کی بجائے ایک جیتی جاگتی' باشعور اکائی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اب وہ ہر بری بھلی بات سُپر پاور کی طرف منسوب نہیں کرتا کیونکہ وہ اپنے آپ کو اس کی تخلیق ہی نہیں تسلیم کرتا۔ خیر و شر اس کے اندر سے پھوٹتا ہے' وہ اس دنیا میں اپنے اردگرد خوش رنگ پھولوں کی فصل بوتا ہے تو اس کا کریڈٹ خود اسے جاتا ہے اور اگر وہ اس حسین دنیا کو خون اور پیپ سے بدرنگ کرتا ہے تو بھی وہ خود ہی اس کا سزاوار ہے۔ اب وہ جو کچھ ہے خود ہے اور خود کے لیے ہے۔ وہ اپنے گناہ شیطان کے سر تھوپ کر بری الزمہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح وہ اپنی خوبیوں اور اچھائیوں کے لیے بھی کسی خارجی طاقت کا محتاج نہیں۔

''میری ساری اچھائیاں اور بدیاں بھی میری ہیں
میں ان میں سے نہیں ہوں
جو ابلیس پر اپنے سارے گناہوں کا الزام دھرتے ہیں
اور خوبیوں کو کسی کا کرشمہ سمجھتے ہیں

اور میں ایک خاکہ ہوں:
جس میں مجھے آپ ہی رنگ بھرنے ہیں
خوشبو بسانی ہے
میں ہوں
میں اپنے لیے ہوں!''

اگلی نظم ''میں اپنے لہو کا پیاسا نہیں ہوں'' شاعر کی تنہائی کا مرثیہ ہے:

اس کے اردگرد معروف زندگی کا رواں دواں جنگل ہے۔ ایک بے پناہ شور ہے۔ انسان چیونٹیوں کی طرح اپنی ضروریات اور اغراض و مقاصد کے سمندر میں غوطے کھاتا ہے۔ اندھا بہرا' قابلِ قدر زندگی کے دن بتا رہا ہے۔ اس کے سامنے کوئی منزل' کوئی روشنی نہیں' ماضی میں بھی ان کے آباؤ اجداد تاریک صدیاں فروعی خواہشات کے زنداں میں مقید گزار کر خاک کا رزق بن گئے۔ اس طرح اشرف المخلوقات کیڑوں مکوڑوں کی طرح صرف لمحہ لمحہ جی رہا ہے۔

شاعر ان زندہ لاشوں پر متاسف بھی ہے۔ اس کے دل میں ان کے لیے رحم کا جذبہ بھی موجود ہے' حیرانی بھی ہے۔ یہ لوگ کیسے بے خبر لوگ ہیں! سانس کی نازک ڈوری کٹ رہی ہے' کٹتی چلی جا رہی ہے اور یہ زندگی کے کیچڑ میں لت پت' مگن' گہری نیند میں زنداں کے چکر کاٹ رہے ہیں اور ستم یہ ہے کہ وہ اس بے خبری میں خوش اور مطمئن ہیں۔ اس طرح یہ لوگ قدم قدم پر انسان کی عظمت سے بے خبر اس کی تحقیر اور تذلیل کر رہے ہیں۔

''میرے اب وجد
دوست
بھائی بہن اب تو سارے ہی لہروں کے قابو میں ہیں
اور مصیبت تو یہ ہے کہ وہ سارے خوش ہیں

کچھ نہیں ہیں' ہماری حقیقت ہے کیا
ہم تو مٹی کے چند ذرّے ہیں''

بڑے مقاصد کو یکسر بھول کر۔۔۔۔ اور پس پشت ڈال کر انسان خوبصورت گاڑیوں' خوبصورت گھروں' خوبصورت کھلونوں جیسی بے حقیقت اور بے معنی اشیاء کے ڈھیر میں دفن ہو کر خود اپنی عظمت کی نفی کر رہا ہے۔ آنے والی نسلوں' اُن کی بقا اور ان کی خوشحالی' اُن کے مسائل کی طرف اس کی کوتاہ نظر نہیں جاتی۔

ادھر دوسری طرف ہر نیا آنے والا لمحہ نئے مسائل کے انبار لے کر آ رہا ہے۔ روایتی نظریات اور افکار کے پاس ان مسائل کا کوئی حل نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو یہ صدیوں کے انبار یوں جمع نہ ہو پاتے۔

''ہر ایک آتے لمحے کا دامن نئی اُلجھنیں پیش کرتا ہے
نئی الجھنوں کے لیے اب نئی روشنی چاہیے۔''

نیا انسان ان حالات سے قطعاً مطمئن نہیں ہے۔ وہ نئی الجھنوں کے لئے نئی روشنی کی تلاش میں ہے۔

نیا انسان تنہا اس لئے ہے کہ وہ جمِ غفیر سے مختلف ہے اس کی سوچ' اس کا زندگی کا کانسپٹ (Concept) مختلف ہے۔ محض زندگی کا آسائشیں اس کا مطمحِ نظر نہیں ہے۔ اس کے لیے یہ سب بے معنی اور بے رنگ ہیں۔ یہ جمِ غفیر بند آنکھوں' بند کانوں' بند ذہن' محض سانس لینے کی حد تک زندہ ہے۔ دراصل عرصہ ہوا اس کی موت واقع ہو چکی ہے اور وہ خود اپنا قاتل ہے اس نے اپنے ہاتھوں خودکشی کی ہے۔ نیا انسان نہ صرف زندہ ہے۔ وہ خود اپنے لئے زندہ ہے۔ وہ کسی خارجی طاقت کی خوشنودی یا اس کے خوف کے زنداں میں قید نہیں ہے۔ وہ مکمل طور پر آزاد ہے۔

''اپنے لئے آپ ہی روشنی ہوں
ستارے ہوا چاندنی کچھ نہیں''

میں زندہ ہوں۔ میرا وجود ہے تو سب کچھ ہے۔ میں نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اس لئے کہ مُردوں کے شہر میں صرف میں زندہ ہوں۔

''اگر میں ہوں تو سب کچھ موجود ہے
ورنہ یہ گونجتی زندگی کچھ نہیں''

آسمانی تخلیقی تھیوری کے ماننے والے اور اپنے زخموں کے لیے مرہم اور اپنی آشتی اور الفت ستاروں میں ڈھونڈنے والوں سے وہ اپنا تالا مکمل پر توڑ چکا ہے۔ وہ ان ساری کوششوں کو محض خود فریبی اور صریح دھوکہ سمجھتا ہے۔

''ان کی ساری تگ و دو خودکشی تھی۔
میں وہ نہیں ہوں''

''ہوسٹل ٹک شاپ میں'' پھر اسی خیال کا اعادہ ملتا ہے۔

انسان نے اپنے اردگرد اپنی سوچ کے اردگرد آہنی سرحدیں کھینچ کر اپنے آپ کو محدود کر لیا ہے۔ وہ اپنی زنگ آلود ذہنی صلاحیتوں کے باعث تاریک قبر سے باہر آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا' صدیوں کی فرسودہ سوچ نے اُسے مفلوج کر دیا ہے۔

شاعر سارت کے حوالے سے بیانگِ دہلی اعلان کرتا ہے کہ وہ اس مُردہ سمندر میں مل کر اپنے آپ کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔ وہ اپنی راہ الگ بنا چکا ہے۔ وہ اس اجتماعی خودکشی میں کسی صورت شامل ہونے کو تیار نہیں ہے۔

''میں اپنے لئے آپ سب کچھ ہوں
میں سمندر میں ملنے کا قائل نہیں ہوں''

بعض جگہ غلط فہمی ہونے کا امکان ہے کہ محمود شام کا ہیرو صرف اور صرف اپنی ذات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، اسے اپنے سوا کسی اور چیز سے سروکار نہیں ہے۔ لیکن یہ محض غلط فہمی ہی ہوگی۔ وہ اپنے وجود کا احساس شد و مد سے بار بار اس لئے جتا رہا ہے کہ مردہ معاشرے کی ہر اکائی بھی اپنے اپنے وجود کی اہمیت کا احساس کرے اور اس وجود کی تمام تر صلاحیتوں اور قوتوں کو بروئے کار لا کر کہنہ نظام کو بدلنے کی سعی کرے اور نئے نظام کی بنیاد رکھے جس میں انسان بھرپور شعور سے اپنی ذمہ داری پوری کرے گا۔

یہ نظمیں یقیناً سویٹ روس کی شکست و ریخت سے پہلے کی ہیں۔ الفاظ میں جوان تڑختا خون دندناتا' گرجتا سنائی دیتا ہے ایک وقت تھا کہ متوسط اور نچلے طبقے کا ہر پڑھا لکھا نوجوان اشتراکی خیالات سے متاثر ہو کر آگ برساتا پھرتا تھا۔ ماسکو' ہنوئی' لیبیا اور بغداد اس کے نعرے ہوتے تھے۔ محمود شام بھی کافی عرصہ جوان رہے ہیں۔ مجھے اُن کی سیاہ ریش اچھی طرح یاد ہے۔

اس حادثے کے بعد اکثر اشتراکی منہ چھپا کر کونوں کھدروں میں جا بیٹھے ہیں۔ داہنے ہاتھ والے اس تباہی کو اشتراکی سوچ اور اشتراکی نظام کی تباہی گردان کر خوب بغلیں بجا رہے ہیں۔ یہ اسٹالن' خروشیف' برزنیف اور گاربوچیف کی ناکامی تو ہو سکتی ہے۔ اشتراکی سوچ کی شکست کسی صورت نہیں ہے۔ آج بھی ہیونائٹس (Have Nots) جگمگاتے شہروں کے غلیظ فٹ پاتھوں پر نسلیں بسر کر رہے ہیں۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں میں جانوروں سے چھینا جھپٹی کر کے روزکار رزق تلاش کرتے ہیں۔ نزع کے عالم میں اکثر کو دوا دارو تو ایک طرف صاف پانی کا ایک گھونٹ نصیب نہیں ہوتا۔ دوسری طرف چند ہاتھوں میں اتنی دولت مرکوز ہو گئی ہے کہ اس کی نمائش کے مواقع کم پڑ جاتے ہیں۔ استحصالی نظام پہلے سے بھی زیادہ مضبوط اور کڑی زنجیروں سے انسان کو جکڑے ہوئے ہے۔

وقتی طور پر مساواتِ انسانی کا نعرہ دب گیا ہے، مرا نہیں۔ اور کسی بھی موزوں موقعہ اور وقت پر' کس بھی نام سے ایک بار پھر تند و تیز سیلاب کے دھارے کی مانند۔۔۔۔ ساری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔

محمود شام کا ہیرو یا نیا انسان نئی جنگ کے لیے تیار رہے گا۔

''ایشیائی جسم تھرک رہے ہیں''

ایشیائی لڑکے لڑکیاں بھی اب انگریز لڑکے لڑکیوں سے پیچھے نہیں رہے ہیں۔ ان کی شکلیں، ان کے لباس تو یہ بتاتے ہیں کہ وہ مقامی باشندے نہیں ہیں۔ لیکن ان کی آنکھوں کی شرارت بھری پتلیاں، مقامی حسیناؤں کی شرارت بھری پتلیوں سے مختلف تو نہیں ہیں۔ وہ انداز، وہی تیور، رقص کے طور بھی ان سے مختلف نہیں ہیں۔ انہوں نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی ہے۔ اسی لئے انہوں نے وہی کچھ سیکھنا تھا جو سکھایا جاتا ہے۔ اب اس نسل کے واپس وطن جانے کے بھی امکانات نہیں۔ کیونکہ وطن میں وہ بالکل اجنبی ہوں گے۔ وہ اسی سرزمین کا حصہ ہیں یہاں کی تہذیب ان کی تہذیب ہے۔ یہاں کی روایات ان کی روایات ہیں۔ ایشیائی جسم تھرک رہے ہیں۔ کالے گندمی، سلونے، نمکین چہرے چمک رہے ہیں۔ بتیاں جل بجھ رہی ہیں۔ ان میں پاکستانی بھی ہیں بھارتی بھی۔ بنگلہ دیشی بھی اور سری لنکن بھی۔

(''برطانیہ میں خزاں'' سے اقتباس)

''جب کبھی خون میں ڈوبی مٹی''

ڈاکٹر محسن مگھیانہ (جھنگ)

کائنات یقیناً بہت بڑی ہے مگر جو کائنات ادیب یا شاعر اپنے من میں بساتے ہیں وہ کوئی کم وسیع تو نہیں ہوتی۔ من میں بسی یہ کائنات لکھاری کے داخلی اور خارجی جذبات واحساسات سے مرقع ہوتی ہے۔ کہیں رومان کا حسین چاند اپنی چاندنی بکھیر رہا ہوتا ہے تو کہیں دم دار ستارے خیالات کی روشنی لئے اٹکھیلیاں کرتے پھرتے ہیں۔ ایسی ہی ایک کائنات محمود شام نے اپنے اندر بسا رکھی ہے۔ جگ مگ کرتے تاروں کی روشنی اور چاند کی ٹھنڈی میٹھی چاندنی سے مزین یہ کائنات محمود شام کی آنکھوں میں جھانک کر ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

ہمیں زندگی میں روزانہ ایسی کئی شخصیات سے ملاقات کا موقع ملتا ہے جو بظاہر بڑے کُنوں والی ہوتی ہیں اُنکی ذات پہ کئی جعلی خول چڑھے ہوتے ہیں جو بظاہر اُن کی شخصیت کو چمکدار بناتے ہیں اور لوگ پہلی نظر میں ان کی طرف کھچے چلے آتے ہیں مگر جونہی ان کے اوپر سے خول پیاز کے چھلکوں کی طرح اُترنے لگتے ہیں تو ان چھلکوں کے اندر سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوتا۔ اُن کی شخصیت ریت کے محل کی طرح نیچے آ گرتی ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو اوپر سے تو شاید اتنے چمکیلے دکھائی نہ دیتے ہوں مگر وہ سیپ میں بند موتیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ اسی دوسری قسم کی شخصیت محمود شام کی ہے۔ اُن کی صلاحیتوں کے ایک ایک در کو کھولیں تو اندر ذہن میں چھپے علم کے خزانے اور دل میں چھپی محبتوں کی دولت کے ڈھیر منکشف ہوتے ہیں۔

محمود شام کبھی ایک جرأت مند صحافی کی صورت میں سینہ سپر نظر آتا ہے تو کبھی اس میں بہت بڑا سیاسی مبلغ جاگ اٹھتا ہے۔ جوں جوں شام کے سائے گہرے ہوتے جاتے ہیں چاند بادلوں کی اوٹ سے جھانکتا ہے توں توں محمود شام کے اندر کا شاعر جاگ جاتا ہے۔ اسے مختصر بات کرنی ہو تو غزل کا سہارا لے لیتا ہے۔ لمبی بات کرنا چاہے تو طویل نظم کہہ لیتا ہے یا پھر ''شب بخیر'' جیسا شہرہ آفاق ناول تخلیق کر چھوڑتا ہے۔ وہ سیاسی شخصیات سے ملتا ہے تو اُن کے روبرو بیٹھ کر ''ون ٹو ون'' ریشو Ratio سے بات کرتا ہے۔ بیمار بھی ہوتا ہے تو قلم کو توانا رکھتا ہے اور کارڈیو سپازم Cardiospasm جیسی خوبصورت طویل نظم اس کے بستر کے سرہانے جنم لیتی ہے۔

وہ دنیا کے جھمیلوں میں اتنا الجھ گیا ہے کہ اب شاید اس کے پاس اپنے لیے بھی وقت نہیں مگر جب کبھی بھی اپنے گاؤں لوٹتا ہے تو ''واپسی'' جیسی خوبصورت نظم اس کے لبوں پر لفظوں میں ڈھل کر قرطاس ابیض پر یوں پھیل جاتی ہے کہ اُس کے اندر کا ورجن Virgin انسان بول اُٹھتا ہے

میرے گاؤں کے اونچے پیڑو
دیکھو میری جانب دیکھو
آخر آج میں لوٹ آیا ہوں
ذرا دہکتے جسم پہ میرے اپنا ٹھنڈا سایا ڈالو

میرے گاؤں کی جسم چراتی گلیو!
دیکھو
میں بھی تمہارا ایک پرانا ساتھی ہوں
اب بھی تمہاری ریت کی خوشبو
میرے لہو میں شامل ہے

میرے گھر کی رنگ بھری دیوارو!
دیکھو آؤ مجھے پہچانو
یوں تو مجھ سے آنکھ نہ پھیرو
میں تو وہی ہوں
وہی الجھتے بال ہیں میرے
وہی دہکتی آنکھیں ہیں

یونہی لپکتی خوشبوؤں کے پیار میں
اپنا آپ گنوایا
میرا اندر سلگ رہا ہے
ذرا مجھے سینے سے لگا لو
اپنے سندر دل میں بسا لو
مجھے بھی اپنے جیسا بنا لو

محمود شام نے جھنگ سے لاہور اور پھر کراچی کا سفر کیا تو شہروں کی تند و تیز روشنیوں میں کھو گئے مگر ان کا دل جھنگ میں اٹکا رہا تبھی تو کہنے لگے۔

شہروں کا شور کر گیا ہے بے خبر مجھے
میں کون ہوں؟ بتا تو سہی میرے گھر مجھے
میں اور ہو گیا ہوں کہ دنیا بدل گئی
حیرت سے تک رہے ہیں سبھی بام و در مجھے

اُنہیں تیز رفتار زندگی میں بہہ کر سکون کھو جانے کا احساس اس شدت سے ڈسنے لگا کہ کہہ اُٹھے

کھنچے پھرے ہیں شہر کی سڑکیں تمام دن
ڈستی ہے چارپائی مری رات بھر مجھے

میں دور ہو گیا ہوں بہت اپنے آپ سے
اب اور تیز روشنی گھائل نہ کر مجھے

محمود شام جب اپنی زندگی کے سفر کو پلٹ کر اک نظر دیکھتے ہیں تو لکھتے ہیں۔

''یہ سفر پنجاب کے ایک چھوٹے سے شہر سے شروع ہوتا ہے۔ جھنگ جس سے ہیر رانجھے کی رومانی داستان وابستہ ہے۔ ریت کے ٹیلے، ہرے بھرے پیڑ۔ اداس اداس خاموش گھروندے، محنت اور عزم کے جذبات لئے چہرے، سات سات پردوں میں لپٹا ہوا حسن۔ اپنے آپ سے بے خبر الہڑ مٹیاریں، چپ چاپ زندگی کا سفر طے کرتی نہریں، سردیوں میں اپنے وجود کو بچانے کی کوشش کرتے اور گرمیوں میں دوسروں کا وجود مٹاتے دریا، کناروں پر گھنے گھنے پیڑوں کے چھتنار بیلے، تاحد نظر پھیلے ریت کے ٹیلے جہاں رات کو چاندنی بکھرتی ہے تو لگتا ہے کہ ایک سنہرا دریا بہہ رہا ہے۔ بوڑھے درخت جو دن میں چھاؤں بخشتے ہیں اور رات کو عمر رفتہ کی کہانیاں سناتے ہیں۔

یہاں نہ تیز روشنیاں ہیں نہ آنکھیں چندھیاتی ہیں، نہ حسن بالکل بے نقاب ہوتا ہے۔ تخیل کو ہر وقت جلا ملتی ہے۔ ذہن سوچوں کے وسیع و عریض سبزہ زاروں میں ہرنیوں کی طرح قلانچیں بھرتا پھرتا ہے۔''

محمود شام نے خود کو قدرت اور فطرت کے جتنا قریب جھنگ میں پایا اتنا بڑے شہروں میں بس کر یہ اعجاز حاصل نہ کر سکے تبھی تو اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں

''میں یہ اعتراف کروں گا کہ جھنگ جیسے پسماندہ شہر میں جتنی غزلیں کہیں اتنی لاہور کراچی میں نہیں کہہ سکا۔''

بظاہر تو زندگی کا یہ سفر محض تلاش روزگار کا ایک ذریعہ ہی لگتا ہے مگر انسان کی بے چین روح اسے کہیں بھی سکون نہیں لینے دیتی۔ محمود شام بھی ساری عمر اپنے آپ کو کھوجنے میں برسرپیکار رہے ہیں۔

کس کے لیے ہو؟ کون ہو؟ کیا شے ہو؟ کہاں ہو؟
صدیوں سے میرا سایہ مجھے پوچھ رہا ہے

شاید یہی وجہ ہے کہ محمود شام کی کسمساتی روح کبھی صحافی کے بدن میں گھُس جاتی ہے تو کبھی شاعر یا ادیب کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ ایسے میں خود محمود شام اپنے ہی وجود میں سمٹا سمٹایا ایک طرف کھڑا اپنے آپ کا جائزہ لے رہا ہوتا ہے۔ اپنی معصومیت اور محبت کے بہتے شیرے سے اپنی انگلی بڑے مزے سے چاٹ رہا ہوتا ہے۔ اُس سے نفرت دیکھی ہی نہیں جاتی۔ وہ انسان تو کیا مٹی کا بھی دکھ برداشت نہیں کر پاتا۔ شہر کراچی جب آنسوؤں میں ڈوبا ہوتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے

جب کبھی خون میں ڈوبی مٹی
بن گئی عہد کی سرخی مٹی
وطن کی محبت اُن کی رگوں میں بسی ہے تبھی تو کہتے ہیں
جانے کس دیس کی آغوش ملے
ساتھ رکھتے ہیں وطن کی مٹی

ویسے تو حب الوطنی کے ثبوت کے لیے کسی سند کی ضرورت نہیں ہوتی اور انسان کے اندر کے جذبات ہی اس کے عکاس ہوتے ہیں جیسے کہ محمود شام دوسرے دیس میں جا کر بھی وطن کی مٹی کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ اُن میں اس سچے اور سُچے جذبے کی شدت دیکھ کر ہی انہیں ''بھارت میں بلیک لسٹ'' کیا گیا۔ اُن کے اس جذبے کے عکاس وہ تمام انٹرویوز ہیں جو انہوں نے مقتدر سیاسی شخصیات کے کئے۔ ذوالفقار علی بھٹو سے لے کر آج کے لیڈرز تک کھنگال ڈالے مگر اُن کے سوال آج بھی جواب کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔

''روبرو'' کے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں۔۔۔

''آج سے ۴۱ سال پہلے میں نے جب میٹرک کر کے گورنمنٹ کالج جھنگ میں انٹر میں داخلہ لیا۔ میرے ذہن میں اس وقت بھی یہی تھا ہم پاکستانی۔ قوم کب بنیں گے''

اس کا جواب ایک صبح جنرل ایوب خان کے مارشل کی صورت میں ملا سوچا۔ ممکن ہے اب ہم واقعی پاکستانی قوم بن جائیں۔

میں اپنے لیکچرارز سے یہ سوال کرتا تھا۔ ذہن اس پیاس سے جھلستا رہا۔ جھنگ کے تپتے دہکتے ریت کے ٹیلوں سے ہم اونچے برجوں والے شہر لاہور جا پہنچے۔

سوال پھر یہی رہا۔

میں نے ممتاز ادیبوں۔ فلسفے کے اساتذہ، ماہرین تعلیم سے یہی سوال پوچھنا شروع کر دیا۔ ہم پاکستانی قوم کیسے بن سکتے ہیں!

پھر بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ لگا سب ایک ہو گئے ہیں۔ ہم نے اس روز جانا کہ سوال کا جواب مل گیا ہے پھر تاشقند میں ایک میز پر دستخط ہوئے۔ آوازیں بلند ہوئیں ہم پھر بٹ گئے۔ پاکستانی پھر ایک قوم نہیں رہے تھے۔۔۔۔

یحییٰ خان کے دور کا ذکر کرتے ہیں

''یہ آزادی صحافت کا بے مثال دور تھا۔ ہمارے ابتدائی انٹرویو زیادہ تر اسی دور میں ہوئے تھے۔ کروڑوں پاکستانیوں کی طرح ہم بھی بے خبر تھے کہ پس پردہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہونے ہوالا ہے۔ ہم بڑے خلوص سے پہاڑوں میں گھرے ایبٹ آباد میں نئی نئی ختم ہونے والی ریاست سوات میں، سندھ کے ریگ زاروں میں، بلوچستان کے خشک پہاڑوں میں، پنجاب کے میدانوں میں

مشرقی پاکستان کی گنجان بستیوں میں یہ سوال کرتے پھر رہے تھے:

''پاکستانی قوم کب بنیں گے، کیسے بنیں گے''

ہمیں قطعاً احساس نہیں تھا کہ اس کا وقت گزر چکا ہے۔

روبرو کے طویل پیش لفظ کے آخر میں دکھ بھرے لہجے میں کہتے ہیں

میری آنکھیں آج بھی پیاسی ہیں
روح آج بھی تڑپ رہی ہے
ہم پاکستانی قوم کب بنیں گے؟

''روبرو'' محمود شام کے ان انٹرویوز کی کتاب ہے جن میں اُن کے سوال تشنۂ جواب رہے۔ یہ ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جس میں ذوالفقار علی بھٹو، مولانا عبدالحمید بھاشانی، شیخ مجیب الرحمٰن، مولانا مفتی محمود، خان عبدالولی خان، اصغر خان، جی ایم سید اور بے نظیر بھٹو سمیت ایسے بہت سے اہم سیاستدانوں کے انٹرویوز ہیں جہاں محمود شام کی ان تحریروں میں درد دل اور حب الوطنی کا جذبہ جھلکتا ہے وہاں ان کے اندر چھپا ادیب بھی جا بجا جھات کرتا نظر آتا ہے۔ منظر کشی میں حقیقت نگاری اُن کا خاصہ ہے۔ ذرا نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ مولانا عبدالحمید خان بھاشانی کا ۱۹۶۹ء کا انٹرویو دیکھئے

''فضاؤں میں بسی دھان کی خوشبو دل میں اترے جا رہی ہے۔ تنگائیل پچاس میل دور رہ گیا ہے۔ سرسبز کھیتوں اور ہرے پانیوں میں گھری اردو غزل کے محبوب کی تنگ کمر کی طرح بل کھاتی سڑک پر، مشرقی پاکستان میں اردو کے شاعر اور فلمساز سرور بارہ بنکوی کی شیور لیٹ تیز تیز دوڑ رہی ہے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ پانی ہے یا سونا اُگلتے کھیت اور دریا۔ اپنے دامن میں انسانوں کو بسائے جھونپڑیاں۔ مغربی پاکستان کی طرح ایک چپہ بھی غیر آباد نہیں۔ کھیتوں کی آغوش بھری ہوئی ہے مگر انسانوں کے شکم خالی ہیں۔ خالی آنکھوں، بھرے تالابوں، بجھے چہروں، چمکتے کھیتوں، ننگے پیروں، گھنے پیڑوں، سوکھے جسموں اور بھرے خوشوں میں سے ہوتے ہم سنتوش کی طرح رواں ہیں۔ تنگائیل آ گیا ہے۔ کامگاری چار میل ہے۔ اب کچا راستہ ہے۔ ہم احتیاطاً گاڑی چھوڑ کر سائیکل رکشا سے یہ فاصلہ طے کر رہے ہیں۔ یہ اونچا نیچا راستہ..... جہاں بیل گاڑیوں کے پہیوں کے نشان ثبت ہیں۔ یہیں سے امریکہ اور برطانیہ کے کتنے رپورٹرز گزرے ہیں۔ گورنر احسن بھی اسی ناہموار راہ سے آئے تھے۔ سائیکل رکشا والا تصدیق کیلئے ایک راہ گیر سے دریافت کر رہا ہے۔ ''بھاشا فیر باڑی ایکھاتے۔۔۔۔!''

محمود شام کے قلم سے ادبی گوہر ہر سو چمکتے نظر آتے ہیں۔ ہر سو لفظ ہاتھ باندھے کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ مولانا عبدالحمید خان بھاشانی سے ملنے جاتے ہیں تو ان کا حلیہ ایسے لفظوں میں بیان کرتے ہیں جو ایک مشّاق، ماہر اردو دان اور زبان پہ مکمل عبور رکھنے والا ہی کر سکتا ہے۔

''مغربی پاکستان کے فلک بوس پہاڑوں پر گرتی ہوئی برف کی طرح سر کے سفید بال، مشرقی پاکستان کے مسائل کی طرح پھیلی اور آبادی کی طرح گنجان ڈاڑھی، ۸۷ برس سے دنیا کے نشیب و فراز دیکھ دیکھ کر تھکی ہوئی آنکھیں، رنگ بوڑھی گنگا کے پانی کی طرح سیاہی مائل، لہجے میں حوصلوں کی گونج، گفتگو میں صدیوں کی وسعت، مسائل پر گہری نظر، کسی کی تعریف نہ تضحیک، لباس سادہ، چمک دمک سے بے نیاز کوئی نیاز مند تک نظر آیا!''

محمود شام کو چاہے آپ صف اوّل کا صحافی کہہ لیں یا ادیب، ناول نگار کہہ لیں یا پھر دل میں گھر کرنے والا ''خواتین و حضرات'' کہتا مقرر یا پھر خوبصورت نظم گو شاعر.....غزل ہی اُن کی پہلی اور آخری محبت ٹھہری۔ اس محبت کو بھول نہ پانے کی وجہ بہت بڑی ہے۔ آج غزل کی ہی بدولت وہ اس مقام پہ پہنچے ہیں۔ غزل نے ہی انہیں محمود شام کے نام کی نہ صرف شناخت دی ہے بلکہ ایک روشن مستقبل دیا ہے۔

یہ کہانی نو روپے چودہ آنے کی ہے۔ لیل و نہار میں غزل میں چھپنے کا اُس وقت معاوضہ دس روپے ہوا کرتا تھا جب محمود شام بی اے پاس کہلایا۔ دو آنے منی آرڈر کے کٹتے تھے۔ ان نو روپے چودہ آنے کی وجہ سے وہ لاہور کا ٹکٹ لے پایا تھا جہاں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر نذیر احمد نے انہیں محض اس لئے گود لے لیا کہ وہ ماہ نو میں محمود شام کی غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ اُنہوں نے محمود شام کی ایسے انگلی پکڑی جیسے کسی ننھے سے بچے کو سیر کے لیے باہر لے جاتے ہیں مگر وہ تو اُسے کالج کی محرابوں میں سے گزار کر خواجہ ذکریا، پروفیسر صدیق کلیم اور قیوم نظر سے ملوانے لے جا رہے تھے۔

پھر محمود شام نے ڈاکٹر نذیر احمد کے اس پیار کی ایسی لاج رکھی کہ آج اُن کا مقام کسی سے مخفی نہیں مگر یہ سب اُس غزل کا مرہونِ منت ہے جس کا اگر معاوضہ انہیں نو روپے چودہ آنے کی صورت میں نہ ملتا تو وہ آج محمود شام نہ ہوتے۔ محض محمد طارق محمود بن کر جھنگ سٹی کی گلیوں میں بھٹک رہے ہوتے اور گا رہے ہوتے۔

چہرہ چہرہ مری کہانی
آنکھوں آنکھوں بکھر رہا ہوں

محمود شام نے جہاں بھی وقت بسر کیا اپنی یادیں چھوڑیں

چاند تارے جب آنگن سے گزرتے ہوں گے
شام وہ لوگ ہمیں یاد تو کرتے ہوں گے

وہ جب ''محلوں میں سرحدیں'' قائم ہوئی دیکھتے ہیں تو کہہ اُٹھتے ہیں

جب چلے تو ایک تھے ہم، پھر جدا کس نے کیا
ترے مرے درمیاں یہ فاصلہ کس نے کیا

محمود شام صحافت میں جرأت و بے باکی کا سمبل ہے۔ اپریل ۱۹۷۰ میں پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کی قیادت میں صحافیوں کی ملک گیر ہڑتال ہوئی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان میں نور وز تک کوئی اخبار شائع نہ ہوا۔ پھر کیا ہوا کہ اُن کے بعض ساتھیوں نے غداری کی مگر وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔

وہ اور اُن کے ساتھ دو سو مرد مجاہد صحافی ملازمتوں سے برطرف کر دیئے گئے۔ اُنہیں بھی اخبار جہاں سے نکال دیا گیا..... انہوں نے باطل کے آگے سر جھکانا گوارا نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے روزگار کا کوئی اور سبب بنا دیا لیکن بالآخر وہ پھر جنگ گروپ کی طرف لوٹ آئے اور پھر وہ کٹھن وقت بھی آیا جب روزنامہ جنگ کی نواز شریف حکومت سے کھلم کھلا جنگ ہوگئی۔ حکومت وقت کے سامنے کلمہ حق کہنا بڑے حوصلے کی بات ہوتی ہے لیکن محمود شام نے یہ حوصلہ کیا۔ جب حکومت نے سمندری جہازوں پر پڑا اخباری کاغذ روک دیا تو محمود شام بنفس نفیس اپنے ساتھیوں سمیت اپنے حصے کا اخباری کاغذ لینے کیلئے پہنچ گئے۔

ایسے مشکل حالات میں ایک بار پھر اُس کے ذہن میں وہی سوال گونجنا شروع ہوا تھا۔

''ہم پاکستانی۔ قوم کب بنیں گے.....''

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ یہی سوال محمود شام کی طرح ہماری ذہن میں بھی بچپن سے گونج رہا ہے۔ ہم نے بھی کلمہ حق کہنے کی سزا بھگتی اور اپنی سالانہ خفیہ رپورٹ المشہور رائے سی آر خراب کروا بیٹھے البتہ نوکری سے نکالے جانے سے کئی بار بال بال بچ گئے۔ اُن میں اور ہم میں جھنگوی ہونے اور ادیب ہونے کی قدر بھی جہاں مشترک ہے وہاں اُن جیسے تو نہیں البتہ ٹوٹے پھوٹے چند شعر ہم بھی لکھ لیتے ہیں۔ کچھ عرصہ کالم نگاری بھی کی یوں ''ماڑے موٹے'' صحافی بھی ہیں مگر جس محبت کے فقرے میں ہمیں مرحوم سید ضمیر جعفری جوڑ گئے وہ ایک تاریخی رشتہ قرار پایا ہے۔ سید ضمیر جعفری نے کراچی آرٹس کونسل میں دیسی ان ولایت کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

''ہمیں محسن مگھیانہ کی مونچھیں اور محمود شام کی داڑھی پسند ہے''

تب سے محمود شام کو ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ نہ ہو کہ کرے مونچھوں والا اور پکڑا جائے داڑھی والا۔ لیکن یقین مانیے حقیقت تو یہ ہے ہم دونوں ہی بیمار ہیں اس لئے کہ اس معاشرے میں کلمہ حق کہنے والا ذہنی مریض ہی تو کہلاتا ہے۔

محمود شام نے اس ذہنی کیفیت کو کچھ اس طرح سے لفظوں کا روپ دیا:

کتنی صدیاں ہوئیں جھکنے نہیں دیتا ہے ضمیر
پاس دریا ہے مگر تشنہ کھڑا رہتا ہوں

☆

''شکار کا مزہ''

''چھوکرا۔''
''جی سائیں۔''
''سب انتظام مکمل ہے۔''
''جی سائیں۔''
''پریذیڈنٹ صاحب۔ دونوں شکار کھیلتے ہیں۔''
''جی سائیں۔''
''تمہیں کیسے پتہ ہے؟''
''جی سائیں۔ وہ اے ڈی سی نے مجھے فون کیا تھا۔''
''اچھا۔ کیا کہا تھا اس نے''
''سائیں۔ اس نے بتا دیا تھا۔ کچھ تیتر بھی پرکاٹ کے رکھنے ہیں۔ اور کچھ گھگھیاں بھی سنبھال کر رکھنی ہیں۔''
''اڑے واہ پریل۔ تم تو ہم سے بھی سیانے ہوگئے۔ گھگھیاں کدھر سے منگوائیں''
''سائیں۔ کراچی سے۔ وہ اپنی پارٹی کی کلچرل سیکریٹری ہے نا۔ اسے فون کر دیا تھا۔ اس نے پانچ چھ گھگھیاں بھیج دی ہیں۔''
''پریل۔ ہمیں تو کبھی اس کلچرل سیکریٹری نے کوئی پرندہ نہیں بھیجا۔''
''سائیں۔ وہ کہتی ہے۔ سائیں نے کبھی موقع ہی نہیں دیا۔ سائیں کو انگریزنیوں سے ہی فرصت نہیں۔''
''یہ بھی اچھا مذاق ہے۔ چلو خیر۔ یہ بات بعد میں کریں گے ابھی تو انتظام پر نظر رکھو۔ میں جاتا ہوں ایئر پورٹ۔ پریذیڈنٹ کو لینے۔''
''ہاں سائیں۔ وہ اے ڈی سی نے بولا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی دوست بھی آ رہی ہے کرن۔''
''اچھا۔ یہ بولا تھا۔ کرن آ رہی ہے۔''
''سائیں وہ کہتا تھا۔ اس کا خاص خیال رکھنا ہے۔ اسے جس کمرے میں ٹھہرانا ہے۔ وہاں سے کہیں اور نہیں جانے دینا۔''
''پریل۔ تم اسے اس بازو والے کمرے میں ٹھہرانا جہاں سے ایک دروازہ ہمارے بیڈ روم میں کھلتا ہے۔''
''سمجھ گیا سائیں۔ اے ڈی سی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔''
''اب پریل۔ شکار کا مزہ آئے گا۔ یہ کرن بڑی خاص قسم کی پکھی ہے۔''
''اچھا سائیں آپ فکر ہی نہ کرو۔

(''شب بخیر'' سے اقتباس)

ایک لمحۂ وصال

جناب محمود شام کے کلام سے انتخاب دوئم

فیصل عظیم (کینیڈا)

چلتے چلتے کار کے شیشوں سے یونہی جھانکنا
اس پہ دعویٰ ہم مزاج شہر سے ہیں آشنا

زندگی کتنی حسیں ہے کسقدر رنگین ہے
پرل کی لابی میں اک دن بیٹھ کر یہ دیکھنا

حسن کو چھونا کلفٹن پر ہوا کا دفعتہً
ریت کے ذرّوں کا پھر دیوانگی سے جھومنا

میکدے تھے شہر میں رونق بھی تھی ہنگامہ بھی
رات بھر فٹ پاتھ پر وہ چاندنی کو چھاننا

ایمپریس کے نام کردے زندگی کی ایک شام
تو نے دیکھا ہی نہیں ہے خواہشوں کا ہانپنا

ریگ ساحل کھلیں جیسے چمن اندر چمن
کیکٹروں کی کھوج میں وہ مہ وشوں کا بھاگنا

استعارے اور تشبیہیں کراچی میں بھی ہیں
اک ذرا آنکھیں کھلی ہوں شامؔ دل ہو آئینہ

(۱۹۹۲)

ایک الجھے ہوئے سوال کی گرد
زندگی ہے فقط ملال کی گرد

لوٹ آتا تھا بھولپن تیرا
میں ہٹاتا تھا ماہ وسال کی گرد

آسماں ہے مری نظر کا فریب
کہکشاں ہے مرے خیال کی گرد

شہر کی روشنی ہیں اب وہ جنہیں
مل گئی تھی ترے جمال کی گرد

علم ہے صرف جستجو کی تھکن
آگہی صرف اندمال کی گرد

جاہ ومسند سے ماورا ہوں میں
سارے منصب مرے کمال کی گرد

وقت کی قید سے نکل کر دیکھ
نورِ فردا ہے جستِ حال کی گرد

کشف۔وجدان۔معرفت۔عرفاں
ایک مجذوب کے جلال کی گرد

سب یہ ہنگامہ ہائے رنگ وبو
شامؔ اک لمحۂ وصال کی گرد

(۱۹۹۴)

مسلک کی دہشتیں

کچے گھروں کو غسل
مکینوں کے خون سے
دیوانہ وار رقص پھر
پورے سکون سے
دیوار و در پہ نقش ہیں
مسلک کی دہشتیں
ذہنوں میں دندناتی ہیں
بدمست وحشتیں

وحدانیت کے نام پر
مخلوق منقسم
جذبات کی کدال سے
بنیاد منہدم

افکار کی تراش
عقائد کی نوک سے
کیا نسل اگ رہی ہے
ہدایت کی کوکھ سے

(۱۹۹۸)

○

پھول بن کر تری ہر شاخ پہ کھلتا میں تھا
خوشبوئیں تجھ میں اترتی تھیں مہکتا میں تھا

میری سانسوں میں گھلی تھیں تری صبحیں شامیں
تیری یادوں میں گزرتا ہوا عرصہ میں تھا

شور تھا جیسے سمندر میں ہو گرتا دریا
اور جب غور سے دیکھا تو اکیلا میں تھا

عہد رفتہ تھا ادھر اور اُدھر آئندہ
دونوں وقتوں کو ملاتا ہوا لمحہ میں تھا

رات کی گود میں سر رکھ کے زمیں سو جاتی
صبح تک چاند کے سینے میں دھڑکتا میں تھا

اپنی ہی آگ میں جب لوگ جھلسنے لگتے
سب کے ہونٹوں پہ دعا بن کے ابھرتا میں تھا

جس پہ دریا نے کناروں سے بغاوت کر دی
بارش خون کا وہ آخری قطرہ میں تھا

آنکھ رکھتا تھا کھلی اور طبیعت موزوں
تجربے دوسرے کرتے تھے سنورتا میں تھا

(۲۰۰۱)

ہر نظر پیار تو ہر لب پہ ہنسی مانگتے ہیں
ہم تو ہر مانگ ستاروں سے بھری مانگتے ہیں

پھول تو خوب ہی لگتے ہیں جہاں چاہیں کھلیں
ہم تو سرحد بھی گلابوں سے لدی مانگتے ہیں

ہم بھی کیا لوگ ہیں نفرت کے شجر بو بو کر
آسمانوں سے محبت کی جھڑی مانگتے ہیں

ان کی رہ تکتی ہے تاریخ بھی بے چینی سے
سربلندی کو جو نیزے کی انی مانگتے ہیں

غیر اڑنے کو بھی کرتے ہیں فضا تازہ تلاش
ہم کہ رہنے کو بھی اک اندھی گلی مانگتے ہیں

سب کو سلطانیٔ جمہور کا دعویٰ ہے مگر
اختیارات بہ اندازِ شہی مانگتے ہیں

یہاں گلیوں نے مری ماں سے دعائیں چھینیں
واں محلّے مری بہنوں سے خوشی مانگتے ہیں

یہاں دریا مرے پرکھوں کے لہو سے کھیلے
واں سمندر مرے بچوں کی بلی مانگتے ہیں
(۲۰۰۳)

اعلیٰ سطحی میٹنگ

فضائے شہر میں پہلے تو سائرن گونجے
پھر آسمان وزمیں پر مہیب سنّاٹا
ہر ایک راستہ گھیرا تھا پہریداروں نے
یہ حکم تھا کہ سبھی اپنے اپنے گھر میں رہیں
فقط مجاز فرشتے محل میں پہنچے تھے
تمام اہلِ تسلط ہی آج یکجا تھے
ہر ایک سابق وحاضر کی خاص دعوت تھی
کہا گیا کہ سبھی آج کھل کے بات کریں
سب اپنے اپنے جرائم کا اعتراف کریں

پھر ایسے ایسے جرائم کا انکشاف ہوا
ان اجتماعی گناہوں کا اعتراف ہوا
کہ جن کی سخت سزائیں تو لوگ پا بھی چکے
صلیب اپنے ہی شانوں پہ خود اٹھا بھی چکے
پولیس نے جن میں ملوث کیا تھا اوروں کو
عدالتوں نے بھی پھانسی لگائی اوروں کو
کھلا یہ راز کہ جو مقتدر ہے مجرم ہے
یہی کہ شہر میں جو محترم ہے ملزم ہے
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی
(۲۰۰۴)

خدا کے حضور

میں تھا خدا کے پیش یا خود کے حضور تھا
کچھ کھل سکا نہ ۔ پورا حرم نور نور تھا

جلوے اتر رہے تھے مری سانس سانس میں
ہر انگ میرے جسم کا محوِ سرور تھا

لمحے سمٹ رہے تھے مگر فاصلے نہیں
میں جتنا اپنے پاس تھا اتنا ہی دور تھا

صدیاں گزر رہی تھیں مرے دائیں بائیں سے
میں تھا کہیں شعور کہیں لاشعور تھا

مینار کہہ رہے تھے بلندی ہے عاجزی
ہر باب عاشقی کا مسلسل وفور تھا

محدود جن کا علم تھا وہ بھی تھے با مراد
وہ بھی جنہیں علوم پر کامل عبور تھا

کتنے ہی دائروں میں رواں تھیں عقیدتیں
آنکھوں میں ایک عجز، جبیں پر غرور تھا

اپنے وجود میں تھا کبھی بارہا نہیں
حیران کن وقوعِ غیوب وظہور تھا

(۲۰۰۶)

○

یوں جو کم دام ہوئے چشمِ خریدار میں ہم
اس سے بہتر تھا کہ آتے ہی نہ بازار میں ہم

وہ تو دیوار گرانے سے ہی مل سکتی تھی
جواماں ڈھونڈتے تھے سایۂ دیوار میں ہم

عمر تو کاٹ دی اس شوخ کی دلداری میں
وقت آیا تو شمارے گئے اغیار میں ہم

تیر دشمن پہ چلاتے تھے ترے نام سے بھی
یاد رکھتے تھے تجھے عرصۂ پیکار میں ہم

اشک گرتے تھے کراچی کے تو ہم چنتے تھے
گرچہ کچھ اور ہی منصب پہ تھے دربار میں ہم

طبلِ صلح بجانے پہ ہی مجبور ہے تو
ایسے پیوست ہوئے ہیں تری تلوار میں ہم

جسم جھلسے ہوئے دل کرب میں روحیں زخمی
سرخیاں کیسی لگاتے رہے اخبار میں ہم

ناخدا دور کنارے پہ کھڑے دیکھتے ہیں
شامؔ پہلے کی طرح آج بھی منجدھار میں ہم

(۲۰۰۷)

○

باجوڑ

وادیاں اجڑی ہوئی ہیں۔ دھڑکنیں رکتی ہوئی
ہمتیں گھٹتی ہوئی ہیں۔ رحمتیں روٹھی ہوئی

غیر کے میزائلوں سے منہدم آبادیاں
بچیوں کی درسگاہیں، اپنے ہاتھوں لیے نشاں

آگ، شعلے، دھجیاں، بے چینیاں، بے خوابیاں
بم دھماکے، دھمکیاں، چیخیں، لہو کی ندیاں

آسماں تکتے بڑھاپے۔ ریزہ ریزہ بچپنے
خودکش و قاتل جوانی۔ موت ہر پل سامنے

پک اپوں میں لادلی ہیں گٹھڑیوں میں حسرتیں
روتے بچے، کھانستی ماں، چادروں میں عزتیں

بھیڑ، کپڑے، چارپائی، چاہتیں، مایوسیاں
لے کے نکلے ہیں کہ اب ڈھونڈیں کہیں جائے اماں

چاند جیسی بچیاں دہشت سے گہنائی ہوئی
پوچھتی ہیں اہل پاکستان سے روتی ہوئی

لاالہ کے وارثو! یہ کونسا ہنگام ہے
در بدر لاکھوں مسلماں، کیا ہی اسلام ہے
(۲۰۰۸)

○

اپنی بقا کی جنگ

ہم لڑ رہے ہیں اپنے وطن کی بقا کی جنگ
اس مملکت سے اہل چمن سے وفا کی جنگ
یہ جنگ راہ راست ہے راہ نجات ہے
شدت پسند سوچ کی یکسر فنا کی جنگ

آئے ہیں بھائی چھوڑ کے جنت سی وادیاں
خیموں میں لے رہی ہیں پنہ مائیں بیٹیاں
سب کی خدا سے التجا ہے امن بخش دے
اک بار پھر سے لہلہائیں اپنی کھیتیاں

بھٹکے ہوؤں کو پھر سے ہدایت نصیب ہو
بازار کارخانوں کو برکت نصیب ہو
مایوس خاندانوں کو الفت نصیب ہو
پیارے نبی کی سب کو شفاعت نصیب ہو

مذہب کے پاک نام پر معصومیت کا قتل
دانش وقار آگہی جمہوریت کا قتل
دین مبیں ہے خون بہانے سے روکتا
اک آدمی کا قتل ہے انسانیت کا قتل

دنیا کو ہم بتائیں گے اسلام امن ہے
قرآن اور حدیث کا پیغام امن ہے
اللہ کا ارشاد ہے سب کی سلامتی
دنیا میں آج بہتریں انعام امن ہے

آگے بڑھو مجاہدو اب قوم ساتھ ہے
دہشت سرے سے ختم ہو اب قوم ساتھ ہے
بے گھر بزرگ نوجواں محسن ہیں ملک کے
پوری ہر اک مراد ہو اب قوم ساتھ ہے
(۲۰۰۹)

''صلیب اپنے ہی شانوں پہ''

عطیہ سکندر علی (سکھر)

مسٹر محمود شام کی کتاب ''کارڈیو اسپازم'' ترقی پذیر اقوام کا المیہ ہے، ایسی شاعری کرنے کی ضرورت ہے جس میں قوم کے درد کو اپنا سمجھا جائے، ملک کے درد کو اپنا درد سمجھ کر محسوس کیا جائے، نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ ایسی ہی شاعری کریں جس میں انسانیت کی بھلائی کا درس ملتا ہو، جیسی شاعری محمود شام نے کی ہے۔ نظر آتا ہے کہ ملک کی اقتصادی نظام میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ جب پاکستان کو طاقت ور بنایا جائے گا، عوام کی حالت کو بہتر بنایا جائے گا تو حقیقت میں یہ پاکستان اور اسلام کی خدمت ہوگی۔ لیکن اگر عوامی امنگوں پر غور نہیں کیا گیا۔ پاکستان کو اقتصادی سطح پر مضبوط نہیں کیا گیا تو سمجھیے کہ آپ نے کچھ حاصل نہیں کیا۔ میں یہی جذبہ لے کر میدانِ عمل میں اترا ہوں، اور عوام کو اس خواب کی تعبیر دکھا دینا چاہتا ہوں جو انھوں نے قیامِ پاکستان کے وقت دیکھا تھا۔ مسٹر محمود شام جیسے نوجوانوں کی ہمت افزائی اور حوصلہ افزائی کرنے کی ضرورت ہے جنھوں نے قوم کے درد کو اپنے درد کے جیسا سمجھا اور دیکھا۔ یہ جذبہ قابل قدر جذبہ ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو

محمود شام سینئر صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسے دانشور ادیب اور شاعر ہیں جو اپنی تخلیق میں فکر بھی رکھتا ہے اور درد بھی رکھتا ہے۔ جس طرح انھوں نے صحافت میں سچائی دکھائی ہے اور خبر کو اشتعال انگیز بنانے کی خود سے کبھی کوشش نہیں کی بلکہ خبر کو اس کی حقیقتوں تک محدود رکھا ہے۔ اسی طرح ہمیشہ سچا شعر کہنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے شاعروں کو مقابلے میں محمود شام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کی شاعری قدیم روایت اور جدید تجربات کا امتزاج نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری تغزل سے مالا مال ہے۔ ''چہرہ چہرہ میری کہانی'' میں شامل بیش تر غزلیں میری رائے کی تصدیق کرتی ہیں اور اس بات کی بھی تصدیق کرتی ہیں کہ شاعری میں ان کا ایک منفرد اسلوب ہے۔ اس جدا اسلوب میں وہ اشعار بھی ملتے ہیں جو دیہی اور شہری زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ایسی فکر اور ایسی تحقیق نوجوان شعراء کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

مولانا کوثر نیازی

کوچۂ صحافت میں ہم رکاب رہنے، کوچۂ سخن میں ہمہ صفات نکلا۔ ہم ان میں سے تھے جو آسان چیز کو اختیار کر لیتے ہیں، محمود شام ان میں سے ہے جو مشکل کو بھی آسان کر لیتا ہے۔ جو شخص اپنے منصب کی ذمہ داریوں سے پوری طرح گزر رہا ہو اور مطمئن بھی ہو وہی دیگر ذہنی اور علمی مشاغل کا حق ادا کرنے کا سوچ سکتا ہے۔ ہم تو صحافت کے ایسے ہوئے کہ نہ طنز کے رہے نہ مزاح کے۔ یہ رنگ بھی کوچۂ صحافت میں بکھیر دیتے ہیں۔ لیکن محمود شام بہت سنبھل کر صحافت کا حق بھی ادا کرتے ہیں اور بہت جم کر شاعری کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔

ابراہیم جلیس

ہم نے سب سے پہلے شام کو شاعری کے جلو میں دیکھا، پھر ان کی نثر کو دیکھا اور پھر خود ان کو دیکھا اور دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اب یہ بڑے نامی گرامی جرنلسٹ ہیں۔ ملکوں ملکوں گھوم چکے ہیں۔ دنیا بھر کے لیڈروں سے انٹرویو کرتے ہیں۔ تحریر بڑی دل پذیر ہے۔ بعض لوگ اپنے قلم کو لہو میں ڈبو کر لکھتے ہیں۔ کم از کم کہتے یہی ہیں اور ان کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک جو اپنے لہو میں ڈبو کے لکھتے ہیں اور دوسرے جو دوسروں کے لہو میں ڈبو کے لکھتے ہیں۔ پھر کچھ ایسے ہی قلم کو ملکھن میں ڈبو کے لکھتے ہیں۔ ان کی زندگی بڑی چکنی اور آسودہ گزرتی ہے۔ محمود شام اپنے قلم کو دو پیسے کی سیاہی میں ڈبو کے لکھتے ہیں۔ ان کی پہلی کتاب '' کارڈیو سپازم'' بڑی معنی آفریں کتاب تھی۔ کارڈیو سپازم اور آخری رقص ہمارے محمود شام کے جلالی روپ تھے، کتاب چہرہ چہرہ میری کہانی ان کا جمالی روپ ہے۔ محمود شام بہت بہروپ بھرتے ہیں لیکن ذرا سا کریدیے تو اندر سے شاعر بلکہ غزل گو برآمد ہوتے ہیں۔ غزل ان کی زندگی ہے۔ اور غزل بھی وہ جو اپنے منفرد انداز و احساس کے باعث اپنی الگ پہچان رکھتی ہے۔

ابن انشاء

جناب محمود شام کی گراں قدر شعری مجموعے ''قربانیوں کا موسم'' کی اشاعت اور اس کی خوبصورت اجرائی تقریب پر میں انہیں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ ساتھ ہی بے حد سپاس گزار ہوں کہ ادب کے اس بڑے تاریخی اجتماع کی صدارت کے لیے انھوں نے مجھے دعوت دی۔ جناب محمود شام کی مخلصانہ دعوت پر بہ رضا و رغبت اور بہ سُرور و مسرت اس فریضے کی ادائیگی کے لیے میری آمادگی اُن کی شاعرانہ اور صحافیانہ بڑائیوں کے اعتراف ہی میں ہے۔ بلاشبہ وہ بڑے شاعر اور صحافی ہیں۔ اور اُن کے درویشانہ صفات و خصائل کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا حقیقت پر مبنی ہے کہ شام صاحب ایک بڑے انسان ہے۔

محشر بدایونی

''شب بخیر'' ایک ایسی تصنیف ہے جو ہمارے پچھلے ۲۰، ۲۵ برس میں حکومتوں پر اندر ہی اندر اثر انداز ہونے والے عناصر کے عجیب و غریب منظر دکھاتی ہے۔ میں نے درخواست کی اور کرتا ہوں کہ کوئی اہل دل صاحب حکم وہ مختصر سی تاریخ ہی رقم کر دے جب ایسے مناظر کی جھلکیاں تک پیدا نہیں ہوتی تھیں جو ''شب بخیر'' کے ہر صفحے پر رقص کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب ادبی تو ہے مگر مکالموں پر صحافیانہ انداز غالب ہے۔ شاید یہ ناگزیر ہو کہ یہ اپنی وضع کی ایک منفرد تصنیف ہے۔

جمیل الدین عالی

جھنگ شہر میرے بچپن میں بستا ہے۔ اسی شہر میں دو چھوٹے بچے ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ ان کے گھر شہر کی مخالف سمتوں میں واقع تھے۔ ان

بچوں کے باپ پرانے دوست تھے۔ایک کا نام ماسٹر چراغ دین تھا اور دوسرے کا صوفی شیر محمد۔دونوں کی دوستی مشرقی پنجاب کی ریاست پٹیالہ سے چلی آ رہی تھی۔ہجرت کے بعد دونوں جھنگ شہر میں آباد ہوئے۔شہر کے وسط میں ایک بازار کے اندر دونوں نے قریب قریب دکانیں کھولیں۔دونوں دوستوں کے بیٹوں نے کڑے کوس کاٹ کر اس دوستی کا تسلسل آج بھی برقرار رکھا ہوا ہے۔ ماسٹر چراغ دین کے بیٹے نذیر ناجی اور صوفی شیر محمد کے بیٹے محمود شام کی اس دوستی کے درمیان کیا کیا نشیب و فراز آئے اور دونوں دوست اُن سے کس طرح نبرد آزما ہوئے وہ کہانی اپنے اندر الگ داستان سمیٹے ہوئے ہے۔

نذیر ناجی

شام صاحب مہذب و شائستہ انسان، مہربان دوست اور عمدہ شعر کہنے والے شاعر کے طور پر پاکستان کے حلقوں میں عزت و احترام کے حامل ہیں۔میں سمجھتا ہوں صحافت کے روز و شب نے ان کی شاعری کو اُس طور پنپنے کا موقع نہیں دیا جس کا تقاضا اُن کے اندر چھپا شاعر اُن سے کر رہا ہے۔

شہریار

محمود شام کے دل میں سیاسی اور ادبی محاذ کی بے شمار خبریں اور اسکنڈل ہوتے ہیں مگر وہ شخص عجیب ہے۔سارا دن خبروں کے درمیان رہنے کے باوجود بہت کم بولتا ہے۔شعر کہنے میں بھی ظفر اقبالیت نہیں ہے۔ملاقاتوں میں بھی مشاہد حسینیت نہیں ہے۔میری طرح بالوں میں کلر نہیں لگاتا۔بڑی گریس کے ساتھ عمر کے بڑھتے ہوئے زینے پر قدم رکھ رہا ہے۔نامانوس کو مانوس بنانے کی ہوس نہیں رکھتا۔ایک طرح کو درویشیت ہے جو محفلِ خرابات میں بھی اس کے دھیمے پن کو آنچ نہیں دکھاتی۔دل کی لپٹوں کو شعروں کو روپ دینے والے کا نام محمود شام ہے۔

کشور ناہید

محمود شام سے میرا تعارف آج کا نہیں بلکہ نصف صدی کا قصہ ہے۔میں اُن کو اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلّہ ''راوی'' کے ایڈیٹر تھے اسی وقت سے میں ان کا اور انکی خوبصورت غزل کا دل سے قائل ہوں۔انھوں نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی بے پناہ عمدہ کام کیا ہے مگر محمود شام نے عالمی اور قومی رہنماؤں سے اب تک جتنے بھی انٹرویوز کیے ہیں وہ محض انٹرویوز نہیں بلکہ پاکستان کے عروج و زوال کی داستان ہے۔یہ پاکستان کی ایسی تاریخ ہے جس سے آنے والا مورخ کبھی صرفِ نظر نہیں کر سکے گا اور اسے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے یہ یادگار انٹرویوز ضرور مدِ نظر رکھنا ہوں گے۔یہ انٹرویوز سیاست دانوں اور حکمرانوں کے پڑھنے کے بھی ہیں اور خصوصاً محمود شام کا دیباچہ ایک آئینہ ہے جس میں ہمارے سیاست دانوں اور حکمرانوں کو اپنی شکل ضرور دیکھنا چاہیے۔جن سیاست دانوں نے قوم کے لیے کچھ کیا ہے یا کر رہے ہیں وہ اس آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر مطمئن ہوں گے اور جو صرف کرسی کے مزے لیتے رہے ہیں یا لے رہے ہیں ،انھیں اس میں اپنے حقیقی خدوخال نظر آئیں گے۔

عطاء الحق قاسمی

شام جی سے ہماری نیاز مندی کی مدت تقریباً چالیس برس ہے۔یہ ہم دونوں کی جوانی کا زمانہ تھا۔میں انہیں جعفر طاہر، شیر افضل جعفری، رام ریاض بلکہ مجید امجد سے منسوب محبت کرنے والوں کے شہر جھنگ کے مضطرب و منہمک طرح دار، البیلے اور تازہ نفس، غزل گو شاعر کی حیثیت سے جانتا ہوں۔محمود شام اپنی شاعری میں بھی اور صحافت میں بھی ایک جانبدار آدمی ہیں۔ان کی جانبداری پاکستان کے مجبور اور مظلوم عوام کے حق میں ہے۔وہ ظلم اور زیادتی کے خلاف دنیا بھر کے محروم طبقوں کی حمایت کرتے ہیں۔امن، آزادی، عدل، مساوات اور بھائی چارے کے لیے ان تمام انسانیت دوست طبقوں کی آواز میں آواز ملا کر مشکل زمانے میں بھی ایک مسلسل جدوجہد میں شامل رہے ہیں۔محمود شام نے اپنے نظریاتی موقف پر استقامت سے قائم رہنے کا ثبوت دیا ہے۔ ہمارے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ شام جی سے ہماری نیاز مندی کا رشتہ پہلے دن کی طرح آج بھی قائم ہے اور انشاءاللہ بشرطِ حیات قائم رہے گا۔

افتخار عارف

محمود شام سے میرا تعلق چند لفظوں، سطروں یا صفحات میں نہیں سمیٹا جا سکتا سرِ دست میرا موضوع محمود شام کا تازہ ناول ''شب بخیر'' ہے۔''شب بخیر'' کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ اک منفرد انداز کی ایسی تحریر ہے جو باقاعدہ ناول نہ ہوتے ہوئے بھی ناول کے تمام فنی تقاضے پورے کرتا ہے اور محمود شام کے مزاج، لحاظ اور اسلوب کے باعث منفرد حیثیت کا حامل ہے۔''شب بخیر'' کے مطالعے کے بعد مجھے ایسا لگا کہ جیسے محمود شام نے بھی عوامی وجود کو پسِ پردہ رکھا ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں محمود شام کے نزدیک ملکی معاملات میں عوام کا وجود غیر اہم ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ اگر ''شب بخیر'' کو پورے انہماک سے پڑھا جائے تو ہمیں اس ناول کے ہر کردار کے قبیح فعل کے بطون کے سے عوام کی دل خراش چیخیں سنائی دیں گی۔یہ خوبی ناول کی دیگر خوبیوں میں ایک اہم خوبی ہے۔اس ناول میں نچلے طبقے کے لوگ تو موجود نہیں لیکن اس کی ہر سطر ان کی موجودگی کے احساس کو ایک لمحہ کے لیے بھی دور نہیں ہونے دیتی۔

حنیف باوا

محمود شام کی شاعری کی ابتداء بھی ۱۹۶۰ء سے ہوئی، اس نے ۱۹۶۵ء کی جنگ سے پہلے تک بہت سی نظمیں لکھیں۔اس کی نظموں، یہاں تک کہ غزلوں میں زبان واضح اور لہجہ غیر معمولی طور پر سادہ ہے، وہ اپنی بات بہت سیدھے بلکہ بعض صورتوں میں کھردرے ڈھنگ سے کرتا ہے۔اس کی سوچ میں

الجھن بالکل نہیں، اسی لیے اس کے الفاظ بولتے ہوئے (Spokeh) ہیں۔ اس کا پیرایۂ اظہار دل میں اتر جاتا ہے۔ ہم عصری کے ناتے جہاں تک میرے علم میں ہے کہ جو زندگی وہ دس بارہ سال پہلے گزار رہا تھا، اُس کی لحاتی تصویریں بہت سامنے سے اس کی شاعری میں منتقل ہوئیں۔ اس کی نظم ''پوسٹ مین'' اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ وہ ۶۰ء کی نسل کی فیشن ایبل بحثوں سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ اس کے شعری اظہار میں جگہ جگہ یہ کرب جھلکتا ہے کہ لوگ اپنے سامنے کے دکھوں سے انجان ہیں اور محض پیش پا افتادہ باتیں کرتے ہیں۔ اسی کرب نے پھیل کر کارڈیو اسپازم کی صورت اختیار کر لی۔ کارڈیو اسپازم کے موضوع کی بازگشت اس کے مجموعہ ''آخری رقص'' تک میں ملتی ہے۔ البتہ اضافہ یہ ہوا کہ اُس کا ایک مطالبہ آخری رقص کی نظموں میں اب بہت شدید ہو گیا ہے کہ لفظ جو معنی سے بچھڑ گئے ہیں انھیں بلایا جائے، انھیں پاس لایا جائے۔ دراصل لفظوں سے معنی کے بچھڑ جانے کا اُسے بہت دکھ ہوا۔

احمد ہمیش

معتبر صحافی، دردمند ادیب، خوش فکر شاعر اور باشعور ناقد جناب محمود شام کے حرف کو اعتبار بھی عطا ہوا ہے اور وقار بھی۔ اُن کی شعری اور نثری تخلیقات اردو دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ زیرِ نظر تصنیف ''زلزلے کی دھول'' زلزلے سے متعلق محمود شام کی نظموں، غزلوں اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء پاکستان کی تاریخ کا غالباً تاریک ترین دن ہے جس نے ۲۵ ہزار مربع کلومیٹر کے علاقے کو تلپٹ کیا اور ہزارہا افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ یہ صبح ہزاروں پاکستانیوں کے لیے قیامت کی صبح تھی۔ الفاظ میں ایسی قیامت کا اظہار اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ:

ابھی جاگے تھے سو گئے ہیں لوگ
دفن زندہ ہی ہو گئے ہیں لوگ

عقیل دانش

شام صاحب کی محبت محبوب کے لیے نہیں بلکہ ملک کے لیے ہے، ان کا ہجر و فراق آنے والے اچھے دنوں کے لیے ہے، تنہائی کا احساس اپنے وطن کے لیے ہے کہ غلط پالیسیوں کے باعث وہ اقوام عالم میں تنہا نہ رہ جائے۔ ان کا اضطراب بھی ملک کے پسماندہ اور محروم طبقات کے لیے ہے، شام صاحب کے ہاں ہمیں یاسیت کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا، وہ سیاسیات، ملک کے حالات اور پسماندہ عوام پر لکھتے ہوئے بہت دکھ کا اظہار ضرور کرتے ہیں مگر یاسیت کے دھندلکے اور قنوطیت کی تاریکی کی جگہ وہ ہمیں صبح امید کا استبال کرتے نظر آتے ہیں۔ یعنی شام کی نثر ''مملکت اے مملکت'' کے قالب میں ڈھل کر آج کے دکھوں اور محرومیوں کے اظہار کے ساتھ کل آنے والی مسرتوں اور کامیابیوں کی نوید بھی ہے۔

اطہر شاہ خان

محمود شام صاحب ہمارے ملک کے معروف صحافی اور ایڈیٹر ہیں جنھوں نے پچاس سال صحافت کے سنگلاخ وادیوں کا سفر کیا ہے اور وہ کتاب اور رپورٹنگ سے آغاز کر کے ملک کے سب سے بڑے اخبار کے ایڈیٹر کے منصب تک پہنچے ہیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں مجھے ان کے رسالے ''معیار'' میں کوئی چار سال کام کرنے اور ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب ملک میں جنرل ضیاء الحق کی فوجی آمریت کا دور دورہ تھا۔ صحافت پر بالعموم ناروا پابندیاں عائد تھیں اور چند اخبارات و جرائد خاص طور سے سرکاری عتاب کی زد پر تھے۔ ''معیار'' انہی جرائد میں شامل تھا۔ ہم دیکھتے تھے کہ شام صاحب گرفتار ہو رہے ہیں، سزائیں کاٹ رہے ہیں، عدالتوں کے چکر لگ رہے ہیں، پیشیاں بھگتائی جا رہی ہیں، وہ دن بھر ویگنوں اور رکشوں میں دھکے کھاتے سہ پہر کو دفتر آتے اور رسالے کے مواد کو پڑھنے اور لکھنے لکھانے میں مصروف ہو جاتے۔ ان کی تحریروں کے بڑے حصے کو بالآخر سنسر کی نذر ہو جانا ہوتا تھا۔ ان دنوں مجھے شام صاحب کی محنت اور ہنگامِ روز و شب میں بھی یک گونہ انہماک کے ساتھ لکھنے لکھانے کی عادت نے بہت متاثر کیا۔

ڈاکٹر سید جعفر احمد

اعلیٰ پائے اور منفرد لہجے کی شاعری کے علاوہ محمود شام کے ہاں نثر کے کئی روپ جلوہ گر ہیں اور ایک سے ایک منفرد۔ جس موضوع کا انتخاب کرتے ہیں اس کو اسی سے لگا کھاتی ہوئی زبان اور لہجے میں قلم بند کرتے ہیں۔ آپ ''خواتین و حضرات!'' کا مطالعہ کیجیے وہاں آپ کو ایک شوخ، نکتہ چیں اور نکتہ بیں محمود شام ملے گا۔ یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو کتابوں کی رسوم اجراء میں پڑھے گئے تھے۔ اس وقت ان مضامین نے جلوت کو رنگین بنایا تھا اور صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو کر یہ خلوت کے رفیق بن گئے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی ان میں پائی جانے والی شگفتگی اور برجستگی ہے۔ ذاتی طور پر یہ مضامین ہمارے لیے باعث تشویش رہے ہیں۔ اس لیے کہ یہ اکثر ان محفلوں میں پڑھے گئے تھے جن میں ہم خود بھی (بہ طور مقرر) شریک تھے۔ اپنے مضمون پڑھنے اور اپنے حصے کی داد سمیٹنے کے بعد ہمیں زعم ہوتا تھا کہ ہم نے محفل میں جھاڑو پھیر دی ہے لیکن ہمارے بعد شام صاحب آ کر ہمارے تمام کیے کرائے پر پانی پھیر دیتے تھے۔ اعلیٰ ظرف اتنے ہیں کہ ایسی ہی ایک تقریب میں ہمارے بارے میں کہا ''ڈاکٹر معین قریشی ان کتابوں پر بھی ہنسا دیتے ہیں جن میں رونے دھونے کے لیے بھی کچھ نہیں ہوتا''۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مائک پر آ کر ''خواتین و حضرات'' کے مخاطب کے ساتھ ہی وہ سامعین پر اس حد تک حاوی ہو جاتے ہیں کہ جہاں چاہتے ہیں تالیاں پٹوا لیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں قہقہہ لگوا لیتے ہیں۔ ایسے میں ہم ان کی طرف سے مومن کا یہ شعر پڑھ کر صبر کر لیتے ہیں۔

مومنؔ بخدا سحر بیانی کا تجھی تک
ہر اک کو یہ دعویٰ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

محمود شام شاعری میں صحافتی نعرہ نہیں ہے اور نہ ان کے صحافتی مضامین میں شاعری۔ ان کی خبروں کا بانکپن اپنی جگہ اور شعر کی نزاکت اپنی جگہ۔ یہ کام کوئی پہلی بار نہیں ہوا ہے۔ اس سے قبل بھی بہت سوں نے مختلف رنگوں کو اپنی شناخت کا ذریعہ بنایا۔ مگر شام جی کا بے لاگ انداز۔ خود اپنی آواز ہے۔ ان کے یہاں وطن سے محبت کا رنگ کچھ ایسا ہے جیسے اُس ماں کا جس نے بچے کی تقسیم کے فیصلے سے خوف کھا کر کہہ دیا تھا کہ وہ اس بچے کی ماں نہیں ہے۔ ''مملکت اے مملکت'' ان کے مستقل کالم کا سرنامہ ہی نہیں ہے بلکہ ان کی ملک سے وابستگی آدرش اور ایمان کا عہد نامہ بھی ہے۔ وہ جب مکتوب لکھتے ہیں تو اس میں صحافتی مضمون سے زیادہ ادبی رپورتاژ کا مزا آتا ہے اور جب وہ امریکا کے حوالے سے تفصیلی حکایات تحریر کرتے ہیں تو اس میں سمجھ دار ادیب کے پردے میں معصوم سا لڑکا، اپنے جنون و جذبوں کے چکا چوند اجالوں میں کبھی چھپتا کبھی جھانکتا سا لگتا ہے۔ گویا:

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں
خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

پروفیسر انوار احمد زئی

محمود شام شاعر، ادیب اور صحافی ہے اگرچہ اُس نے ناموری صحافت میں پائی لیکن حقیقت الامر یہی ہے کہ وہ بنیادی طور پر شاعر ہے۔ کیونکہ ایک شاعر سے زیادہ حساس کوئی نہیں ہوتا اور وہ انسانیت کے ناسوروں کی نشاندہی بہتر انداز میں کرسکتا ہے۔ محمود شام نے شاعری میں نظمیں بھی کہیں ہیں مگر ان کا پسندیدہ انداز سخن غزل ہی ہے۔ میرے سامنے محمود شام کا مجموعہ ''چہرہ چہرہ میری کہانی'' ہے۔ شاعری میں محمود شام آہستہ خرام بلکہ مخرام کا رویہ رکھتے ہیں جسکی اصل وجہ انکی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں تو ہیں ہی مگر وہ خوامخواہ شاعری کرنے کے قائل نہیں اور یہی رویہ حقیقتاً ایک سچے شاعر کا ہوتا ہے۔ بایں ہمہ انہوں نے جو کچھ کہا بقول انکے خود ''غزلیں میری عمر کا حاصل ہیں'' وہ شاعری میں آسان اور سلیس زبان میں اپنا مافی الضمیر ادا کرتے ہیں۔ ان کا لہجہ سماجی و اخلاقی تربیت کے لحاظ سے دھیما اور نرم ہے مگر ان میں جذبے کی شدت کا احساس مکمل طور پر اجاگر ہوتا ہے۔ محمود شام نے صحافت کے میدان میں بھی بڑے کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ عالمی سیاست اور خاص طور پر پاکستان کے بارے ان کے خیالات سے ایک واضح تصویر نمایاں ہوتی ہے۔ وہ ایک وطن پرست انسان ہے اور وطن کو درپیش مسائل کو نہ صرف اچھی طرح سمجھتے ہیں بلکہ ان کی نشاندہی کا فریضہ بھی بحسن و خوبی انجام دیتے ہیں۔

عثمان عرفانی

اور جب دنیا کے لوگ بہت مصروف تھے۔۔۔۔ اور جب ہمسری کا دعویٰ کرنے والوں کے اپنے منصوبے تھے اور جب ایک کلمہ پڑھنے والوں کے اپنے فیشن زدہ مسائل تھے۔ جب ان سارے دکھوں، آہوں، آنسوؤں، سسکیوں اور کم نصیبوں کی چاہت میں سوچتا، سلگتا، غمزدہ ایک شاعر دکھ چنتا اُن میں جیتا اور آنے والے زمانوں کے لیے انہیں سینت سینت کر رکھتا تھا اور اُن آنسوؤں کو چن کر مالائیں بناتا تھا، پھٹی اوڑھنیوں کو مثلِ آسمان کرتا تھا، بلکتے بچوں کو فرشتے تحریر کرتا تھا، پتھرائی آنکھوں کو الماس کہتا تھا، دکھوں اور آہوں کو اپنا دل کہتا تھا۔ ساری دھوپ خود اُوڑھ لینا چاہتا تھا۔ سارے دکھ خود جی جانا چاہتا تھا اور چاند کی کرنیں، بہاروں کے پھول، جگنوؤں کی چمک اور موسموں کی ٹھنڈک محروموں، بے بسوں، دل فگاروں، ستم زدوں میں بانٹنا چاہتا تھا..... مورخ کہے گا کہ افتادگانِ خاک ایسے اکیلے کب تھے..... ان کے ساتھ ان کا شاعر ''محمود شام'' تھا۔

شہناز شورو

شام صاحب شروع ہی سے بڑی محنتی اور سنجیدہ طبیعت کے مالک رہے ہیں۔ میں نے بہت کم لوگ ایسے دیکھے ہیں جنہیں اس قدر کم غصہ آتا ہے۔ ایک خوبی اور جس کا میں ذکر ضروری سمجھتی ہوں وہ یہ کہ شام جی وعدے کے بڑے پکے ہیں۔ اپنی کسی نوعیت کی مصروفیت ہو، کئے وعدے کو یاد رکھتے ہیں، اس کو ادا کرنے میں مصلحت یا دروغ سے کام نہیں لیتے، جو بات جتنی ہوتی ہے کہہ دیتے ہیں۔ حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ وعدہ وقت پر پورا ہو، اس کے لیے انھیں کوئی مشکل بھی ہوتی ہے تو اس شخص پر ظاہر بھی نہیں ہونے دیتے، جس سے وعدہ کیا گیا ہوتا ہے کہ اس بات کو وفا کرنے میں مجھے کتنی دشواری ہوئی ہے۔ اپنا کام بہت ہی کم کسی سے کہتے ہیں، ورنہ یہ اپنا کام خود ہی کر لیتے ہیں۔ بڑی بڑی نامور شخصیات اور بہت بڑے بڑے لوگوں سے رات دن کے مراسم ہیں لیکن انھوں نے کبھی اپنے لیے ان سے کسی قسم کی کوئی سہولت یا مراعات نہیں لیں، البتہ اگر کسی کا جائز کام سمجھتے ہیں تو اس کی مدد کی ضرور کوشش کرتے ہیں۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے۔ وہ ان کی ذہنی تسکین کا ایسا ذریعہ ہے کہ کوئی موضوع، خواہ وہ ملکی سطح کا ہو، دینی نوعیت کا ہو، گھریلو ہو یا دفتری سطح کا یہ شعر کہہ کر ایک بے نام سا سکون حاصل کر لیتے ہیں۔ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ انھوں نے کوئی غزل یا نظم کہی ہو تو گھر میں سب کو سناتے بھی رہے ہوں، ہاں کبھی شعر سننے سنانے کی بھی نشست ہو جاتی ہے۔ اتوار کو ان کی چھٹی ہوتی ہے تو یہ اپنے بچوں کے درمیان رہنا چاہتے ہیں۔ اپنی بیٹیوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اپنی بیٹیوں کے اور نواسے، نواسیوں کے سر میں تیل لگاتے ہیں۔ ان کی کنگھا چوٹی بھی کر دیتے ہیں۔ یعنی ایک انتہائی شفیق باپ ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت پر بہت توجہ دیتے ہیں۔

بلقیس بانو
(بیگم محمود شام)

آغوشِ اجازت

سید مشکور حسین یادؔ

(لاہور)

کچھ اپنی فراست کے لئے وقت نکالو
کچھ میری حماقت کے لئے وقت نکالو

یہ سارا زمانہ ہے اجازت ہی اجازت
آغوشِ اجازت کے لئے وقت نکالو

وہ سر پہ کھڑی رہتی ہے کیا کیجئے اس کا
کتنا بھی قیامت کے لئے وقت نکالو

انجام کے ہر جام کو توڑو نہ مرے دوست
نادیدہ نہایت کے لئے وقت نکالو

مسئلہ ہمت ہی سے حل ہوتا ہے دیکھو
ہاں اتنا ہے ہمّت کے لئے وقت نکالو

گر چاہتے ہو مرنا کسی شان سے یارو!
جینے کی جسارت کے لئے وقت نکالو

اُتنا ہی وہ کرتی ہے پریشاں دل وجاں کو
جتنا بھی ضرورت کے لئے وقت نکالو

تم سے بڑا حاکم نہیں تم پر کوئی مشکورؔ
بس خود پہ حکومت کے لئے وقت نکالو

محمودالحسن (راولپنڈی)

قربان دل و جان و جگر کون کرے گا
آباد محبت کے نگر کون کرے گا

سب کرتے ہیں چڑھتے ہوئے سورج کی پرستش
ہم تیرہ نصیبوں پہ نظر کون کرے گا

محروم ہوئے جاتے ہیں سر اہلِ جنوں کے
اب ظلم کی دیوار میں در کون کرے گا

ہر سمت مسلّط ہے یہاں کور نگا ہی
دلداریِ اربابِ ہنر کون کرے گا

جب تک نہ عیاں ہوں گے ترے گیسو و عارض
تزئین رُخِ شام و سحر کون کرے گا

سب کرتے ہیں تیرے رُخِ پُرنور کی باتیں
اب تذکرہ شمس و قمر کون کرے گا

موجوں کا تلاطم بھی ہے، آغوشِ صدف بھی
کیا جانیئے قطرہ کو گہر کون کرے گا

محروم اگر لذّتِ گریہ سے رہی آنکھ
شاداب محبت کا شجر کون کرے گا

وہ لوگ کہ جو قوّتِ بازو سے ہیں محروم
حل اُن کی دُعاؤں میں اثر کون کرے گا

کوئی تو سنوارے گا خم گیسوئے ہستی
کوئی تو کرے گا یہ مگر کون کرے گا

گرمائے گا اب کون لہو آکے ہمارا
پیوست رگِ جاں میں شرر کون کرے گا

محمودؔ سرِ شام ہی دل ڈوب رہا ہے
ایسے میں شبِ غم کی سحر کون کرے گا

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

جس کو بھی دی صدا، وہ بڑی دیر سے ملا
جو بھی بھلا لگا ، وہ بڑی دیر سے ملا

ملتے گئے جو لوگ، وہ دل کو نہیں لگے
جس سے بھی دل لگا، وہ بڑی دیر سے ملا

باہر سے کوئی عکس نہ دل میں اتر سکا
جو عکس دل میں تھا، وہ بڑی دیر سے ملا

اک عمر کٹ گئی یونہی خوابوں کو دیکھتے
تعبیر جو بنا، وہ بڑی دیر سے ملا

ہم مدتوں کسی کی پرستش نہ کر سکے
اپنا جو تھا خدا، وہ بڑی دیر سے ملا

ہنگامِ شکر ہے وہ ملا تو زہے نصیب
اب اس کا کیا گلا، وہ بڑی دیر سے ملا

جاوؔید گو دعا تری مقبول ہوگئی
جو تھا پسِ دعا، وہ بڑی دیر سے ملا

○

امین راحت چغتائی
(راولپنڈی)

کون کس کا یہاں بھرم یارو
کیسے گزرے گی شامِ غم یارو

وضعداری میں مسکرائے بھی
آنکھ پھر بھی رہی ہے نم یارو

شہر کے شہر جل کے راکھ ہوئے
پھر بھی کس کو ہے کس کا غم یارو

آؤ مل بیٹھ کر ہی کچھ سوچیں
گھر ہے اپنا یہ دو قدم یارو

رات دن یوں قلم رواں بھی رہا
کام پھر بھی ہوا ہے کم یارو

داغِ سجدہ سے بچ نہیں سکتے
دیر ہے یہ تو وہ حرم یارو

آئینے میں وہ اب نہیں آتا
آئینے میں ہوں جیسے ہم یارو

اُس گلی میں نہ جاؤ گے کب تک
خود پہ کچھ تو کرو کرم یارو

کچھ ہمیں بھی نظر نہیں آتا
روشنی بھی ہے آج کم یارو

کیسے جاؤ گے اُس کی محفل میں
کیسے سر کو کرو گے خم یارو

وہ بھی ٹھوکر میں آ گیا آخر
اِک حوالہ تھا جامِ جم یارو

بات راحتؔ نے جو کہی بھی نہیں
بات وہ سچ ہے بیش و کم یارو!

آصف ثاقب
(ایبٹ آباد)

سر بسر راہ کی دیوار عنایت کر دے
اے خدا مجھ کو کوئی یار عنایت کر دے

ان کی پوشاک دریدہ ہو کلی کی صورت
میری یادوں کو غمِ خار عنایت کر دے

سر اچھلنے کا یہی ایک سبب ہے مولا
تُو مجھے عظمتِ دستار عنایت کر دے

ایک ٹوٹے ہوئے تختے پہ رواں ہو جاؤں
موج سر چڑھ کے جو پتوار عنایت کر دے

اس میں جل کر جو کہوں شعر تو گھنگرو بولیں
رقصِ گل آتشِ رخسار عنایت کر دے

میری قسمت میں راتوں کا سفر ہی ثاقبؔ
زخمِ دل چاند کی رفتار عنایت کر دے

○

کرشن کمار طور
(دھرم شالۂ بھارت)

سوچتا رہتا ہوں اک عالم سرشاری میں
دشمن جان تو میں خود تھا تری یاری میں

اب تو بس رنجش بازار ہے بازار کے بیچ
ہم نے دل بیچ دیا شوق خریداری میں

میرے جینے کے لئے اب یہ کوئی کم تو نہیں
شائبہ ہاں کا بھی کچھ ہے تری انکاری میں

خود سے بچھڑے تو کہیں جا کے یہ احوال کھلا
بند ہم آنکھیں کئے بیٹھے تھے بیداری میں

ایسی محفل میں اب احسان اٹھائیں کس کا
آدمی سوچے جہاں دل کی طرف داری میں

جواماں جان کی پاؤں تو یہ پوچھوں اس سے
وقت اور کتنا لگے گا تری دل داری میں

اک فقط تم پہ ہی موقوف نہیں طورؔ یہاں
مبتلا اور بھی ہیں عشق کی بیماری میں

○

غالب عرفان

(کراچی)

بے وجہ بغاوت کا چلن یاد رہے گا
تحریص کا وہ باؤلہ پن یاد رہے گا

ہر مسئلہ وقت کی شدّت کو بھُلانے
تقریر سے بہلانے کا فن یاد رہے گا

تہذیب کے کاندھوں پہ تقدس کا جنازہ
اخلاص نے اوڑھا تھا کفن یاد رہے گا

ہر نقشِ قدم قصّہ ایثار سنائے
تاریخ کو وہ ترکِ وطن یاد رہے گا

اک چاند کی دیوار نے روکا تھا اُجالا
سورج پہ بھی آیا تھا گہن یاد رہے گا

اک رات کی بکھری ہوئی خوشبو کی قسم ہے
گلپوش مہکتا وہ بدن یاد رہے گا

گلشن کی امانت میں خیانت کا وہ منظر
ہر پھول کو رنگوں کا غبن یاد رہے گا

جدّت کی تہیں جب رُخِ عرفاںؔ پہ سجی ہوں
پہچان کا کب نقشِ کہن یاد رہے گا

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ

(کیلی فورنیا، امریکہ)

نقلِ مکانی جب ہم نے کی
ساتھ اُٹھا لائے ماضی بھی

دل رویا، نہ ہی آنکھ بھری
دربدری تقریر میں لکھی

مرا تو نہ جائے جیتے جی
جامِ مئے تنہائی تُو پی

ہوگئے مصلوب ِ تنہائی
دوست داری کے سب دعوے بھی

دل نے کیا تھا جب جب تنہا
یادوں کی بارات ہے اُتری

شکوے کی گنجائش تھی کیا
پیشِ نظر رہی مجبوری

شرمندۂ تعبیر ہوئے
دیکھے تھے جو خواب کبھی

لے جاؤں اے دل تمہیں کہاں!
جان تیری ہے وہیں اٹکی

بے مصرف جب جب سمجھے لوگ
توڑے ہیں رابطے ہمنے بھی

ملنے کو اب تو اے تشنہؔ
جی نہ چاہے کسی سے بھی

بی۔ایس۔جین جوہرؔ
(میرٹھ،بھارت)

کبھی جو بستی کی بستی جلائی جاتی ہے
تو پہلے آگ دیوں میں لگائی جاتی ہے

کسی غریب کے گھر سے سگائی جاتی ہے
تو اس کی عمر کی ساری کمائی جاتی ہے

اُدھار لے کے ہی سامان گھر میں لانا پڑے
دوالی پہلے سے بہتر منائی جاتی ہے

غریب جنتا کے پیسے کو اینٹھنے کے لئے
ہر اک دُکان کی رونق بڑھائی جاتی ہے

منائے جانے لگے ہیں تمام رسم ورواج!!
کہ جن سے چیزوں کی بکری بڑھائی جاتی ہے

شروع میں تو پٹاخوں سے بم بنے ہونگے
کہ جن سے خون کی ہولی جلائی جاتی ہے

عمل کریں نہ کریں مذہبی اصولوں پر!!
ہر ایک گاؤں میں مسجد بنا ئی جاتی ہے

امیر لوگوں کو تو راس آئے مہنگی رسم
غریب گھر میں بہ مشکل منائی جاتی ہے

کھلونے دیکھ کے بچّوں کا دل مچلتا ہے
تو من مسوس کے گڑیا دلائی جاتی ہے

پرت پال سنگھ بیتاب
(جموں، کشمیر)

سوچتا ہُوں کہ ہوا ہو جاؤں
قید سے آج رِہا ہوں جاؤں

نئے موسم ہوں نیا عالم ہو
نئی ہستی ہو نیا ہو جاؤں

بھری دُنیا میں رہُوں شامل بھی
اور دُنیا سے جُدا ہو جاؤں

دستکوں پر بھی رہُوں بند کبھی
کبھی آہٹ پہ بھی وا ہو جاؤں

بندگی میں رہُوں چاہُوں جب تک
اور جب چاہُوں خُدا ہو جاؤں

کاش تُو میری دُعا ہو جائے
اور مَیں تیری انا ہو جاؤں

شمع ہو جائے سراپا میرا
مَیں اندھیرے میں ضِیا ہو جاؤں

نظر میں ہو نہ زمانہ بیتابؔ
میں خلاؤں میں خلا ہو جاؤں

ضیاء شبنمی

(ملتان)

آندھیاں کیا کیا خاک اُڑاتی رہتی ہیں
لیکن شاخیں پھول کھلاتی رہتی ہیں

سکھیاں کیا کیا کھوج لگاتی رہتی ہیں
آنکھیں دل کا حال چھپاتی رہتی ہیں

جیل نما دو نیلی آنکھیں، خوابوں میں
جب بھی دیکھوں مجھے بلاتی رہتی ہیں

گاؤں کی ہیریں شہر کے رانجھاؤں کے لئے
چوکھٹ چوکھٹ دیے جلاتی رہتی ہیں

چاندنی راتیں اکثر رات گئے تک مجھ کو
تیری ہی تصویر دکھلاتی رہتی ہیں

بھولی بھالی شکلیں جیسے میری غزل
پہروں اپنا آپ سجاتی رہتی ہیں

شاخیں بُور لدی شاخیں گدرائی ہوئی
مجھ کو دوہا چھند سناتی رہتی ہیں

جانے والے آتے نہیں ہیں پھر بھی ضیاؔء
شاخیں اپنے ہاتھ ہلاتی رہتی ہیں

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

(بہار، بھارت)

لہکتے گل سلگتی وادیوں کو کون دیکھے گا
چمن والو چمن کے حادثوں کو کون دیکھے گا

بڑی مشکل سے ہوتا ہے مقامِ شخصیت پیدا
پہاڑوں کے مقابل رائیوں کو کون دیکھے گا

مری ہر شام، شامِ غم مری ہر صبح ویراں ہے
سرِ ماتم کدہ، شہنائیوں کو کون دیکھے گا

بہت رنگین ہے یہ داستان ایواں نشینوں کی
بھٹکتے در بدر صحرائیوں کو کون دیکھے گا

کوئی ٹوٹے ہوئے احساس کا ماتم نہیں کرتا
شکستِ دل تری بیتابیوں کو کون دیکھے گا

یہ انداز خود آرائی یہ رعنائی یہ بھولا پن
ہمارے بعد ان لالہ رخوں کو کون دیکھے گا

بہت بحرِ ادب کے آج بھی غواص ہیں عاشقؔ
ترے فن کی مگر گہرائیوں کو کون دیکھے گا

○

پروفیسر خیال آفاقی
(کراچی)

کیا بتاؤں خالی گھر میں رات کیا جلتا رہا
ایک میں جلتا رہا یا اِک دیا جلتا رہا

بجھ گئے اِک ایک کر کے رات کے سارے چراغ
اک چراغ ایسا بھی تھا' بجھتا رہا' جلتا رہا

کچھ نہ لکھ پایا میں گھر میں رات بجلی کے بغیر
اور باہر بلب اک بے فائدہ جلتا رہا

نذر آتش کر رہا تھا جب میں خود اپنا جہاز
سیلِ برق و باد ساحل پر کھڑا جلتا رہا

دھوپ کی شدت نے رکھا مجھ کو محروم سفر
شام تک چپ چاپ لیٹا راستہ جلتا رہا

اس کے نقشِ پا سے بچ کر' رہگذارِ شوق میں
ایک انگارہ سا میرے زیرِ پا جلتا رہا'

لوگ نیروؔ کی طرح شب بھر رہے مصروف نے
اور میں تنہا کہ جیسے روم تھا جلتا رہا'

ہوگئی اک مرد خود آگاہ پر آتش حرام
دیر تک نمرود حق ناآشنا جلتا رہا

عصبیت کی آگ میں باسٹھ برس جلنے کے بعد
مل کے باہم پوچھتے ہیں گھر میں کیا جلتا رہا

سہیل غازی پوری
(کراچی)

رہِ پُرخار کے جو ہم سفر ہیں
ہوائے ہجر کے زیرِ اثر ہیں

یہ بے رونق سے جو دیوار و در ہیں
شکستہ آرزوؤں کے کھنڈر ہیں

وہیں ٹھہرے ہیں پھر آ کر پرندے
جہاں بکھرے ہوئے کچھ بال و پر ہیں

دھنک کے اُڑ گئے ہیں رنگ لیکن
بہت سے رنگ اب بھی معتبر ہیں

کہاں تک روشنی پھیلے گی ان سے
دیئے تو ہیں مگر اک طاق پر ہیں

خبر کس نے اُڑا دی شہر والو
ہمی تنہا یہاں اک شیشہ گر ہیں

کہاں ملتی ہے منزل ہر کسی کو
یہ کیا کم ہے غبارِ رہ گزر ہیں

سمجھتے تھے جو قطرے کو سمندر
اب ایسے بھی کہاں اہلِ نظر ہیں

سہیلؔ اس بات سے خوش کون ہوگا
ہمارے روز و شب بہتر اگر ہیں

''عقبی آئینہ''

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

لونگ روم میں بیٹھ کر وہ سب کافی پی رہے تھے اور ساتھ ساتھ جھیل کے نظارے کا لطف اٹھا رہے تھے۔ جھیل لونگ روم کی کھڑکی سے صاف دکھائی دیتی تھی۔ میری بار بار خواب گاہ میں جا کر اپنے پانچ سالہ بیٹے کو دیکھتی جو تھوڑی دیر پہلے اس کی گود میں سو گیا تھا اور اس نے اسے خواب گاہ میں لٹا دیا تھا۔ ایرک (Erick) سکون سے سو رہا تھا، لیکن میری ہر تھوڑی دیر بعد اسے دیکھتی، اس کی سانس کی آواز سنتی، اگر سانس کی آواز صاف سنائی نہ دیتی تو اپنے کان اس کی ناک کے نزدیک رکھتی، کبھی کان اس کے دل کے نزدیک رکھ کر دل کی دھڑکن سنتی اور جب وہ محسوس کرتی کہ وہ صحیح طریقے سے سانس لے رہا ہے تو وہ مطمئن ہو جاتی۔

ان لوگوں نے پچھلے سال یہ چھوٹا سا کاٹیج پہاڑی پر زمین خرید کر بنایا تھا۔ زمین کا یہ ٹکڑا انہیں چھٹیاں گزارنے کے لئے بہت پسند آیا تھا۔ یہاں سے جھیل صاف دکھائی دیتی تھی، لمبے لمبے درختوں سے گھرا ہوا یہ قطعہ زمین ان کے لئے قدرت کا حسین تحفہ ثابت ہوا تھا۔ درختوں کے ساتھ ڈھلان تھی وہاں پر ایک چشمہ تھا جس کا پانی صاف اور ٹھنڈا تھا۔ کاٹیج رچرڈ نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ بجلی کی وائرنگ، چشمے سے کاٹیج تک پانی کی پائپ لائن خود ہی ڈالی تھی۔ پچھلے سال ایک مہینے کی چھٹیاں ان لوگوں نے اس کاٹیج کو بنانے میں گزار دی تھیں۔ دن بھر وہ کام کرتے شام کو جھیل کی طرف ٹہلنے نکل جاتے، وہاں گھنٹوں بیٹھے رہتے، کبھی تاش کھیلتے، کبھی شطرنج، کبھی اپنے بیٹے ایرک کے ساتھ فٹ بال کھیلتے۔ وقت ان کے چاروں طرف خوشیاں بکھیرتا رہتا۔ ہوا مہربان ہوتی۔ کبھی کبھی کسی مست لہر کے اچھالے ہوئے پانی کے ٹھنڈے ٹھنڈے چھینٹے بڑا مزہ دیتے ہواؤں کو بھی اور ان کو بھی۔۔۔۔۔۔۔ جب شام کا دھندلکا رات کی سیاہی میں بدلنے لگتا تو تینوں اپنے کاٹیج کا رخ کرتے۔ ایک مہینہ کیسے گزرا پتہ ہی نہیں چلا لیکن کاٹیج پورا تیار ہو چکا تھا۔ کچھ چھوٹے موٹے کام رہ گئے تھے اس کے علاوہ فرنیچر ڈالنا اور آراستگی (Decoration) کا کام۔ کاٹیج تمام تر میری کی پسند کے مطابق بنایا گیا تھا، جگہ کا انتخاب بھی میری ہی کی پسند سے کیا گیا تھا۔ رچرڈ چاہتا تھا کہ اس کاٹیج کی ہر چیز میری کی ہم مزاج ہو۔

پچھلے سال اس پہاڑی پر صرف دو کاٹیج تھے۔ ایک کاٹیج ڈھلان کے دوسری طرف بنا ہوا تھا، چشمہ اور کچھ لمبے درختوں نے (جن میں بیشتر فر اور برچ کے تھے) اُس کاٹیج اور ان کے کاٹیج کے درمیان ایک آڑ سی بنا دی تھی۔ یہ تیسرا کاٹیج ان کے کاٹیج کے ساتھ ہی تھا چند قدم کے فاصلے پر۔ پال ہاروی (Paul Harvey) اور کم (Kim) نے اس کاٹیج کے بنانے میں بہت پھرتی سے کام لیا تھا۔

رچرڈ اس مرتبہ ایک خاص مقصد سے یہاں آیا تھا۔ وہ ان چھٹیوں میں اپنی ناول مکمل کرنا چاہتا تھا۔ گھر میں چھٹیوں کے باوجود کام ہو ہی نہیں پاتا، کبھی کسی کا فون آ جاتا، کبھی کوئی ملنے آ جاتا، کبھی کوئی دوست تفریحی پروگرام بنا کر ساتھ چلنے کی ضد کرتا۔ اس لئے بہتر یہی تھا کہ اپنے کاٹیج میں بیٹھ کر یہ ناول مکمل کی جائے۔ جب رچرڈ نے یہ بات میری سے کہی تو وہ بھی بہت خوش ہوئی اس نے کہا

''میں بھی اپنی وہ سب ادھوری پینٹنگز مکمل کر لونگی جن پر مصروفیت اور سستی کی وجہ سے کام نہیں ہو سکا ہے۔'' پہلا ہفتہ تو کاٹیج میں فرنیچر ڈالنا اور اس کو آراستہ کرنے میں لگ گیا۔

اس دن وہ بہت خوش تھے کاٹیج انکی مرضی کے مطابق تیار رکھا تھا اور رچرڈ اپنی ناول میں جُٹ گیا تھا۔ میری جھیل سے تھوڑے فاصلے پر اپنی پینٹنگ میں مصروف تھی۔ ایرک اس کے پاس ہی کھیل رہا تھا۔ کھیلتے کھیلتے وہ جھیل کی طرف نکل گیا۔ میری بروش سے تیز تیز اسٹروکس لگانے میں ایرک کے اچانک کھسک جانے کو محسوس نہ کر سکی۔ لیکن جلد ہی اس کی ممتا نے ایرک کی غیر موجودگی کو سونگھ لیا ایرک کو قریب نہ پا کر وہ ''ایرک۔۔۔ایرک'' چلاتی ہوئی جھیل کی طرف دوڑی۔ جھیل کے کنارے کرس اپنے بازوؤں میں ایرک کو لئے کھڑا تھا۔

''میں کشتی میں بیٹھنے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک بچہ جھیل میں گرا۔ میں نے فوراً ہی بچے کے پیچھے چھلانگ لگائی اور اس کو باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔'' کرس نے میری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میری نے نیم بے ہوش ایرک کو کرس کے ہاتھوں سے گھسیٹ لیا اور کاٹیج کی طرف بھاگی کرس بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ کاٹیج میں پہنچتے ہی میری نے ایرک کو پیٹ کے بل لٹا کر اس کے پیٹ سے پانی نکالا، تولئے سے سارا جسم خشک کیا، کپڑے تبدیل کئے، چت لٹا کر اسکی سانس بحال کی۔ آہستہ آہستہ وہ ہوش میں آ گیا اگرچہ خوف اور ٹھنڈک کی وجہ سے اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ میری اس کو گود میں لے کر بیٹھ گئی، رچرڈ نے جلدی سے تھوڑی سی برانڈی اس کے حلق میں ٹپکائی۔ حالات کو قابو میں آتا دیکھ کر کرس نے محسوس کیا کہ اسے اپنا تعارف کرانا چاہئے۔

''مجھے کرس ہوپ کہتے ہیں اس نے رچرڈ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا اور یہ میرا دوست ڈیوڈ ملز ہے'' اس دوران ڈیوڈ بھی کشتی سے اتر کر وہاں پہنچ چکا تھا۔

''میں رچرڈ برگر اور یہ میری بیوی میری، آپ دونوں کا بہت بہت شکریہ آپ نے ہمارے بیٹے کی جان بچا کر ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے'' رچرڈ نے گرمجوشی سے کرس اور ڈیوڈ سے ہاتھ ملاتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کو لے کر لونگ روم میں چلا گیا، کافی سے ان کی تواضع کی۔ ایرک اپنی ماں کی گود میں سو گیا۔۔۔ رچرڈ کے کہنے سے میری نے اسے خواب گاہ میں لٹا تو دیا لیکن اس پر ایک انجانا سا خوف مسلط تھا، وہ بار بار اس کو جا کر دیکھتی۔۔۔۔۔۔۔ رچرڈ،

کرس اور ڈیوڈ تینوں کافی پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ ڈیوڈ خاموش طبیعت تھا، کم ہی بول رہا تھا، کرس بولنے والا، خوش مزاج آدمی تھا وہی زیادہ بات کر رہا تھا۔ ''کرس نے رچرڈ کو بتایا کہ ڈھلان کے دوسری جانب ان کا کاٹیج ہے، وہ دونوں دوست بھی گرمی کی چھٹیاں گزارنے آئے ہوئے ہیں۔''

رچرڈ بہت کم باہر نکلتا، کاٹیج میں بیٹھا ناول لکھتا رہتا یا پھر اپنے بیٹے ایرک کے ساتھ لگا رہتا۔ میری اکیلی جھیل کی طرف نکل جاتی وہاں اکثر اس کی ملاقات کرس سے ہوتی۔ کرس اس کو ایزل پر جھکا کسی لینڈ اسکیپ کو کینوس پر منتقل کرتا دیکھتا، وہ ایک اچھی لینڈ اسکیپ آرٹسٹ تھی۔ ڈیوڈ کو جھیل سے عشق تھا وہ بہت کم کشتی سے باہر آتا کشتی رانی میں مگن رہتا۔ اکثر ڈیوڈ اور کرس دونوں کشتی میں بیٹھ کر جھیل کی سیر کرتے۔ ایک دن ڈیوڈ نہیں آیا۔ کرس، میری کے پاس آ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔

''تم اتنے اچھے اور خوبصورت لینڈ اسکیپ کیسے بنا لیتی ہو'' کرس بولا ''اور میری اس کی بات پر صرف مسکرا کر رہ گئی'' کرس تھوڑی دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا پھر اچانک اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

''چلو کشتی میں بیٹھ کر جھیل کی سیر کرتے ہیں''

''کیوں آج تمہارا دوست ڈیوڈ کہاں ہے'' میری نے پوچھا

''وہ اپنا کوئی پروجیکٹ کر رہا ہے''۔ کرس نے جواب دیا

پہلے تو میری نے منع کیا، پینٹنگ کا بہانہ کیا مگر کرس کے اصرار پر وہ پینٹنگ کو ایزل پر لگا چھوڑ کر کرس کے ساتھ چلی گئی۔ اس دن کے بعد سے کرس اور میری اکثر جھیل کی سیر کو نکل جاتے۔ ڈیوڈ کو کسی ضروری پروجیکٹ کے سلسلے میں جوب پر واپس جانا پڑا تھا۔ کبھی کبھی میری، رچرڈ اور ایرک کو بھی کشتی میں لے جانے میں کامیاب ہو جاتی لیکن ایسا کم ہی ہوتا۔

ایک رات چاند پورا تھا، جھیل کا حسن دوبالا ہو چکا تھا، میری اور کرس جھیل کی لمبی سیر کو چلے گئے۔۔۔۔۔۔۔۔ جیسے ہی میری کاٹیج کے اندر داخل ہوئی رچرڈ نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

''بہت دیر ہو گئی''

''آج میں اور کرس جھیل کی سیر کو ذرا دور تک نکل گئے تھے۔ چاند کی آب و تاب اور جھیل کا حسن دیکھنے کے لائق تھا۔۔۔۔۔۔۔''

میری نے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔

''اور وہ تمہارا لینڈ اسکیپ مکمل ہو گیا ۔۔ ۔؟'' رچرڈ نے سرگوشی کی۔ میری نے ایک بڑی سی جمائی لی اور بولی۔

''نہیں''

دوسرے دن صبح ناشتہ کرتے ہوئے رچرڈ نے میری سے کہا۔'' مجھے دو دن کے بعد آفس جانا ہے۔۔۔۔ شاید تمہیں یاد نہیں رہا۔۔۔''

وہ سوچ رہا تھا کہ میری تو پہلے سے شور مچانا شروع کر دیتی تھی کہ ہمیں جلدی نکلنا چاہئے تاکہ گھر جا کر آرام کر سکیں اور آفس جائیں تو کوئی تھکن نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔۔۔ مگر اس مرتبہ۔۔۔

''تمہاری ناول مکمل ہو گئی'' میری نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی تھوڑی سی باقی ہے۔'' رچرڈ نے کہا۔

''میں ابھی یہاں کچھ دن اور رکنا چاہتی ہوں'' میری نے رچرڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تنہا ۔۔۔۔۔۔۔؟'' رچرڈ نے سوال کیا۔

''یہ جگہ بالکل محفوظ ہے۔ اور ہمارے پڑوس میں پال اور کم بھی ہیں۔۔۔ اور کرس بھی ہے۔ میں اپنی پینٹنگز کو تھوڑا وقت دینا چاہتی ہوں۔'' میری نے کہا۔

رچرڈ اسی دن اپنا سامان پیک کر کے چلا گیا۔ تاکہ رات سے پہلے گھر پہنچ جائے۔ رچرڈ کے جانے کے بعد کرس زیادہ وقت میری کے ساتھ گزارنے لگا۔ ایرک بھی کرس سے بہت ہل گیا تھا۔ میری اپنی پینٹنگز کے لئے بہت کم وقت نکال پاتی۔ کرس یا تو اسے کشتی میں بٹھا کر جھیل کی سیر کرانے لے جاتا یا پھر شطرنج کی بساط بچھا کر بیٹھ جاتا۔ میری خوش بھی تھی یہ اس کی زندگی میں ایک نئی تبدیلی تھی کہ ایک کھلنڈرا مرد ہمہ وقت اسکے ساتھ لگا رہتا ہے۔ اس کے اشارے کا منتظر رہتا ہے۔

ویک اینڈ پر رچرڈ نے سوچا گھر میں بیٹھ کر ناول مکمل کی جائے مگر پھر اسے میری اور ایرک کی یاد ستانے لگی تو اسنے کاٹیج جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میری کو فون بھی نہیں کیا کیونکہ وہ سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ جمعہ کی شام جوب سے فارغ ہوتے ہی اس نے کاٹیج کا رخ کیا۔

ابھی وہ بیل بجانے ہی والا تھا کہ اسے اندر سے قہقہوں کی آوازیں آئیں۔ غور کرنے پر اس نے محسوس کیا کہ یہ آوازیں تو میری اور کرس کی ہیں۔ وہ کھڑکی کی طرف بڑھا، کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس نے جھانک کر دیکھا میری اور کرس ایک ہی صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے ایک دوسرے کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر قہقہے لگا رہے تھے۔ ٹی وی پر کوئی مزاحیہ پروگرام چل رہا تھا جس کو دیکھ کر وہ دونوں ہنس رہے تھے رچرڈ کو میری کا کرس کے ساتھ اس طرح بے تکلف ہونا بہت برا لگا۔

''کیا میری اور کرس۔۔۔۔؟'' وہ اس کے آگے نہیں سوچ سکا۔۔۔۔

''میری جو اس کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہتی تھی ایک ہفتے سے یہاں ہے اور خوش ہے۔'' اس کے اندر کسی نے دکھے دل سے سوچا اور وہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا گاڑی کی طرف گیا اور میری اور ایرک سے ملے بغیر واپس چلا گیا۔

اس دن میری کی آنکھ بہت دیر سے کھلی۔ کرس بھی نہیں آیا تھا ۔۔۔۔ ناشتہ وہ میری کے ساتھ ہی کرنے لگا تھا۔۔۔ میری کو اچانک رچرڈ کا خیال ستانے لگا وہ سوچنے لگی۔

''کہاں ہے وہ ایک ہفتے سے۔۔۔؟ اس نے کوئی فون کال بھی نہیں کی۔۔۔۔؟ میں نے دو مرتبہ فون کیا تو اس نے اٹھایا نہیں''

ایرک کے ساتھ ناشتہ کرنے کے بعد ایرک کے لئے بچّوں کا چینل لگا کر وہ باہر نکلی۔۔۔ اس نے دیکھا پال اور کم کی گاڑی نہیں تھی۔ ''تو کیا یہ لوگ چلے گئے۔؟'' یہ سوچتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ بند تھا، اس نے گھنٹی بجائی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔

''وہ لوگ چلے گئے۔۔۔۔! مگر کل ہی تو پال کہہ رہے تھے کم کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہوئی ہے۔ ابھی وہ ایک ہفتہ اور رکیں گے'' ''میری کو پال کی زبانی معلوم ہوا تھا ان کی اکلوتی لاڈلی بیٹی کیتھرین جس سے وہ دونوں بیحد پیار کرتے تھے جس کی تعلیم و تربیت میں کم نے جان لگا دی تھی، ان کو چھوڑ کر ایک کالے لڑکے کیساتھ آسٹریلیا چلی گئی۔ ان کی ایک نہیں مانی۔ کم اس صدمے کو برداشت نہ کر سکی اور جان لیوا ڈپریشن میں مبتلا ہو گئی تھی۔''

کم کی خاطر ہی پال نے یہاں کا ٹیچ بنایا تھا۔ اور وہ کافی سنبھل بھی گئی تھی پھر اچانک۔۔۔۔ وہ چلے گئے۔۔۔۔ پتہ نہیں کیوں۔۔۔؟ آگے بڑھکر اس نے کرس کے کاٹیج کی طرف دیکھا، وہاں ڈرائیو وے پر اس کا ٹرک نہیں تھا۔۔۔ پھر وہ جھیل کی طرف گئی۔۔۔۔ وہاں کرس کی کشتی بھی نہیں تھی۔۔۔۔

''کرس رات بارہ بجے تک میرے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ وہ صبح چلا جائیگا''۔ وہ سوچنے لگی۔

جھیل سے واپسی پر لہروں کا شور اور ہوا کی آوازیں کچھ زیادہ ہی سنائی دے رہی تھیں۔۔۔۔ شاید سناٹے کی وجہ سے۔۔۔۔ اور یہ سناٹا اس کے اندر کے وجود پر چھایا ہوا تھا۔۔۔۔ اسے خوف سے جھرجھری سی آئی۔۔۔۔ وہ تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی کاٹیج پہنچی۔۔۔۔ ایرک ابھی تک ٹی وی میں مصروف تھا۔ جلدی جلدی اس نے اپنا اور ایرک کا سوٹ کیس پیک کیا، کاٹیج کی تمام چیزوں کو سلیقے سے رکھا، پورے کاٹیج کی صفائی کی، کاٹیج اچھی طرح سے بند کیا۔ سارا سامان گاڑی میں رکھا، ایرک کو بٹھا کر سیٹ بیلٹ لگائی۔ گاڑی اسٹاٹ کرنے سے پہلے اسے میل کا خیال آیا وہ گاڑی سے اتری میل باکس کھولا، میل باکس میں ایک ہی لفافہ پڑا تھا، لفافہ نکال کر اس نے میل باکس بند کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر لفافہ چاک کیا، لفافے سے برآمد ہونے والے کاغذات دیکھ کر وہ سکتے میں آ گئی۔۔۔۔ طلاق کے کاغذ تھے جو رچرڈ کے وکیل نے بھیجے تھے۔ دیر تک وہ گاڑی میں ساکت و صامت بیٹھی رہی۔۔۔۔ پھر آہستہ آہستہ اسٹیرنگ حرکت میں آ گیا۔ وہ گاڑی چلانے لگی تھی۔۔۔۔ بلا ارادہ جیسے وہ کار نہ تھی بلکہ زندگی کی گاڑی تھی جس کو بہر صورت چلنا ہی تھا۔

''اپنے ناول نگار شوہر کو پہچاننے میں اس سے غلطی ہو گئی تھی۔ ایک تخلیق کار اتنا زیادہ پوزیسیو (Possessive) ہو سکتا ہے۔۔۔۔ اس نے کبھی سوچا نہ تھا۔ ''اتنا تنگ دل''۔۔۔۔!'' وہ بڑبڑائی۔

اچانک اس کی نظر ڈرائیو وے پر پڑے گاڑی کے نشانات پر پڑی۔ اس نے گاڑی روک دی اور اتر کر ان نشانات کا جائزہ لینے لگی ''ہوں۔۔۔۔'' یہ نشان رچرڈ کی گاڑی کے ہیں۔۔۔ صاف اور واضح۔۔۔ اس کا مطلب یہ کہ رچرڈ آیا تھا اور باہر کے باہر لوٹ گیا۔۔۔۔ اوشٹ۔۔۔۔ اس نے کرس کو اور مجھ کو دیکھا ہوگا۔۔۔۔ اور برداشت نہیں کر سکا۔''

دیر تک وہ رچرڈ کی گاڑی کے پہیوں کے نشانات کو دیکھتی رہی، ان کے ساتھ کچھ دور چلی بھی۔۔۔۔۔ اس دوران ایرک گاڑی سے اتر کر باہر آ گیا۔ اس کے بچکانہ ذہن میں کچھ بھی نہیں سما رہا تھا۔ اسنے اپنی ماں کو اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر وہ اپنی ماں سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میری کی 'ممتا' نے اپنے بیٹے کے ننھے وجود کو اپنے قریب محسوس کر لیا۔۔۔۔ اس نے ایرک کو لپٹا لیا اس کے روبرو جھکی اپنی بھیگی آنکھوں سے اس کو دیکھا اس کا ماتھا چوما اور اسکو لپٹائے لپٹائے چلتی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف بڑھی۔ ایرک کو کار بیلٹ میں محفوظ کیا خود اپنی سیٹ پر بیٹھ کر بیلٹ لگائی گاڑی کے دروازے لاک کئے اور گاڑی کاٹیج کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ گاڑی آگے جا رہی تھی اور وہ۔۔۔ اس کا ذہن۔۔۔۔ اسکا دل۔۔۔۔ اس کی روح۔۔۔۔ اس کے اندر کا سارا وجود کسی گہری کھائی میں اترتا جا رہا تھا۔

''موم۔۔۔ ہم گھر جا رہے ہیں کیا۔'' ایرک کی آواز اس کے سماعت کے پردے سے ٹکرائی۔

''نہیں میرے بیٹے'' اس نے اپنی آواز کو یہ کہتے سنا۔

''تو پھر ہم کہاں جا رہے ہیں۔۔۔۔؟'' ایرک نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔

''ابھی میں سوچ رہی ہوں۔۔۔'' اس کو اپنی آواز گہری کھائی میں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

پھر ماحول پر خاموشی چھا گئی۔ ایرک بھی ایک خاموش حیرانی میں گم ہو گیا تھا۔ میری اپنے ریفلیکس پر گاڑی چلانے میں مصروف ہو گئی تھی۔ جب گاڑی کافی دور چلی گئی تو میری نے رفتار دھیمی کر کے عقبی آئینے میں پیچھے دیکھا۔ پیچھے منظر غیر حقیقی ہو گیا تھا۔ ''کیا جو کچھ عقب میں تھا اس کو رچرڈ سے جدا کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا۔ دونوں کو جدا کرنے کے بعد غائب ہو گیا۔ جھیل۔ تینوں کاٹیج۔ پال اور کم۔ ڈیوڈ اور کرس کھلنڈرا۔۔۔ جن یا کوئی بدروح۔۔۔۔ کام ختم ہوا تو سب ختم ہو گئے۔

رزق کی دھوپ

جاوید اختر چودھری (برمنگھم، برطانیہ)

وہ بڑے جوش سے باتیں کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، ''لوگوں نے برسوں اس ملک میں رہ کر بھی کچھ نہیں سیکھا جو میں نے ایک ماہ ہی میں معلوم کر لیا ہے کہ خرابی کہاں ہے۔ اپنے لوگ نہ تو مقامی لوگوں سے میل جول بڑھاتے ہیں، نہ ہی مقامی اور قومی سیاست میں حصہ لیتے ہیں۔ کلبوں میں نہیں جاتے۔ گالف نہیں کھیلتے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ مقامی سفید فام ہم سے نفرت کرتے ہیں۔''

میری اُس سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ وہ منگیتروں کی کھیپ میں انگلستان آیا تھا۔ ایک قبول شکل وصورت کا لمبا تڑنگا وجیہہ جوان تھا۔ وہ سلیقے کا لباس بھی پہنے ہوئے تھا۔ تھوڑی دیر کی گفتگو میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ اُسے باتیں کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ باتیں کرتے وقت چہرے پر مسکراہٹ پھیلائے رکھتا۔ لیکن جلد ہی مجھے اس کی دو باتوں سے اُلجھن ہونے لگی۔ میری اُس سے ملاقات اپنے دوست راجہ علی شان کے ہاں ہوئی تھی جہاں میرے پہنچنے سے پہلے سے وہ موجود تھا۔ وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ مجھ سے ملنے جب وہ اُٹھا تو واپس بیٹھتے وقت اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے قمیص کے پچھلے حصے کو اس طرح سے کرسی پر پھیلایا کہ قمیص کی کریز ٹوٹنے نہ پائے۔ اُس کے کپڑوں میں لگا ہوا کلف اس کی شخصیت میں موجود تھا۔ دوسری بات جو مجھے ناگوار گزری وہ یہ کہ باتیں کرتے وقت وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں پہنی ہوئی موٹی موٹی سونے کی انگوٹھیوں کی بار بار نمائش کرتا رہا اور بائیں کلائی پر بندھی راڈو (rado) گھڑی پر گاہے گاہے نظر ڈالتا۔

میں نے سوچا برصغیر سے انگلینڈ آنے والے نئے نئے منگیتر یا اسائیلم سیکر (asylum seeker پناہ گزین) ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ شاید اُسے بھی ابھی یہاں کی طرز زندگی اور اس سے متعلقہ دشواریوں کا بالکل احساس نہیں ہے۔ بہت جلد زندگی کی تلخ حقیقتیں اور مصائب اس کی بے باک اور اُتھری سوچوں کو لگام دے دیں گے۔

میں اس دن کام والے معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ ویسے بھی میں محنتی مزدور ڈیل ڈول کا شخص ہوں۔ میں بے تکلفی سے نہ تو لطیفے سنا سکتا ہوں اور نہ محفل میں بیٹھے ہوئے کسی شخص سے بحث و مباحثہ کرنے کا عادی ہوں۔ جہاں دو سے تین یا چار آدمی جمع ہوئے میں اپنے آپ کو کچھوے کی طرح اپنے خول میں بند کر لیتا ہوں۔

میرے دوست، راجہ علی شان نے بتایا کہ وہ نو وارد اسائیلم سیکر تھا اور اُسے خوش قسمتی سے ایک معقول گھرانے کی لڑکی مل گئی تھی جس سے عنقریب شادی ہونے والی تھی۔ میں اُس کے بارے میں مزید جاننا چاہتا تھا۔ لیکن میرے موبائیل فون کی گھنٹی بجی اور مجھے وہاں سے اٹھنا پڑا۔

دوسرے ویک اینڈ (week-end) پر جب میں اپنے دوست راجہ علی شان کے ہاں گیا تو حسن اتفاق وہ بھی وہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھا تو اُٹھ کھڑا ہوا اور گلہ کیا کہ میں پچھلی بار جلدی چلا گیا۔ مصافحہ کرنے کے بعد بیٹھتے وقت احتیاط سے بیٹھا کہ قمیص شکن آلود نہ ہو۔ علیک سلیک کے بعد اس نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ اُس نے بتایا کہ جب وہ اپنے علاقے 'کھلابٹ' کے ہسپتال سے ٹرانسفر ہو کر ''موہری تھتھال'' ہسپتال میں گیا تو اُسے اپنے قدم جمانے میں کچھ وقت لگا تھا۔ اُس نے چوکیدار، نرس اور ڈسپنسر اور دیگر عملے کو تاکید کر دی تھی کہ کسی کھڑپنچ یا کسی سیاسی شخصیت کو محض ملاقات کی غرض سے اندر نہ آنے دیا جائے لیکن مریضوں کو فوری طور پر علاج مہیا کیا جائے۔

وہ کہہ رہا تھا ''اس علاقے کے ایم پی اور کونسلر میرے اس طریقۂ کار سے خوش نہیں تھے کہ میں نے کسی کی سفارش ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ لوگ موقع کی تلاش میں تھے کہ کوئی شکایت ملے تو میرے خلاف محاذ کھولیں۔ ایک دن کسی مریض کے علاج کے لیے ''کھٹانہ'' گاؤں گیا تو ایم پی راجہ گُل فراز خان بھی وہاں موجود تھے۔ جوں ہی میں مریض کے معائنہ سے فارغ ہوا تو ایم پی نے گلہ کیا کہ ہسپتال میں چارج لینے کے بعد نئے ڈاکٹر سب سے پہلے اُن سے ملنے آتے تھے۔ اُن کے زبانی پیغام یا رقعہ ملتے ہی کام کر دیا کرتے تھے۔ لیکن میں نے تو انہیں نظر انداز کر دیا۔ میں نے جواب دیا کہ میں کسی کو نظر انداز نہیں کرتا۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ ڈاکٹری صرف میرا پیشہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ کام عبادت سمجھ کر کرتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو سیاست سے علیحدہ رکھا ہے۔

ایم پی صاحب نے سب کچھ سنا اور مکاری سے کہا، 'ہاں سنا ہے کہ آپ مریضوں کا بہت اچھا علاج کرتے ہیں۔ اللہ نے آپ کے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ لیکن کچھ دنوں سے آپ کے متعلق افواہیں گشت کر رہی ہیں، خصوصاً عورتوں کے علاج کے سلسلے میں'۔ میں نے انہیں مزید کچھ کہنے کی مہلت نہیں دی اور کہا جناب آپ نے یقیناً میرے متعلق بہت ساری افواہیں سنی ہوں گی کیونکہ نہ تو میں سرکاری دوائیں فروخت کرتا ہوں اور نہ ہی پہلے ڈاکٹروں کی طرح اسقاطِ حمل میں کسی کی مدد کرتا ہوں۔ مجھے میرے عملے نے بتایا ہے کہ کون لوگ ان مذموم دھندوں میں ملوث رہے ہیں۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ کون لوگ ان کی پشت پناہی کرتے تھے۔ مزید مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اس علاقے کی بدنام عورتوں کے کن لوگوں سے تعلقات ہیں۔

ایم پی نے میرا کھرا جواب سنا تو پریشان ہو گئے۔ اٹھتے ہوئے کہنے لگے ''افواہ تو افواہ ہوتی ہے۔ ایسی باتوں پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں''۔

ہاں جناب، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی آپ نے سنا ہوگا، بد

سے بدنام برا۔ میں نے اُن ایم پی صاحب کے گوش گزار کیا۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے تحسین طلب نظروں سے ہماری جانب دیکھا۔ انگوٹھیوں کی نمائش کی۔ کلائی کی راڈو واچ پر نظر ڈالی۔ میں اُس کی اس حرکت سے محظوظ ہونے لگا تھا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے پوچھا ''تو پھر کبھی ایم پی صاحب سے ملاقات ہوئی۔''؟

''ہاں، ایک دن ہسپتال کے سارے عملے کو دعوتِ طعام پر بلایا تھا۔ پُر تکلف دعوت تھی۔ خوب خوب باتیں ہوئیں۔ اُس ملاقات میں ہم نے ایک دوسرے کو جانا۔ اور پھر وہ ملاقات دوستی میں بدل گئی۔ جب کبھی ان کا جی چاہتا مجھ سے ملنے ہسپتال میں آجاتے یا مجھے اپنی کوٹھی پر بلا لیتے۔ مجھے بھی جب کبھی ان کی ضرورت پڑی ایم پی صاحب نے مجھے کبھی مایوس نہ کیا۔ گاؤں کے لوگوں نے میرا تبادلہ کرانے کی بہت کوشش کی لیکن ایم پی صاحب کے سامنے کسی کی دال نہ گلی''۔

وہاں موجود چودہری زمان نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ کب اور کہاں وہ اپنی پریکٹس شروع کریں گے؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ ابھی تو انہیں آئے ہوئے صرف پانچ چھ ہفتے ہوئے ہیں اور وہ حالات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ شاید انہیں ایف آر سی ایس یا ایم آر سی پی کا امتحان دینا پڑے جو ان کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔

پھر اتفاقاً ایک دن راجہ علی شان کے ساتھ ڈاکٹر صاحب موصوف میرے گھر آگئے۔ کوئی وقت ضائع کئے بغیر کہنے لگے ''مجھے اپنے پروفیشن (profession پیشے) میں کام نہیں مل رہا ہے۔ زبان کی دقت پیش ہے۔ جس طرح یہاں کے انگریز انگریزی بولتے ہیں اُسے سمجھنے میں مشکل پیش آرہی ہے۔ مجھے توقع ہے کہ میں بہت جلد اپنے آپ کو ایڈجسٹ (adjust ہم آہنگ) کرلوں گا۔ اس دوران میں اگر آپ مجھے کوئی کام دلوا سکیں تو بہت مشکور ہوں گا''۔

وہ بڑی توقعات لے کر اس دیس میں آئے تھے اور وطن میں بیتے ہوئے ایام کو بہت یاد کرتے تھے۔ پھر مجھ سے ملتے رہنے کا وعدہ لے کر چلے گئے تھے۔

اتفاق سے چند دنوں بعد ایک اور صاحب ملے۔ باتوں باتوں میں ڈاکٹر صاحب کا ذکر بھی آگیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ جو اپنے آپ کو ڈاکٹر بتاتے ہیں وہ ڈاکٹر نہیں بلکہ ڈسپنسر (dispenser دواساز) تھے۔ یہ سن کر مجھے بہت زیادہ حیرت نہیں ہوئی کہ ہمارے بھائی بند اس قسم کے جعلی کاموں میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔

کئی دنوں بعد ایک بار وہ خود ساختہ ڈاکٹر ایک شاپنگ سنٹر میں نظر آئے۔ بہت خوش وخرم لگ رہے تھے۔ ان کی شادی ہو چکی تھی۔ اور کسی جگہ انہیں کام بھی مل گیا تھا۔ ایسا لگا کہ وہ یہاں کے سانچے میں ڈھل رہے تھے۔

ایک دن ان کا فون آیا۔ وفورِ جذبات میں خوشی ان کی آواز سے عیاں تھی۔ کہنے لگے انہیں اپنے آفس میں ایک ریسپشنسٹ (receptionist) کی ضرورت ہے اگر میں کسی خوش شکل پڑھی لکھی جوان عورت کو جانتا ہوں تو بتاؤں۔ میں نے کہا کہ فی الحال تو ایسی کوئی خاتون میری نظر میں نہیں ہے۔ تاہم میں نے دریافت کیا کہ کس قسم کا آفس کھولا ہے تو کہنے لگے ''میری ملاقات ایک بہت اچھے انسان، خان سمیع اللہ خان سے ہوئی تھی جن کی ٹریول ایجنسی (travel agency) تھی وہ ایک گھریلو افتاد کی وجہ سے پاکستان گئے تھے۔ تین ماہ کی غیر موجودگی میں ان کے پارٹنر (partner شریک تجارت) نے اچھی خاصی رقم ہڑپ کرلی تھی۔ خان سمیع اللہ خان جب واپس لوٹے تو کاروبار ٹھپ ہو چکا تھا۔ اب نئے سرے سے کام کرنا چاہتے ہیں۔ ٹریول بزنس میں ان کے تعلقات ہیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے۔ انہیں ایک پارٹنر کی ضرورت تھی۔ مجھے ان کی پیش کش اچھی لگی، میں نے پانچ ہزار پونڈ دے کر ساجھے کا کاروبار شروع کر دیا۔ عمرے کا سیزن شروع ہونے والا ہے۔ تین چار گروپ تیار ہو گئے تو اصل رقم واپس مل جائے گی۔ اس کے بعد منافع ہی منافع ہے''۔

مجھے ان کی قسمت پر رشک آیا۔ لیکن چاہتے ہوئے بھی ان سے یہ نہ پوچھ سکا کہ وہ پانچ ہزار پونڈ ان کے پاس آئے کہاں سے؟

پھر کسی نے بتایا کہ ان کا حال مندا ہے کیونکہ ان کے پارٹنر نے پارٹنرشپ (partnership) کے کاغذات تیار کرالیئے تھے اور وہ چاہتا تھا کہ پارٹنرشپ کی قانونی کارروائی جلد مکمل ہو۔ ڈاکٹر صاحب موصوف وکیل کے پاس جاتے ہوئے اپنے ایک دوست کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ وکیل نے کہا کہ دستخط کرنے سے پہلے شرائط نامہ پڑھ لیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ انہیں اپنے پارٹنر پر مکمل بھروسہ ہے لیکن جب وکیل نے دوبارہ زور دے کر کہا اور ڈاکٹر کے دوست نے بھی تائید کی کہ ایک نظر دیکھ لینے میں کوئی ہرج نہیں تو شرائط پڑھنے پر معلوم ہوا کہ خان سمیع اللہ خان کے ذمے پچاس ہزار پونڈ کا قرضہ تھا اور دستخط کرنے کی صورت میں ڈاکٹر صاحب قرضے کی ادائیگی میں برابر کے ذمے دار ہوں گے تو ڈاکٹر صاحب کے اوسان خطا ہوئے۔ یوں ڈاکٹر صاحب پچاس ہزار پونڈ کے قرضے میں حصہ دار بننے سے تو بچ گئے تھے لیکن اب پانچ ہزار پونڈ کی واپسی کے لیے انہیں کوئی تدبیر نہیں سوجھ رہی تھی۔ چار ہزار پونڈ سسرال والوں سے قرضہ لیا تھا جب انہیں اصل حالات کا علم ہوا تو ان کی ادائیگی کا مطالبہ بڑھ گیا تھا۔ یہیں سے ان کے اپنے سسرال والوں سے اختلاف پیدا ہوئے۔ نہلے پر دہلا یوں لگا کہ انہیں اس حقیقت کا علم بھی ہو گیا کہ ان کا داماد موصوف ڈاکٹر نہیں بلکہ ڈسپنسر ہے۔

دن گزرتے رہے کہ ایک دن ڈاکٹر صاحب کا فون آیا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ آئے تو خاصے پریشان تھے۔ بزنس میں گھاٹا تو ہوا ہی تھا اُس کے بعد سسرال والوں کا رویہ بھی کافی تکلیف دہ اور دل شکن تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھرّائی ہوئی آواز میں بتایا کہ چند دن ہوئے وہ اپنے گاؤں کے ایک شخص سے ملے تھے۔ وہ شخص اینٹوں کے بھٹے پر مزدور تھا۔ یہاں آنے کے بعد وہ بہت خوش تھا۔ اُس نے انہیں بتایا تھا کہ وہ اور اس کی بیوی، دونوں ہفتہ میں پانچ دن کام کرتے ہیں۔ اسے ہفتہ اور اتوار کو اوور ٹائم (over-time زائد اوقات کی اجرت) مل سکتا ہے لیکن اس کی بیوی اُسے زیادہ کام نہیں کرنے دیتی۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ اُس نے پہلے ہی بڑا کڑا وقت گزارا ہے بس اب وہ اتنا کام کرے جس سے گزر اوقات ہو سکے۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتی ہے۔ اُسے گھر میں پڑھاتی بھی ہے۔ وہ دونوں بہت خوش ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے تھوڑا توقف کیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ انہوں نے رومال سے آنکھوں کو خشک کیا اور کہا ''میں سوموار سے ہفتہ تک ایک فیکٹری میں روزانہ بارہ گھنٹے کام کرتا ہوں۔ اتوار کو فیکٹری بند ہوتی ہے۔ اب بیوی کا اصرار ہے کہ میں اتوار کو بھی کام کروں۔ اب اتوار کو دوسرے اَن پڑھ (لوگوں) مزدوروں کے ساتھ فارم پر آلو اور پیاز زمین سے نکالنے کا کام کرتا ہوں سارے دن کام کرنے کا معاوضہ دس پونڈ ملتا ہے۔ اُدھر وطن میں گھر والے ایڑیاں اُٹھائے میرا انتظار کرتے ہیں کہ میں کچھ رقم بھیجوں تا کہ قرض کی ادائیگی ہو، بہن بھائیوں کی شادیاں ہوں۔ میری یہاں کی کمائی میری بیوی کے پاس ہے۔ میں بہت دکھی ہوں۔ اس ملک میں میرا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔''

ڈاکٹر صاحب بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں چپ چاپ سنتا رہا۔ جب دل کا غبار نکل گیا تو چلے گئے۔ ان کے جان کاروں سے اُن کی خیر و عافیت کا پتا چلتا رہا۔ ایک بار کسی نے بتایا کہ انہوں نے ایک مکان کرایے پر لے لیا ہے اور وہاں وہ شام کو زنانہ و مردانہ پوشیدہ امراض کا علاج کرنے لگے ہیں۔ مجھے حیرت تو نہیں ہوئی تاہم ان کے آنے والے برے دنوں کا سوچ کر فکر مند ضرور ہوا۔ کیوں کہ انگلستان میں منگیتر بن کر آنے والے نا تجربہ کاروں نے ایسے ویسے کئی گل کھلائے تھے اور اکثر کو ان کی بھاری قیمت بھی چکانی پڑی تھی۔

ایک دن ٹریفک لائٹوں پر سگنل گرین ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ قریب میں ایک گہرے نیلے رنگ کی مرسیڈیز کار آن کھڑی ہوئی۔ میں نے غور سے دیکھا تو ڈاکٹر صاحب دانت نکالے ہنس رہے تھے۔ ان کی پہلو میں ایک نوجوان خوب صورت سفید فام لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھ سے نظریں چار ہوئیں تو مجھے گاڑی روکنے کا ارشاد کیا۔ سگنل ہرا ہوتے ہی میں نے گاڑی آگے بڑھائی اور تھوڑی دور جا کر گاڑی روک دی۔ ڈاکٹر صاحب اپنی گاڑی سے اُترے اور بڑے تپاک سے ملے۔

''اب تو ماشاءاللہ آپ کے بڑے ٹھاٹھ ہیں۔ لگتا ہے آپ کے سب دلدّر دور ہو گئے''۔ میں نے انہیں سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے کہا۔

کہنے لگے ''میرے دلدّر تو مدت ہوئی دور ہو گئے تھے۔ اب دوسروں کے دلدّر دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں''۔ پھر کار میں ساتھ بیٹھی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے ''یہ میری سیکریٹری ہے''۔ اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا اور آنکھ مارتے ہوئے کہا ''یہ میرا بہت خیال رکھتی ہے''۔

سفید فام لڑکی کو اس کے ساتھ دیکھ کر مجھے اس سے پہلی ملاقات یاد آ گئی جب وہ منگیتر بن کر نیا نیا انگلستان آیا تھا۔ میں نے پوچھا ''سرجری کا کام کیسا جا رہا ہے''؟

''اللہ کا کرم ہے۔ بڑا اچھا بزنس ہے۔ کبھی دن میں ہزار پونڈ تک کما لیتا ہوں'' اس نے گردن اکڑاتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ کیسے''؟ مجھے حیرت ہوئی۔

''کبھی وقت ملے تو سرجری آئیں اور خود دیکھ لیں''۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ دے کر رخصت ہوئے۔

ایک شام مقامی اخبار کی جلی سرخی اور مقامی ٹیلی ویژن کی اولین خبر تھی:

ایک ایشیائی جعلی ڈاکٹر کے ہاتھوں غیر قانونی اسقاطِ حمل کی وجہ سے ایک نوجوان عورت اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ وہ ایشیائی ڈاکٹر اپنے سابق وطن میں صرف ایک دسپنسر تھا۔ پولیس نے اس کو قتلِ عمد کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔

☆

بقیہ: ''مکاں اور لامکاں کے درمیاں''

دیکھو آرٹی ٹریز ہے، نرسنگ کا بھی کورس کیا ہوا ہے اور پھر اسے کوئی اعتراض بھی نہیں ہے بے چارے ٹیڈ کا تو کوئی بھی نہیں ہے۔

''لیکن شادی کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے ہلکی سی جرح کی''

ضرورت؟؟ شادی میں صرف ایک ہی چیز تو نہیں یہ تو دراصل ایک دوسرے کی زندگی اور وسائل بانٹنے کا نام ہے اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ اگر کل کو ٹیڈ یا آرٹی نہ رہے تو میرا کیا ہو گا؟ اس لیے بھی شادی ضروری ہے۔ اچھا تم سناؤ کیا کر رہی ہو؟ کہاں..... مگر میرا دماغ جیسے سائیں سائیں کر رہا تھا مجھے اس کی کوئی بات سنائی نہیں دے رہی تھی بس دو ہلتے ہوئے لب نظر آ رہے تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے آزاد دنیا کی زنجیروں میں جکڑی عورت سکون کی خواہش میں جینے کی آرزو میں مرتی چلی جا رہی ہے۔ ہر دن، ہر لمحہ، ہر پل!

☆

''مکاں اور لامکاں کے درمیاں''

نضیر اعظم (واشنگٹن ڈی سی)

''مس..... کیا میری بات سن سکتی ہو؟'' میں نے کمرے سے باہر نکلنے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ بستر نمبر 10 پر پڑی لنڈا نے اپنے بھاری بھرکم وجود کو بمشکل ایک طرف سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے آواز لگائی۔ وہ بستر کے سرہانے میز سے پانی کا گلاس اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''ضرور!'' میں نے آگے بڑھ کر گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس کمرے میں مریضوں کے دو بستر تھے درمیان میں پردہ تھا، لنڈا کی خوبی یہی تھی کہ وہ انتہائی بے تکلفی سے کسی بھی آنے جانے والے سے اپنا کوئی بھی کام کروا لیتی تھی۔

''بہت شکریہ۔ تمہاری والدہ سو گئیں؟'' اسنے پوچھا۔

''نہیں۔ کوئی کتاب پڑھ رہی ہیں۔'' میں نے بتایا۔ وہ اپنے پاؤں کی مضروب ہڈی کے علاج کے لیے اس Rehab Center میں آئی تھی جبکہ میری والدہ کے گھٹنوں کی سرجری ہوئی تھی۔ ''تمہاری ماں سے ملنے بہت لوگ آتے ہیں۔ کیا وہ تمہارے ملک کی کوئی مشہور شخصیت ہیں؟ وہ ٹی وی ریموٹ (Remote) کے بٹن دباتے ہوئے بولی۔ میں ہنس پڑی، نہیں میرے بھائی اور بہن کا خاندان اور انکے احباب آتے ہیں۔'' ''اچھا؟؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''تم بھی یہاں رہتی ہو؟'' اسنے پوچھا، نہیں میں میری لینڈ سے آئی ہوں۔ ''میں اب الجھ چکی تھی''۔ اوہ صرف ماں کی دیکھ بھال کرنے؟؟'' ''ہاں''۔ میں نے مختصراً کہا۔

''ارے سنو..... کسی آواز نے میرے قدم روک لئے تھے۔ آج میری بیٹی سوزن کا فون آیا تھا، وہ میری تکلیف سے بے حد پریشان ہے۔ لنڈا کے لہجے میں اطمینان سا تھا۔

''قدرتی بات ہے'' کہاں ہے تمہاری بیٹی؟ اب میں اسکے بستر کے قریب پڑے اسٹول پر بیٹھ گئی تھی۔

''اوہائیو میں رہتی ہے میرے پاس آ نہیں سکتی'' ایک تو اسکا بیٹا اسکول جاتا ہے دوسرے وہ خود بیمار ہے دماغ میں پھوڑا ہو گیا ہے..... پتہ نہیں کیا ہوا ور میں..... ارے صدام کے دونوں بیٹے مار دیئے گئے! وہ بولتے بولتے ایکدم ہی ٹی وی کی خبروں کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ میں خاموش رہی۔ ''اوہ وہ دیکھو اتحادی تلاشیاں لے رہے ہیں، اس نے مجھے متوجہ کرنا چاہا۔ میں خاموش نظروں سے گوری قوم کے بہادر سپوتوں اور جیالوں کو بے گناہ عراقی عورتوں، بچوں جوانوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کے مناظر کی جھلکیاں دیکھتی رہی۔

''ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ..... اوہ..... یہ دیکھو صدام کے بیٹوں کی تصویریں، چلو اچھا ہوا مارے گئے سنا ہے باپ سے زیادہ ظالم تھے..... اور تم نے سنا؟'' وہ میری طرف سر گھماتے ہوئے گویا ہوئی، ''امریکی فوجیوں نے اجتماعی قبر بھی دریافت کی ہے جہاں صدام نے کئی ہزار لوگوں کو قتل کر کے گاڑ دیا تھا؟''

''ہاں مجھے معلوم ہے، پچھلی خلیجی جنگ کے دوران.....''

''نہیں شاید اس سے بہت پہلے..... اس نے میرا جملہ کاٹ دیا''

مجھے یقین ہے کہ ہمارے فوجی عراقی عوام کو جمہوریت سے ضرور آشنا کرینگے۔ یہ کہہ کر اسنے چینل بدل دیا۔ اتحادی فوجی عرقی مردوں کو شبہ کی بنیاد پر ان کے کچّے مکانوں سے گھسیٹتے ہوئے ایک فوجی ٹرک کی طرف لیجا رہے تھے۔ قیدیوں کے چہروں پر ٹاٹ کے نقاب تھے۔ انکے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ لباس تار تار اور جسم لہولہان تھے۔ زمین اپنا خراج لے رہی تھی کئی صدیاں گزر گئی ہیں۔ زمین کی پیاس ہنوز قائم تھی۔ کیا یہ شہداء کے لہو کی پکار تھی؟ بے گناہوں کے خون کی بددعا..... یہ کیا تھا؟ کیوں تھا؟

بے چارے امریکی فوجی، گھروں سے دور، خاندانوں سے الگ صحراؤں میں کس قدر محنت کر رہے ہیں، ہر روز کوئی نہ کوئی فوجی مار دیا جاتا ہے۔ اصل میں یہ ایک اصولی جنگ ہے ہمارا صدر اصول کا آدمی ہے۔ یہ دنیا سے دہشت گردی کے خاتمے کی جنگ ہے، ہتھیاروں کی دوڑ ختم کرانے کی جنگ ہے، دیکھو تو ٹوئن ٹاور نے کیا قصور کیا تھا اور وہ اُسامہ..... سفید پہاڑ لاوا اگلنے لگا۔ اور میں اپنی خاموش چیخ سینے میں لئے باہر نکل آئی۔

''ری حیب'' سینٹر ایک صاف ستھری عمارت میں قائم تھا۔ میری والدہ گھٹنوں کی سرجری کے بعد دو ہفتوں کے لیے یہاں تھراپی کے لیے داخل تھیں۔

یہاں مریضوں کے لیے ہر طرح کی سہولیات موجود تھیں۔ یہ عجیب ہی دنیا تھی۔ ملکی ترقی کی بھٹی میں بھسم ہونے والے، ٹوٹے پھوٹے سسکتے کہنہ جسم، ساکت وجود، موت کی آرزو میں زبردستی جیتے انسان، وہیل چیئرز پر پڑی کراہتی روحیں، خوبصورت مزین راہداریوں میں بدروحوں کی طرح منڈلاتے، گھسٹتے، خاموش، تھکے ہوئے، ذہنی زاویوں سے آزاد جسم۔ یہ سب کبھی امرا کہلاتے تھے۔ ان میں کئی فرعون دوراں بھی تھے، اپنے زمانے کے بے حد کامیاب لوگ بھی تھے جنکی دولت کا شمار نہ تھا مگر اب یہ سب سے بے نیاز مکاں اور لامکاں کے درمیاں کہیں ڈول رہے تھے۔

سہ پہر کا وقت تھا، امی ابھی سوئی تھیں میں دبے قدموں سے اٹھی جھانک کر دوسری طرف دیکھا لنڈا کا بستر خالی تھا۔ اپنی ڈائری اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ ڈائننگ ہال کے سامنے سے گذر رہی تھی کہ لنڈا کی آواز نے میرے قدم روک لئے۔ ''ہے مس! ادھر آؤ تمہیں کسی سے ملواؤں''۔ وہ دروازے کے بالکل سامنے وہیل چیئر پر ایک میز کے گرد بیٹھی تھی اس کے سامنے والی کرسی پر

ایک بوڑھا آدمی خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ میں اندر چلی آئی۔ ایک طائرانہ نظر ہال پر ڈالی ہر طرف میزوں پر کہنہ جسم وہیل چیئر اور کرسیوں پر پڑے تھے۔ صاف ستھرے لباس، خوبصورت برتن، خوش رنگ غذائیں، نرسیں، بعض سینوں پر لٹکے سروں سے نبرد آزما تھیں۔ بعض کو تو دو نرسوں نے سنبھالا ہوا تھا۔ ایک چہرہ اوپر اٹھاتی اور دوسری بندلبوں میں زبردستی کھانا ڈالتی اور وہ خوش رنگ غذا احتجاجاً ہونٹوں کے کونوں سے نکل کر گردن میں بندھے سفید رومالوں میں جذب ہو جاتی۔ مگر یہ ہمت نہ ہارتیں۔

''آج سارا دن تم کہاں رہیں؟'' میرے بیٹھتے ہی اس نے پوچھا۔

''امی کے پاس ہی تھی ابھی وہ سوئی ہیں تو باہر نکلی ہوں''۔ میں نے کہا ''میرا مطلب ہے کہ میرے سامنے سے نہیں گزریں'' اس نے شکوہ کیا۔

''ہاں کچھ پڑھ رہی تھی'' میں نے ٹالا۔ ''آج کی خبریں سنی تم نے؟'' اسے سیاست سے خاصی دلچسپی تھی۔

''نہیں''

''وہاں عراق میں خودکش بم دھماکہ ہوا دو اتحادی مارے گئے'' اس نے اطلاع دی۔ اور کتنے شہری مرے؟ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں کڑواہٹ گھل گئی تھی۔ ''میرا خیال ہے نشانہ اتحادی تھے بیچ میں آ گئے شہری!'' اس نے سیب کا مشروب حلق میں اتارتے ہوئے تبصرہ کیا۔ ''ہاں قصور تو شہریوں کا ہوانا؟'' میں نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

''ہاں اور کیا!'' لنڈا کے چہرے اور لہجے میں چمک آ گئی تھی۔

اب دیکھو اگر جمہوریت ہوتی تو یہ نہ ہوتا لوگوں کو اپنی حفاظت کا بالکل خیال نہیں ہے۔ ایک تو جب سے یہاں آئی ہوں منہ کا مزہ بالکل خراب ہو گیا ہے نہ وائن ہے شیری اور نہ ہی..... ''تم بہت دنوں بہت آئی ہو کہاں تھیں؟'' بوڑھا ایکدم مجھ سے مخاطب ہوا اور میں ایک لمحہ کو سٹپٹا گئی۔

''اوہ..... یہ میرا شوہر ٹیڈ ہے اسے الزائمر ہے۔ اس کو ڈھونڈنے نکلی تھی کہ گر گئی اور پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی گھر میں اسکی دیکھ بھال کے لئے کوئی نہ تھا سو اسے بھی یہاں داخل کرا لیا ہے''۔ لنڈا نے ایک سانس میں بتایا۔

''ٹیڈ سے میں نے دس سال پہلے شادی کی تھی۔ طلاق شدہ تھی، سرکاری نوکری تھی کوئی اولاد نہیں۔ نہ جانے کیوں میں نے پھر بھی گیارہ سال اس کے ساتھ گزار دیے تھے۔ اور اب دیکھو اسے الزائمر ہو گیا۔ ''اوہ..... اچھا..... چھا..... اور مجھے محسوس ہوا کہ اسکی چمکدار آنکھوں میں ایک نیا دس سالہ منصوبہ ہلکورے لینے لگا ہے۔

میری پرواز کا وقت ہو رہا تھا۔ امی بھی دو دن بعد یہاں سے فارغ ہونے والی تھیں۔ کس وقت ایئرپورٹ جاؤ گی؟ انہوں نے پوچھا۔ بس یہاں سے ہی جاؤں گی۔ اچھا لنڈا سے ضرور ملا لینا صبح سے کئی بار تم کو پوچھ چکی ہے۔ اسوقت ایکسرسائز روم میں ہوگی۔ اور میں انکی دعاؤں کی پھوار میں کمرے سے نکل آئی۔

ایکسرسائز کا کمرہ خالی تھی۔ پارٹیشن کے پیچھے سے لنڈا کی تیز آواز صاف سنائی دے رہی تھی وہ اپنے ٹرینر (Trainer) کو اپنی دکھوں سے پُر زندگی کی داستان سنا رہی تھی۔ میں چند قدم آگے بڑھی۔ پھر کچھ سوچ کر واپس ہو گئی۔

پچھلے سال کا واقعہ ہے میری بچپن کی دوست ہمدرد، ہمراز طلعت پاکستان سے اپنی بیٹی سے ملنے امریکہ آئی ہوئی تھی۔ ہم دونوں برسوں بعد یکجا ہوئے تھے، دن بھر ہم واشنگٹن گھومتے رہے، کبھی میوزیم، نیوزیم، botomical۔ پھر ٹائڈل بیسن کے کنارے ہم دونوں ماضی میں گم ہو گئے۔ دریا بے حد پرسکون اور ہوا ٹھنڈی تھی۔ ہماری باتوں میں ہلچل اور گرمی تھی کہ اچانک میری نظر دائیں طرف سے آتے ہوئے ایک جوڑے پر پڑی۔ عورت جانی پہچانی سی لگی۔

''چلو یار..... گھر چلیں آج برسوں بعد بہت مزہ آیا! وہ اٹھتے ہوئے بولی، اور ہم دونوں ٹہلتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھے۔ ''مس تم!''..... یہ آواز میں کیسے بھول سکتی تھی۔ ''ارے لنڈا تم کب آئیں؟؟ میں نے خوشی کا اظہار کیا۔ ''ہم لوگ آج صبح ہی پہونچے ہیں۔ میں نے اب تک ڈی سی نہیں دیکھا تھا۔ ارے ہاں ان سے ملو میرے بوائے فرینڈ آرٹی۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ تمہاری ماں کیسی ہیں؟ اسنے پوچھا۔ اوہ! تو یہ trainer صاحب تھے؟ ''ہاں اب ٹھیک ہیں گاڑی بھی چلانے لگی ہیں'' میں نے بتایا ''یا اللہ ان عورتوں کو چین نہیں اس عمر میں بھی اللہ اللہ کریں نہ کہ بوائے فرینڈ..... طلعت نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ خدا کی نعمت کو ٹھکرانا کفران نعمت ہے! میں مسکرائی۔ لنڈا پہلے کے مقابلے میں خاصی مستعد نظر آ رہی تھی، وزن بھی کم کر لیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی چلنے لگی۔

کتنا اچھا ہے یہاں، سکون، خوشی، آرام..... وہ بولی۔ ''ہاں..... یہ جگہ مجھے بھی بے حد پسند ہے!''

میں نے کہا ہاں تمہاری بیٹی کا کیا حال ہے؟

''بیٹی کی سرجری ہوئی اور اب وہ بالکل صحت مند ہے، نارمل زندگی گزار رہی ہے، ٹیڈ کا وہی حال ہے کبھی نرسنگ ہوم کبھی گھر دو سال تک تو میں اس کی دیکھ بھال کرتی رہی مگر خود سوچو میری بھی تو کوئی زندگی ہے مجھے بھی تو خوشیوں کا حق ہے، لارڈ کی مہربانی کہ مجھے آرٹی مل گیا، شاید میں کچھ عرصہ میں اس سے شادی کر لوں'' اسنے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔ ''اور ٹیڈ؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ بے چارہ تو دنیا سے بے خبر ہے اس سے طلاق لوں یا نہ لوں کیا فرق پڑے گا مگر قانونی کارروائی تو کرنا ہوگی، شادی کے بعد اسے اپنے ساتھ ہی رکھوں گی، اب

باقی صفحہ؟ پر ملاحظہ فرمائیے

درد کا قصہ

ڈاکٹر رینو بہل (چندی گڑھ، بھارت)

جیتی کے صحن میں خوب رونق سجی ہے۔ جوان لڑکیاں سج دھج کر مورنی کی طرح اندر باہر اٹھلا رہی ہیں۔ بچوں نے اُچھل کُود کر گھر کو سر پر اٹھا رکھا ہے۔ جیتی مہمانوں کی دیکھ ریکھ میں مصروف ہے۔ آج اُس کی بیٹی لاڈو کی شادی ہے۔ اُسے آشیر باد دینے گرمیت چاچی بھی پہنچی ہیں جو اس وقت اس کی ساس کے ساتھ بیٹھی اُس کی باتیں سن رہی ہے۔ سردیوں کی نرم دھوپ اُس کے بوڑھے جسم میں اکڑی ہوئی رگوں کو گرماہٹ بخش رہی ہے۔ ویسے تو وہ کہیں آتی جاتی نہیں مگر جیتی سے اُن کا ایک ان کہا رشتہ ہے اور جب وہ اسے بیٹی کی شادی کا نیوتا دینے پہنچی تو وہ نہ آنے کا کوئی بہانہ نہ بنا سکی۔ وہ جیتی میں جوگی کو تلاش کرتی تھی۔ اگر آج جوگی اس کے پاس ہوتا تو یہ شادی اس کے گھر ہو رہی ہوتی۔ لاڈو اُس کی پوتی ہوتی۔ اتنی رونق میں بھی تنہائی کے احساس نے اُسے جکڑ لیا۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھی، کان سب باتیں سن رہے تھے پھر بھی وہ اپنے ماحول سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں گم تھی۔ اس بھیڑ سے نکل کر وہ ایک انجان شہر میں انجان جگہ پر اپنے جوگی کے پاس پہنچ چکی تھی۔ جوگی اس کا تیسرا اور سب سے چھوٹا بیٹا اس کے جگر کا ٹکڑا گھر سے جاتے جاتے سب خوشیاں سمیٹ کر لے گیا اور اُس کی زندگی کے ساتھ ساتھ اُس کے دل کا ایک گوشہ ہمیشہ کے لیے ویران ہو گیا۔

گُرمیت نے ایک کے بعد ایک تین بیٹوں کو جنم دیا۔ سب سے بڑا رتن منجھلا ویر اور سب سے چھوٹا جوگی۔ تیسرے بیٹے کی پیدائش پر وہ بڑی مایوس ہوئی تھی۔ ہربنس نے بیٹے کو گود میں اُٹھاتے ہوئے اس کی دُکھتی رگ کو چھیڑ دیا تھا:

سکھ نہیں ہے۔ اب اسے بیٹی سمجھ لینا۔''

''ہٹو جی کیسی باتیں کرتے ہو۔ لوگ بیٹوں کو بیٹوں کی طرح پالتے ہیں اور آپ اُلٹی گنگا بہا رہے ہو۔ رب سکھ رکھے اگلی بار بیٹی ہی دوں گی آپ کو۔''

''بس بس اب اور کی امید مت کرو۔ مہنگائی کدھر جا رہی ہے کچھ پتا ہے تجھے؟ شہر میں تو لوگ دوسرا بچہ بھی پیدا نہیں ہونے دیتے اور تُو۔۔۔۔''

شہر والوں کی بات مت کرو۔ آپ شہر میں صرف نوکری کرتے ہو وہ بھی آپ کی ضد ہے ورنہ ضرورت کوئی نہیں۔ ہو تو آپ گاؤں کے ہی۔ رب کی بہت کرپا ہے ہم پر۔ اتنی زمین دے رکھی ہے۔ گھر کا اناج گھر کی سبزی، تازہ پھل، تازہ دودھ پھر ہمیں سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔؟''

''تو بس یہ دعا کر کہ ان کو اچھی تعلیم دے سکیں اور انہیں اچھے انسان بنا سکیں۔ بس یہ ہی تیری دنیا ہے۔ لے اب ایسے کیا ہوا جو اتنی زور زور سے رونے لگا'' اس نے بچے کو ماں کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''اسے بھی ماں کی طرح آپ کا فیصلہ پسند نہیں آیا۔''

وہ مسکرا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

جوگی کی پیدائش پر اس کی ساس جتنی خوش تھی وہ اتنی ہی مایوس۔ شروع شروع میں تو وہ اسے گود میں بھی کم ہی اٹھاتی تھی۔ مگر جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا اس کا پیار بھی بڑھتا گیا اور پھر ایسا بھی ہوا کہ وہ اس کا سب سے لاڈلا بن گیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی پیاری باتیں، ننھی ننھی شرارتیں سب کے دل کو موہ لیتی تھی۔ اپنے دونوں بڑے بھائیوں سے وہ زیادہ چست، زیادہ باتونی، زیادہ مسخرہ اور زیادہ شرارتی تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ شرارتیں بھی بڑھنے لگیں تو گھر میں ماں کے پاس شکایتیں بھی آنے لگیں۔

جو کوئی شکایت لے کر آتا اُسے ہنس کر ٹال دیتی۔

''بھلا بچے شرارتیں نہیں کریں گے تو کیا بوڑھے کریں گے۔ بچے تو شرارتیں کرتے ہی اچھے لگتے ہیں۔''

لوگوں کو تو کسی نہ کسی طرح باتوں سے بہلا کر، لسی چھاچھ پلا کر بھیج دیتی مگر جوگی کے گھر میں گھستے ہی اس کی پٹائی ڈنڈے سے کرتی۔ ایک چھوٹا سا ڈنڈا اس نے صرف جوگی کی پٹائی کے لئے الگ رکھا ہوا تھا۔ رتن اور ویر ایک دم سے اُس کے بچاؤ کے لیے آ جاتے اور ماں سے چھڑا کر لے جاتے۔ پھر وہ رات کے کھانے سے پہلے ماں کے سامنے نہ آتا۔ جب ماں کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا تو وہ آواز دے کر اُسے کھانے کے لئے بلا لیتی۔ مار بھی وہ سب سے زیادہ ماں سے کھاتا تھا اور چپک کر سوتا بھی اُسی کے ساتھ تھا۔ گرمیوں کے دنوں میں چھت پر بستر لگ جاتے اور سونے سے پہلے تینوں بھائی خوب باتیں کرتے مستی کرتے اور جب وہ رسوئی کا سارا کام سمیٹ کر سونے کے لیے آتی تو وہ بھائیوں کو چھوڑ کر جھٹ سے ماں کے بستر پر آ جاتا۔ وہ سارے دن کی تھکی ہاری سونے کو بے چین اور یہ کھلے آسمان پر چمکتے تاروں اور چاند کی گردش نہارتا اور سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتا۔ ایک دو جواب دے دیتی پھر ڈانٹ کر اُسے باپو کے پاس چلے جانے کو کہہ دیتی تو اس کے بعد وہ اُس سے کوئی سوال نہ کرتا۔ بادلوں کے ٹکڑوں سے بنتی مختلف شکلوں کو دیکھ کر اُس سے رہا نہ جاتا۔ پھر وہ بھائیوں کے پیچھے پڑ جاتا۔

''ویر وہ دیکھو وہ شیر لگ رہا ہے نہ؟''

''اوے وہ دیکھو شیر کے ساتھ وہ کیا ہے؟ وہ تو جیتی کی دادی اور وہاں کیسے پہنچ گئی''؟

پھر تینوں بھائی مل کر اُن شکلوں کو دیکھتے، بحث کرتے اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ ہربنس جب ایک زوردار جھڑک دیتا تو سب چپ چاپ لیٹ جاتے اور ہلکی ہلکی کھُسر پھُسر کی آوازیں آتی رہتیں۔ ماں تینوں کو اس طرح ہنستا دیکھ کر بہت خوش ہوتی اور جب ہربنس اُنھیں چپ چاپ سونے کے لیے پھر ڈانٹنے لگتا تو وہ دھیرے سے کہتی۔

''کر لینے دو مستی بچوں کو یہ ہی عمر ہے۔''

اور وہ چپ چاپ تکیہ گردن کے نیچے سے نکالتا اور سر کے اوپر رکھ کر

سوجاتا۔

گُرمیت نے گھر کی، بچوں کی اور زمینوں کی ذمہ داری سب اپنے کندھوں پر لے رکھی تھی۔

بچوں کی پڑھائی کی ذمہ داری ہربنس پر ہی تھی۔ صبح سویرے وہ بھی تیار ہوکر دفتر کے لئے نکل جاتا۔ اس کا دفتر شہر میں گاؤں سے تقریباً چالیس کلومیٹر دور تھا۔ شام کو وہ تھکا ہارا جب گھر لوٹتا تو گُرمیت اُسے چھوٹی چھوٹی باتوں سے کبھی پریشان نہیں کرتی تھی۔ ہربنس بھی کوئی کام بیوی کی صلاح کے بنا نہیں کرتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ خود سے زیادہ اسے بیوی کے فیصلوں پر اعتماد تھا۔ اگر پتی بیوی کی عزت کرتا ہو تو بچے خود بخود ماں کی عزت کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ گھر کا مرکزی کردار تھی اور گھر کی کائنات اُس کے اردگرد گھومتی تھی۔

باپ سے زیادہ بچے ماں سے ڈرتے تھے۔ مگر جوگی پر تو کسی کا رعب نہیں چلتا تھا۔ وہ ماں کے غصے سے نہیں بلکہ اس کی ناراضگی سے ڈرتا تھا۔

جب کبھی بھی کوئی گاؤں میں یا اُن کے محلے میں شرارت ہوتی تو سب کے ذہن میں جوگی کا نام اُبھرتا۔ بچپن میں شرارتیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ گرمیوں کی دوپہر جب تیز لُو سے بچنے کے لیے لوگ گھروں میں آرام فرما رہے ہوتے تو موقع دیکھ کر وہ لوگوں کے دلان میں پڑے آم کے آچار کے مرتبان اُٹھا کر کسی اور جگہ پر رکھ دیتے یا اُن کے پاس وہ فہرست تیار ہوتی کہ کس کے گھر آم، امرود، لوکاٹ، انگور لگے ہوئے ہیں اور جب پھلوں کا موسم پورے شباب پر ہوتا تو موقع ملتے ہی اُسے اڑا جاتے۔ صبح تک درخت بالکل بیوہ کی سونی مانگ کی طرح سسک رہا ہوتا۔ سردیوں کی رات جب لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک کر رضائیوں میں گھُسے ہوتے تو یہ لڑکے چپ چاپ جا کر کھٹکھٹا آتے اور جب وہ رضائی سے نکل کر ٹھٹھرتا ہوا دروازہ کھولنے آتا تو وہاں کوئی بھی نہ ہوتا اور دوسری بار بھی جب یہ سب دوہرایا جاتا تو اندھیرے میں چھپے بچوں کو خوب گالیاں سُننی پڑتیں۔ کئی بار تو ایسے بھی ہوتا کہ دکانداروں کے بورڈ راتوں رات بدل دیے جاتے۔ لوگ صبح اٹھتے تو موچی کی دکان کے باہر ڈاکٹر کا بورڈ، نائی کی دکان کے باہر کپڑے والے کا بورڈ اور اسی طرح سب اُلٹ پلٹ ہو جاتا۔ ان سب شرارتوں کے پیچھے ایک ہی دماغ چلتا تھا اور وہ تھا جوگی کا۔ بڑی آسانی سے وہ بچوں کو اپنے پیچھے لگا لیتا تھا لوگ شکایتیں کر کے تھک چکے تھے اور گُرمیت سُن سُن کر عاجز آ چکی تھی۔

یہ بھی سچ ہے کہ شرارتی بچہ خود اپنا ہی سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔

شرارت شرارت میں دوستوں سے شرط لگالی اور بنا سوچے سمجھے سکول کی دوسری منزل سے چھلانگ لگادی۔ شرط تو جیت گیا مگر سر پر آٹھ ٹانکے لگانے پڑے۔

گرمیوں کی ایک دوپہر چند دوستوں کے ساتھ گھومتے گھومتے دریا میں نہانے پہنچ گئے۔ ابھی وہ تیرنے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ وہاں کھیلتے بچوں کے ایک دوسرے ٹولے سے زور زور سے ''بچاؤ بچاؤ'' کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک بچہ ڈوب رہا تھا اور مدد کے لیے چلا رہا تھا۔ آواز سنتے ہی جوگی اُس اور لپکا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ لہروں کے چنگل سے اُسے بچا لیا۔ اُس وقت اُس کی عمر کوئی چودہ برس کی رہی ہوگی۔ جو بھی سنتا تھا اس کے حوصلے کی داد دیتا۔ لوگوں نے اُسے ڈھیر ساری دعائیں دیں تو گرمیت کا سینا فخر سے تن گیا۔ عمر بڑھتی گئی تو شرارتوں کی نوعیت بھی بڑھتی گئی۔

کالج پہنچتے پہنچتے اُس کا قد چھ فٹ کا ہو گیا تھا۔ اپنے بڑے بھائیوں سے زیادہ قد نکال لیا تھا۔ ان دونوں کی طرح اُس نے بھی شہر میں داخلہ لے لیا تھا۔ سکول تو سکول کالج میں جاتے ہی اُس نے اپنی الگ پہچان بنالی تھی۔ وہ ایک مست ملنگ خوش طبیعت، خوش گفتار، چنچل شوخ طبیعت کا مالک ہمیشہ دوسروں کی مدد کرنے کو تیار۔ پہلے ہی سال وہ کالج کے الیکشن میں کُود پڑا اور اُن کا نمائندہ چُن بھی لیا گیا۔ بہت سی لڑکیاں اُس پر دل وجان سے فِدا تھیں پر اُس نے کبھی اُنھیں توجہ ہی نہیں دی۔ ہاں کبھی کبھی وہ جیتی کو ضرور اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھا کر لے جاتا تو لڑکیاں دل ہی دل میں جیتی سے جل کر رہ جاتیں۔ جیتی اُس کے گاؤں کی رہنے والی ایک سیدھی سادی ذہین لڑکی تھی جو جوگی کے ساتھ کھیلتے کُودتے ہی جوان ہوئی۔ وہ تو خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اُس کے دل میں بھی جوگی کی لو لگ چکی ہے۔ یہ احساس تو اُسے اس روز ہوا جب وہ ایک شام اُس کے موٹر سائیکل پر سوار کالج سے واپس گھر آ رہی تھی کہ اچانک آسمان پر چھائے بادل ٹوٹ کر برس پڑے۔ مجبوراً انہیں ایک گھنے پیڑ کے نیچے سہارا لینا پڑا۔ سر سے پاؤں تک دونوں بھیگ چکے تھے۔ بارش تھی کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بادلوں نے شام سے پہلے ہی شام کر دی تھی۔ بھیگے جسم سے چپکا لباس اور اُوپر سے ڈھلتی شام جیتی کو بے چین کر رہی تھی:

''جوگی چل نکل چلتے ہیں موسم تو ٹھیک ہونے والا نہیں۔ گھر پر ماں بھی فکر کر رہی ہوگی۔''

''موسم خراب ہے راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔ کوئی حادثہ ہو گیا تو کیا منہ دکھاؤں گا تیرے گھر والوں کو۔''

''مگر جوگی ابھی تو روشنی ہے نکل جاتے ہیں اگر بارش نہ رکی اور رات ڈھل گئی تو کچھ دکھائی نہ دیگا:''

کچھ پل وہ خاموش سوچتا رہا۔

''کہتی تو تُو ٹھیک ہے۔ چل پھر رب کا نام لے کر چل پڑتے ہیں۔''

دونوں درخت کی چھاؤں سے نکلے اور دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگے۔ کئی جگہ پھسلن کی وجہ سے موٹر سائیکل ڈولنے لگا تو جیتی گرتے گرتے بچی۔

''پکڑ کر بیٹھ جا مجھے۔ کھا نہیں جاؤں گا تجھے۔ بس تجھے صحیح سلامت گھر پہنچا دوں۔''

اور اُس نے گرنے سے بچنے کے لیے اُسے کس کر پکڑ لیا۔ شاید جوانی کی ترنگ، موسم کا خُمار یا قربتوں کا لمس نہ جانے وہ کیا تھا کہ دونوں کے دل دھڑک اُٹھے۔ بارش برستی رہی اور جسم کے ساتھ ساتھ دل بھی ایک اچھوتے جذبات میں بھیگتے رہے۔ دونوں نے اک دوسرے کی دھڑکنیں محسوس بھی کیں پر اُس وقت اُسے سمجھ نہ پائے۔ جوگی نے اسے صحیح سلامت گھر پہنچا دیا تو جیتی کی ماں اُسے بلاتی رہی مگر یہ کہہ کر وہاں سے چلا آیا کہ

''بے بے راہ دیکھ رہی ہوگی۔'' وہ نہیں چاہتا تھا کہ جیتی اُس کی آنکھوں کو پڑھ لے۔

اُس دن کے بعد دونوں ایک ان کہے رشتے میں بندھ گئے تھے۔ وہ رشتہ خاموش محبت کا تھا جس میں انھوں نے لفظوں سے اظہار کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

شاید یہ ہی وہ خاموش رشتہ تھا کہ جوگی کے چلے جانے کے بائیس سال بعد بھی اُس کے دل کے تار آج بھی اس سے جڑے ہوئے تھے۔ اس برسات کے بعد وہ کبھی بارش میں نہیں بھیگی تھی۔ جوگی کے لمس کی خوشبو اس کی رگوں میں بس چکی تھی۔ اس نے وہ پل اپنے دل میں ایسے بسائے تھے جیسے سیپ میں موتی۔ آج وہ کسی اور کی بیوی تھی ایک جوان بیٹی کی ماں جسے وہ خوشی خوشی بیاہ کر رخصت کر رہی تھی۔ اُس نے جوگی کے گھر سے کبھی رشتہ ٹوٹنے ہی نہیں دیا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ جوگی کے بے بے کو بہت اصرار کے بعد شادی میں آنے کے لیے راضی کر سکی تھی۔

اُس روز بھی برسات جم کر ہو رہی تھی جب جوگی ضد کر کے کالج کے ٹُور پر سات دن کے لئے جموں جا رہا تھا۔ گرمیت اُسے بھیجنے کو بالکل راضی نہ تھی۔ ہربنس نے اُسے بڑی مشکل سے راضی کیا۔

''دیکھ گرمیتے بچے جوان ہو گئے ہیں۔ اب تُو اُنھیں اپنے پلّو سے تو باندھ کر نہیں رکھ سکتی۔ جانے دے اِسے۔''

''آپ تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے میں نے انھیں باندھ کر رکھا ہو۔ بچے جوان ہو جائیں تو کیا ماں باپ کو اپنی زبان بند کر لینی چاہیے؟''

''میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا تم بات کو بے وجہ بڑھا رہی ہو۔''

''بات ایسے ہی بڑھتی ہے۔ ان کو اپنی من مانی کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ میں نے لاکھ سمجھایا رتن کو کہ اپنے ملک میں کیا نہیں اپنے گھر میں بھی سب کچھ ہے پھر ودیش جانے کی کیا ضرورت؟ سنی اُس نے ہماری۔ اپنی مرضی کے مالک ہیں ماں باپ کو مجبور کر دیتے ہیں بات منوانے کے لئے۔

یہ نیا چلن چال پڑا ہے زمینیں بیچتے جاؤ اور ودیشوں میں بستے جاؤ چاہے وہاں جا کر گھٹیا سے گھٹیا کام ہی کیوں نہ کرنا پڑے بے شک عزت نہ ملے پر رہیں گے وہیں۔ پیچھے سے بوڑھے ماں باپ چاہے جیئیں یا مریں''۔ یہ کہہ کر وہ زار زار رونے لگی۔

''دیکھ گرمیتے تو کہاں کی بات کہاں لے گئی۔ رتن کا غصہ اب جوگی پر اتارے گی چل چپ کر۔ ایسے نہیں روتے''۔

جوگی باہر کھڑا سب باتیں سُن رہا تھا۔ اُسے تو یہ امید تھی کہ باپو منا لے گا بے بے کو مگر ماں کو اس طرح روتا دیکھ وہ اندر آ گیا۔

''بے بے روکیوں رہی ہے میں کہیں نہیں جا رہا۔ جموں تو بہت دور کی بات ہے تو کہے گی تو میں رب کے پاس بھی نہ جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ ماں کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''تو بھی اُنھیں کا بھائی ہے ایک دن تو بھی چلا جائے گا گاؤں چھوڑ کر۔ پڑھ لکھ کر کون رہنا چاہتا ہے یہاں''۔

''بے بے وعدہ ہے میرا تجھ سے میں گاؤں میں ہی رہوں گا۔ سیاست کرنی ہے مجھے اور اپنی زمینوں اپنے گاؤں کو بہت آگے لے کر جانا ہے۔ تجھے بھروسا ہے نہ اپنے بیٹے پر۔''

''ہٹ پیچھے جا چلا جا اپنے دوستوں کے ساتھ''۔

گرمیتے نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''دل سے کہہ رہی ہے نا بے بے''؟

''ہاں ہاں دل سے کہہ رہی ہوں۔ بس اپنا خیال رکھنا۔''

''تو فکر نہ کر بے بے ایک ہفتے کی تو بات ہے''۔

گرمیت کو کیا پتا تھا کہ ایک ہفتے کا انتظار صدیوں میں بدل جائے گا۔

اور پھر بارش تو اُس دن بھی ہو رہی تھی جب جوگی کے جانے کے چار روز بعد ہی یہ خبر آئی تھی کہ وہ لاپتا ہو گیا ہے۔ ہوا یوں کہ دوستوں کے ساتھ دریا میں نہانے چلا گیا۔ پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ اُنھوں نے تیرنے کا پروگرام رد کر دیا مگر کسی لڑکے نے چنوتی دی تو شرط لگ گئی اور وہ شرط پوری کرنے دریا میں کُود پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی اُسے بہا کر نہ جانے کہاں لے گیا۔ خبر ملتے ہی ہر بنس چند رشتے داروں کے ساتھ جموں کے لئے روانہ ہو گئے۔ گُرمت بس ہربنس اور جوگی کے لوٹنے کی دعائیں کرتی رہی۔ اپنے آپ کو بار بار تسلی دے رہی تھی کہ ''رب سب ٹھیک کرے گا۔ وہ اتنا بے رحم نہیں ہو سکتا''۔

نہ کچھ ٹھیک ہونا تھا نہ ہوا۔ جموں پولیس نے لڑکوں کے بیان لئے اور غوطہ خوروں نے جال پھینک کر بھی تلاش شروع کر دی مگر اُس کا کہیں کوئی سراغ نہ ملا۔ تین روز بعد ہی وہ خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح جو اپنی زندگی کی پونجی گوا کر گھر واپس لوٹتا ہے۔ یہ خبر آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی اور لوگ جوگی کی بے وقت جوان موت کا افسوس کرنے گرمیت کے پاس جا پہنچے مگر وہ لوگوں پر اُلٹے برس پڑی۔

''یہاں کوئی تماشا لگا ہے جو دیکھنے آئے ہو۔ میرا بیٹا مرا نہیں لاپتا ہوا ہے۔ اگر لاش مل جاتی تو افسوس کرنے آتے۔ زندہ لوگوں کا ماتم نہیں کرتے۔ اگر تم میرے اپنے ہو تو بس دعا کرو کہ وہ جدھر بھی ہو صحیح سلامت ہو۔ دیکھ لینا

ایک دن وہ لوٹ کر آئے گا یہاں میرے پاس اپنے گاؤں میں۔ وعدہ کیا ہے اُس نے مجھ سے اور وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اب جاؤ سب اپنے اپنے گھروں کو۔ اُس نے اتنا کہا اور ہاتھ جوڑ دیئے۔ پھر گھر کا دروازہ بند کیا اور صحن میں آ کر رسی پر نڈھال گر پڑی۔ اُس روز بارش نے جیتی کے آنسو ضبط کر کے اُسے رسوا ہونے سے بچا لیا تھا۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ شاید صدمے کی وجہ سے ماں کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے وہ سچ کو قبول نہیں کرنا چاہتی۔ مگر گرمیت کا یقین اتنا پختہ تھا کہ کوئی اسے ڈگمگا نہ سکا۔ جوگی کے لئے وہ تڑپتی تھی اُسے یاد کرتی تھی پر آنکھ سے کبھی آنسو چھلکنے نہیں دیئے۔ ہربنس جانتا تھا کہ اُس کی بیوی بہت مضبوط ہے پر وہ اُس سے زیادہ کمزور ہوگا یہ اُسے اب معلوم ہوا تھا۔ وقت گزرتا گیا اور گزرتے وقت کے ساتھ سب نے سمجھوتہ کر لیا کہ جوگی اب کبھی لوٹ کر نہ آئے گا مگر بے بے کا انتظار برقرار رہا۔ اُسے یقین تھا کہ اک روز دروازے پر بنا دستک دیئے اک دم سے اُس کے سامنے آ کھڑا ہوگا۔

دُنیا کے کاروبار بدستور چلتے رہے۔ گھر میں دونوں بیٹوں کی شادی رچائی گئی۔ بہوویں گھر میں آئیں اُس کے گھر میں رونق تھی پر دل کا خالی کونہ روتا رہا سسکتا رہا پر آنکھ سے ایک قطرہ بھی گرنے نہ دیا۔ ضبط کا دامن تو اُس روز چھلکا جب ایک دن جیتی اُس کے پیروں میں پڑ کر گڑگڑانے لگی:

''آپ سے ایک بات کرنی ہے چاچی۔''

''بول بیٹی کیا بات کرنی ہے تجھے؟''

''میرے ماں باپ میری شادی طے کر کے آئے ہیں پر میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

''کیوں؟''

وہ خاموش رہی۔

''لڑکا پسند نہیں کیا؟''

''تو مجھے اپنے گھر میں رکھ لے چاچی۔ میں تیرے گھر کا سارا کام کروں گی تیرا خیال رکھوں گی پر مجھے پرایا نہ کر''۔ اس نے بڑھ کر جیتی کو سینے سے لگا لیا۔ اُس روز وہ بہت روئی تھی۔ اُس نے دل پر کوئی روک نہیں لگائی۔

''جوگی آ جاتا تو میں تجھے اس گھر کی رونق بنا لیتی۔ پتا نہیں وہ کب لوٹ کر آئے گا۔ تو بھلا اس کے لیے کیوں اپنی زندگی برباد کرتی ہے جس نے کبھی تجھ سے کوئی وعدہ بھی نہیں کیا۔ جا بیٹی اپنے ماں باپ کا بوجھ ہلکا کر۔'' اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر وہ وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔

گزرتے وقت کے ساتھ نئے پھول پودے کھلے تو پرانے پتے جھڑنے لگے۔ ہربنس اتنی جلدی دُنیا چھوڑ کر جانے والا تو نہ تھا اُسے تو بس بیٹے کا روگ اور بیوی کا اندر ہی اندر سلگنا لے ڈوبا اور وہ گرمیت کو دیو کے حوالے چھوڑ کر چل بسا۔ اُس نے تو ہربنس کے آخری وقت اُس کے سرہانے بیٹھے شکایت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ بیچ سفر کے اکیلے چھوڑ کر جا رہے ہو''۔ وہ سب سُن رہا تھا پر جواب دینے کی قوت اُس میں نہ تھی۔ آنکھوں سے ہی کچھ بیاں کیا۔ جو وہ سمجھ گئی۔

''میں تو ابھی جانے والی نہیں۔ معاف کرنا اس وقت میں تمہارا ساتھ بھی نہیں دے سکتی۔ ہو سکے تو رب کو یہ سفارش ضرور کرنا کہ اس سے ملے بنا مجھے بلائے نہ۔''

اور وہ ہلکے سے مسکرا دیا۔ ایک عورت کے کتنے روپ ہوتے ہیں پر ماں کا روپ سب سے الگ سب سے پیارا۔ ماں کے کردار کے آگے بیوی کا کردار بھی ہار جاتا ہے۔

سردیوں کی ایک دوپہر وہ صحن میں بیٹھی دیو کے بچوں کے لئے سویٹر بُن رہی تھی کہ اس کا بڑا پوتا بھاگتا ہوا سیدھے اُسی کے پاس آیا۔

''بے بے کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔''

''کون ہے؟'' اس نے عینک ٹھیک سے لگاتے ہوئے دیکھا۔

دروازے پر دو اجنبی کھڑے تھے۔

''اندر آ جاؤ۔ کس سے ملنا ہے آپ کو''

''یہ جوگی کا گھر ہے؟''

اتنے سالوں کے بعد کسی اجنبی سے جوگی کا نام سن کر وہ چونک اُٹھی۔

''آپ کون ہیں اور جوگی کو کیسے جانتے ہو؟''

''جی ہم دِلی سے آئے ہیں۔ آپ سے کچھ ضروری جانکاری حاصل کرنی ہے۔''

''اس نے بہو کو آواز لگائی اور اُسے چائے لانے کو کہا اور اُن سے باتیں کرنے لگی۔''

''آپ جوگی کی ماں ہیں شاید؟''

''شاید نہیں میں ہی اُس کی بے بے ہوں۔ پوچھو کیا پوچھنا ہے''۔

''گھر میں کون کون ہیں؟''

''اس وقت تو میں اور میری بہو ہی ہیں۔ میرا منجھلا بیٹا کام کے سلسلے میں باہر گیا ہے۔''

''آپ کے شوہر؟''

''وہ اس دنیا میں نہیں رہے''

''سنا ہے آپ کا بیٹا جوگی کئی سالوں سے لاپتا ہے۔ اس کے بارے میں کبھی کسی سے کوئی خبر ملی کہ وہ زندہ ہے یا.....''

''دنیا سمجھتی ہے کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہے پر میرا دل یہ بات ماننے کو تیار نہیں۔ وہ دنیا کے کسی کونے میں زندہ ہے۔ ایک دن آئے گا ضرور۔ مگر آپ اُس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو وہ بھی اتنے سالوں بعد؟''

''ہم سرکاری لوگ ہیں منسٹری سے آئے ہیں۔ چند لوگوں کی

شناخت کرنی ہے اُن میں سے ایک آپ کا بیٹا بھی ہے''۔

''میرا جوگی مل گیا۔ کہاں ہے وہ؟'' اس کی ویران آنکھیں چمک اٹھیں۔

''ہم آپ سے جو جانکاری لینا چاہتے ہیں وہ آپ ہمیں دے دیں۔ اس کی چند تصویریں بھی۔''

''آپ نے جو پوچھنا ہے پوچھئے''۔

پھر جو جو وہ پوچھتے گئے وہ بتاتی گئی۔ اُس نے جوگی کی بچپن اور جوانی کی تصویریں بھی اُنھیں لا کر دے دیں۔ جاتے وقت وہ اتنا ضرور کہہ گئے کہ ''لگتا ہے آپ کا یقین جیت جائے گا۔ وہ لڑکا شاید آپ کا جوگی ہی ہے جو اس وقت سرحد پار جیل میں ہے۔ بہت جلد آپ کو پوری جانکاری مل جائے گی۔''

''کیا کہا آپ نے کیا وہ پاکستان جیل میں ہے؟''

''وہاں کیسے پہنچ گیا؟''

''دریا پر سرحدیں نہیں ہوتیں۔ پانی اُسے بہا کر دوسری طرف لے گیا اور وہیں سے اس کی بدقسمتی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ لوگ اُسے جاسوس سمجھ بیٹھے۔ کوشش کرتے ہیں اُسے بے گناہ ثابت کرنے کی۔''

''جیندہ رہ پت جیندہ رہ''۔ خوشی سے اس کی آنکھیں چھلک اُٹھی تھیں۔ اب تک یہ بات آدھے گاؤں میں پھیل چکی تھی کہ جوگی کے گھر سرکاری آدمی آئے ہیں۔

''میں تو ہمیشہ سے ہی کہتی تھی وہ واپس آئے گا ضرور۔ لوگ مجھے پاگل سمجھتے تھے۔ کب تک آجائے گا وہ۔''

''شاید دو تین مہینوں میں یا پھر دو تین سالوں میں۔ ہم کوشش تو ضرور کریں گے آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔''

''بیٹا ایک بات کا خیال ضرور کرنا کہ میں زندگی کے اُس موڑ پر کھڑی ہوں کہ پتا نہیں کب بُلاوا آجائے۔ مرنے سے پہلے ایک بار اُسے دیکھنا چاہتی ہوں''۔

''ہم پوری کوشش کریں گے باقی تو جو اوپر والے کو منظور۔''

اتنا کہہ کر وہ تو وہاں سے چلے گئے مگر گرمیت کا انتظار بڑھ گیا۔ اب وہ سرحد سے آنے والی ہر خبر دھیان سے سنتی تھی۔ اُسے نہیں معلوم کہ وہ سرحد پار کس شہر م، کس جیل میں ہے۔ اس سے کیسے ملے گی، کب ملے گی بس ہر روز صبح اُٹھ کر اپنے رب سے یہی دعا کرتی ہے کہ ''ربا اتنی مہلت دے دینا کہ میں اُس سے مل سکوں۔ اک بار اُسے دیکھ لوں اسے سینے سے لگا لوں''۔

اس خبر کو ملے بھی تین سال گزر چکے ہیں۔ گاؤں کے کچھ لوگ ویر اور جیتی کے شوہر کے ساتھ مل کر جوگی کا پتا لگانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ اب بے بے کو معلوم ہے کہ اس کا جوگی لاہور میں ہے۔ جیتی اور لاڈو شادی کے بعد اسے لاہور لے کر جائیں گے۔ گرمیت شادی کی رسوم پوری ہونے کا شدت سے انتظار کر رہی ہے۔

۔ایک نمکین غزل۔

○

اگر شعر لکھنا کچھ آسان ہوتا
تو اپنا بھی آج ایک دیوان ہوتا

نہ شہرت سی باندی میرے گھر کی ہوتی
زمیں تا فلک ایک ہیجان ہوتا

کوئی میرؔ سے میرِ مجلس نہ ہوتے
نہ غالبؔ سا شعراء کی پہچان ہوتا

یہ قاضیؔ، مشرفؔ نہ شہبازؔ ہوتے
جمالیؔ، شجاعتؔ نہ عمرانؔ ہوتا

نہ مشہدؔ، نہ تبریزؔ و شیرازؔ ہوتے
پشاورؔ، نہ پنڈیؔ نہ ملتان ہوتا

یہ سُنّی، وہ شیعہ، وہابی نہ ہوتے
ہر انساں فقط اِک مسلمان ہوتا

اگر میرؔ و غالبؔ سے شاعر نہ ہوتے
تو اپنا بھی شعراء میں امکان ہوتا

حقیقت یہی ہے کہ دونوں بڑے ہیں
وہ شعراء میں سب سے آگے کھڑے ہیں

ممتاز احمد
(برمنگھم، برطانیہ)

His Master`s Voice

گلزار جاوید (راولپنڈی)

ڈیئر جمی خوش رہو!

بیٹا! بھیجا ہم نے تمہیں ایجوکیشن کے لئے تھا مگر تم تو ہمارے ہی ٹیوٹر بن بیٹھے۔ دیکھو نا! چھوٹا ہونے کے باوجود تم نے میل میں ناصحانہ انداز اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لئے تمہیں اپنی میل میں بقراطیت اور فلسفہ بھی ٹھونسنا پڑا۔ میں سمجھتا ہوں یہ خیالات تمہارے اپنے نہیں تمہاری سوچ کے پیچھے His Master`s Voice دکھائی دیتی ہے .....

بیٹا! میں پند و نصائح کے خلاف نہیں اور نہ ہی میرا شمار قنوطیوں میں ہوتا ہے مگر مائی سویٹ سن میرے خیال میں! آج کے مادی دور میں ان باتوں پر عمل کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ میرا دعویٰ ہے عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد تم اپنی اس سوچ کو حماقت جان کر ہنسنے کے علاوہ اپنی عقل کا ماتم بھی کیا کرو گے۔ میں اگر مبالغہ سے کام لوں تب بھی تم میری جوانی کے مقابلے میں ایک بٹہ چار انقلابی بھی نہیں! میری حقیقت پسندی کے پیچھے تلخ تجربات اور مشکل حالات کی طویل فہرست گنوائی جاسکتی ہے جس کا یہ موقع ہے اور نہ وقت۔ میں اب بھی تحریر تقریر اور تبلیغ کی حد تک ان باتوں کا قائل ہوں مگر میرے عزیز بیٹے حقیقت کی دنیا سے ان باتوں کا دور کا بھی واسطہ نہیں .....تم ہی سوچو! ایک ویل ایجوکیٹڈ بیٹے کا اپنی ممی سے یہ دریافت کرنا کہ چھ کروڑ تیس لاکھ کا بنگلہ اور ایک کروڑ پچپن لاکھ کی موٹر خریدنے کے بعد پپا کے پاس اتنی دولت کہاں سے آ گئی کہ آپ لوگ ورلڈ ٹور پر جا رہے ہیں۔ اول تو تمہیں یہ حق کس نے دیا کہ تم ہم سے اس قسم کے بے ہودہ سوالات کرو' حق و ناحق حلال و حرام کی تعلیم دو۔ سچ تو یہ ہے بیٹا! جو فضول باتیں تم نے لکھیں ہیں اگر میں ان پر کاربند رہتا تو آج تم بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کے بجائے اپنے ملک کی کسی بدبودار گلی کی ٹٹ پونجیا درسگاہ میں' ٹاٹ پر بیٹھے دقیانوسی کتابیں رٹ رہے ہوتے یا کسی مستری کی دوکان پر لوہا کوٹ رہے ہوتے۔ میرے لختِ جگر! یہ انقلابات کا دور ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کے انقلابات کا دور' صنعتی' معاشی اور ثقافتی انقلابات کا دور' یہ دور' تیز دوڑنے کا ہے جس نے ذرا سی بھی غفلت برتی وہ سدا کے لئے پیچھے رہ گیا۔ اس تیز رفتاری میں وہی لوگ کامیاب و کامران ٹھہرتے ہیں جن کی نگاہ ہمہ وقت اپنے ٹارگٹ پر جمی رہتی ہے۔ ہمارا معاشرہ اور باتوں میں بیک ورڈ سہی مگر اس معاملہ میں ہمارے ہاں زوردار طریقے سے مقابلہ جاری ہے۔ یاد رکھو جنٹلمین! حلال و حرام حق و ناحق میں بزدل لوگ وقت ضائع کیا کرتے ہیں۔ ان کی کم ہمتی انہیں ایسی فضول باتیں سوچنے پر اکساتی ہے۔ میرے بلکہ ہر ہوش مند آدمی کے نزدیک آج کی سب سے بڑی حقیقت پیسہ! ہر قیمت پر..... ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ کے سبب آج کی صحبت یہیں ختم کرتے ہیں۔ تمہارے لئے سپورٹس کار بک کرا دی گئی ہے۔ شہر کے وسط میں تمہاری من پسند جگہ پر پلازہ کی تعمیر کے لئے پلاٹ خریدا جا چکا ہے۔ کنسٹرکشن کمپنی کی رجسٹریشن کی درخواست دی جا چکی ہے۔ فیکٹری والے پلاٹ پر انڈسٹریل لون کی سینکشن ملنے والی ہے اور میجنگ ڈائریکٹر کے طور پر تمہارا تقرر عمل میں آ چکا ہے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

تمہارا پپا

جان سے پیارے جمی ڈارلنگ!

سدا خوش رہو اور پھولوں کی طرح مسکراتے رہو!!

ہم لوگ بڑی شدت سے تمہاری میل کا انتظار کرتے ہیں اور تم اپنی میل میں نہ جانے کیا کچھ لکھ بھیجتے ہو۔ تمہارے پپا کو اس قسم کی باتیں بالکل بھی پسند نہیں۔ تم تو جانتے ہو وہ اپنے اصولوں کے کتنے پکّے ہیں..... یہاں تو تم ایسے نہ تھے۔ باہر جا کر خدا معلوم تم کیوں اتنے بیک ورڈ ہو گئے ہو۔ تمہیں تو معلوم ہے تمہارے پپا کتنا ہارڈ ورک کرتے ہیں۔ ڈاکٹرز کی ایڈوائس کے اگینسٹ ورکنگ شیڈول جاری رکھتے ہیں۔ کس لئے؟ ..... کس کے لئے؟ ..... ہمارے لئے ڈیئر' ہمارے لئے۔ تمہیں پتا نہیں پچھلے دنوں ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق ٹینشن لینے سے شوگر شوٹ اپ ہونے کے ساتھ کولیسٹرول کا لیول بھی ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ آج کل میڈیکل بورڈ جس میں فزیشن سائیکاٹرسٹ اور ڈائی ٹیشن شامل ہیں ان کا ٹریٹمنٹ کر رہا ہے۔ بریک فاسٹ میں دو سلائس براؤن بریڈ کے اور ایک کپ بلیک ٹی و دآؤٹ شوگر لیتے ہیں۔ لنچ میں مٹن یا چکن سوپ کے ساتھ ایک چپاتی کے علاوہ کچھ بھی نہیں لیتے۔ ڈنر میں ڈاکٹرز نے سی فوڈ یا ویجیٹیبل سوپ لینے کو کہا ہے مگر وہ اوائیڈ کر جاتے ہیں۔ اکثر بلیک کافی کا ایک کپ لے کر بیڈ روم میں چلے جاتے ہیں اور میرے کلب سے واپسی تک فائلز میں بزی رہتے ہیں۔ ڈیئر جمی! ڈرنک اب بھی تمہارے پپا سے نہیں چھوٹ رہی۔ ڈاکٹرز کے اسٹک لی بین کے باوجود ''رائل سلیوٹ'' یا ''شیواز ریگل'' کے ایک دو پیگ ضرور لیتے ہیں۔ تم میری ہیلتھ کے بارے میں سنسیٹو لگتے ہو تبھی تم نے کچھ ایڈوائیزز بھیجے ہیں۔ میری اتنی فکر نہ کیا کرو۔ سوئٹ ہارٹ! میں اب بیٹر فیل کر رہی ہوں البتہ! ڈائٹنگ جاری ہے۔

Do you believe I lose my weight by ten Poundes,But waist is still Thirty Eight

آج کل ایک پرابلم اور ہے سویٹ ہارٹ' میرے نئے سلمنگ سنٹر کی ڈائریکٹر مسز جواد نے اپائنٹمنٹ بہت ارلی دی ہوئی ہے۔ میں نے بڑی ریکوسٹ کی **But she is so bussy** اب دیکھو نا! گیارہ بجے سلمنگ سنٹر پہنچنے کے لئے ارلی مارننگ یعنی دس بجے اٹھنا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ

سے سارا دن ٹینشن میں گزرتا ہے۔تھک بھی جلد جاتی ہوں۔آج کل کلب کی ایکٹی ویٹیز بھی برائے نام رہ گئی ہیں۔جلد واپسی کے باعث ساری فرینڈز مجھے ٹانٹ کرتی ہیں۔کہتی ہیں تم بیک ورڈ ہوتی جارہی ہو۔بارہ بجتے ہی کلب سے چلی جاتی ہو۔بٹ ڈیئر کہتی تو وہ ٹھیک ہیں۔بیٹا!بارہ بجے تو کلب کی ایکٹی ویٹیز ٹاپ پر ہوتی ہیں۔مگر کیا' کیا جاسکتا ہے۔دل نہ چاہتے ہوئے بھی واپس لوٹنا پڑتا ہے۔

حرارہ اچھی ہے۔تمہارے بھیجے ہوئے میوزک ایکیوپ منٹ سے بہت انجوائے کرتی ہے۔وہ بھی جلد تمہیں میل کرے گی!دل تو نہیں چاہتا تم سے بچھڑنے کو مگر بیٹا! مسز شاہ کے یہاں پارٹی پر جانا ہے تم تو جانتے ہو ان کی ناراضگی ہم لوگ افورڈ نہیں کر سکتے۔اجازت دو اپنا خیال رکھنا اور فون کرنا نہ بھولنا۔ گڈ بائی

تمہاری مما

مائی ڈیئر جمی برادر!

میری کرسمس اور ہیپی نیو ائیر!!

بائی دی وے! تم نے کرسمس کہاں منایا اور نیو ائیر کہاں منانے کا پروگرام ہے؟ YouCan`tbelieve میں تمہیں کتنا مس کرتی ہوں۔ لاسٹ ائیر ہم لوگوں نے کرسمس ریٹا کے گھر منایا تھا تم تو اپنی فرینڈز میں ایسے غائب ہوئے کہ میری خبر تک نہ لی اور میں اکیلی جمشید کی بور کمپنی برداشت کرتی رہی۔ایک بات ہے ڈیئر! جمشید اتنا ڈفر نہیں جتنا نظر آتا ہے ؟اور سیکنڈ لاسٹ ائیر یورپ کا نیو ائیر تو میں کبھی نہیں بھول سکتی۔یاد ہے جب ہم لوگ سیون سٹار ہوٹل کی گیارہویں فلور پر نیو ائیر منا رہے تھے۔ایگزیکٹ بارہ بجے ہوٹل کی بتیاں بجھا دی گئی تھیں اور ہم دونوں ایک دوسرے کے دھوکہ میں ڈورتھی اور فلپ سے گلے مل کر ہیپی نیو ائیر کہہ بیٹھے تھے۔تمہارا تو پتہ نہیں .....But I چھوڑو پرانی باتیں !یہ بتاؤ آج کل تمہاری کیا ایکٹی ویٹیز ہیں۔میرا مطلب ہے اسٹڈی جیسے بور کام کے علاوہ انجوائے بھی کرتے ہو کہ نہیں' اب تک کتنی گرل فرینڈز بنائیں۔دو کے نام ضرور لکھنا' امید ہے میرا تعارف کرا دیا ہوگا!میں بھی انہیں فون پر ہیلو کرنا پسند کروں گی بشرطیکہ تم نے فون نمبر دیئے کیونکہ تم ہمیشہ ہی اپنی گرل فرینڈز کو مجھ سے چھپاتے رہے ہو۔تم نے میری ایکٹی ویٹیز کے بارے میں معلوم کیا ہے ۔تمہیں تو پتہ ہے میں ہفتہ میں تین دن سے زیادہ یونیورسٹی جانا افورڈ نہیں کر سکتی اور لیکچر سننا تو میرے لئے دنیا کا بورترین کام ہے۔جب سے مما نے نیا سلمنگ سنٹر جوائن کیا ہے میری تو سختی آ گئی ہے مما کے ساتھ مجھے بھی ارلی اٹھنا پڑتا ہے البتہ!ایک گڈ نیوز ہے وہ یہ کہ میں نے یوگا کی کلاس کے علاوہ ڈانس پریڈ بھی شروع کر دیا ہے بائی گاڈ بڑا چارمنگ ہے ہمارا ڈانسنگ ٹیچر' پریکٹس کے دوران کئی بار وہ Just like "u" Bent ہو جاتا ہے اور سٹیمنا تو اتنا ہے تھاؤزنڈ میٹر ریس میں فرسٹ پرائز ایزی لی لے۔

اور ہاں پارٹنر! میرا بوائے فرینڈ تھا نا وہ کیا نام تھا اس کا فاری!اس سے میں نے کٹ آف کر لیا ہے۔بڑا فلرٹ تھا وہ' جانتے ہو اس نے کیا کیا؟ مسز فاطمی کو ان کے برتھ ڈے پر ڈائمنڈ سیٹ پریزنٹ کیا اور میرے سامنے ان کے گلے میں' اس چیپ انسان نے خود پہنایا۔اوہ مائی گاڈ جمی! میں تمہیں بتا نہیں سکتی اس وقت میں کتنا ڈیپریس ہوئی۔ویسے علی رضا آج کل میرے اندر بہت انٹرسٹ لے رہا ہے۔ہر روز اپنی تھری ڈور رینج روور لے کر آ جاتا ہے۔Believe Me ہماری بی ایم ڈبلیو کے سامنے بہت ہی چیپ لگتی ہے۔اس بچارے کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ آج کل سوسائٹی میں Move کرنے کے لئے لینڈ کروزر' پٹرول' اکارڈ' مرسڈیز یا بی ایم ڈبلیو کا ہونا کتنا ضروری ہے۔وہ بیچارہ کیا کرے DuetoEnquiry اس کے فارور پر ڈاؤن فال آیا ہوا ہے۔Agin Good News for You کہ میں نے پہلے سے بہت امپروو کیا ہے Now I am 36-26-36 یونیورسٹی فیلوز میں میری اسمارٹنس کے بہت چرچے ہیں۔جلد ہی یوگا اور ڈانس کی سی۔ڈیز ریکارڈ کر کے بھیجوں گی۔تم بھی پلیز! میڈونا کے سی۔ڈیز جلد بھیج دو۔کٹی' کبرا اور فائزہ کی بھی ڈیمانڈ ہے۔لائف میگزین کا لیٹسٹ ایشو ہرگز نہ بھولنا اور فون کرنا تو تم واقعی بھول چکے ہو' تمہیں بوریت سے بچانے کے لئے خط بند کرتی ہوں۔

God Bless You

حرارہ

ڈیئر مما پپا!

میں آپ لوگوں کو پہلے بھی کئی بار لکھ چکا ہوں کہ آپ مجھے بھول جایئے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے اس کے باوجود بھی آپ لوگ مجھے ڈسٹرب کرنے سے باز نہیں آتے۔میرے پاس فالتو وقت نہیں کہ میں آپ کو تفصیلی حالات سے باخبر کرتا رہوں۔یہ میل بھی میں جلدی میں کر رہا ہوں۔میں نے آپ کا گفٹ کیا ہوا فلیٹ سیل کر دیا ہے مجھے ڈرگس کے لئے ڈیلی کافی پیسہ درکار ہوتا ہے میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ اس کے کمرے میں شفٹ ہو گیا ہوں۔You Know یہاں پر لڑکے کا لڑکے کے ساتھ لَو افیئر بہت اِن ہے اور جان تو ہے بھی بہت خوبصورت' میں اس سے لَو کرتا ہوں۔پاکستان میں تو لڑکا' لڑکی تک ایک ساتھ نہیں رہ سکتے پھر بھلا! میل افیئر کی کہاں گنجائش ہے؟اور میں جان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا سو اب میں واپس نہیں آؤں گا۔کیا آپ اور آپ کا عدم برداشت پر مشتمل معاشرہ کسی بھی طور شخصی آزادی کو برداشت کرنے کا متحمل ہو سکے گا!!!

Don`t worry I will be all right. Love to hrara

Take care by

جمی

''خواب ناتعبیر''

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ بھارت)

سارا عالم اک ترے جانے سے بیگانہ ہوا
یُوں جہانِ رنگ و بو اُجڑا کہ ویرانہ ہوا

خوابِ ناتعبیر ایک ایک یارانہ ہوا
اَجنبی ٹھہرا ہے اب ہر چہرہ پہچانا ہوا

ریزہ ریزہ ہو کے بکھرا دَہر میں میرا وجود
جب سے یہ ہنستا ہوا گھر ایک غم خانہ ہوا

ذہن میں کچھ نقش اُبھرے اور آنکھیں نم ہوئیں
لازماً چھلکے گا جب لبریز پیمانہ ہوا

شدتِ سوزِ دُروں سے جل گیا دیوانہ وار
خود ہی اپنی آگ پر قربان پروانہ ہوا

نم ہواؤں نے کیے تازہ تری یادوں کے زخم
ان چراغوں سے منوّر میرا کاشانہ ہوا

کٹ ہی جائے گی شبِ غم، بھر ہی جائیں گے یہ گھاؤ
چاند کے سَر پر اگر دستِ کریمانہ ہوا

تشنہ بریلوی (کراچی)

نام تیرا لکھ دیا ہے گھر کی ہر دیوار پر
اور اب رہتی ہے بس میری نظر دیوار پر

نام تیرا جوں ہی لکھا بن گئی تیری شبیہہ
معجزہ دِکھلا گیا دستِ ہنر دیوار پر

تتلیاں بھی کیوں نہ آئیں اب قطار اندر قطار
ہے گلِ تر جلوہ گر شام و سحر دیوار پر

بن گئی دیوار میری آسمانوں کی حریف
ڈالتا ہے رشک سے رضواں نظر دیوار پر

ہے کرشمہ یہ بھی تیرے نام کا اے جانِ جاں
سج گئے ہیں ہر طرف لعل و گہر دیوار پر

اپنے سائے میں چھپا لیتی ہے بڑھکر زلفِ شب
چومنے آتی ہے پھر تجھ کو سحر دیوار پر

داستانِ عبرت و حسرت تو ہے بے حد طویل
میں نے لکھ ڈالی ہے کر کے مختصر دیوار پر

آنے والے وقت کے سائے ہیں لرزاں دوستو
صبحِ محشر کی جھلک دیکھنے بشر دیوار پر

ڈاکٹر جواز جعفری (لاہور)

جونہی اک آگ سی روشن ہوئی پڑاؤ کے ساتھ
مری کہانی بھی لَو دے اٹھی آلاؤ کے ساتھ

اے شہرِ چارہ گراں! دردمند ہیں ترے لوگ
کہ جی رہے ہیں سبھی اپنے اپنے گھاؤ کے ساتھ

نشے میں جھُومتے دریا! تجھے خبر بھی ہے
کہ کتنے شہر تھے جو کٹ گئے کٹاؤ کے ساتھ

کبھی نہ آئے مرے نخلِ اختیار پہ پھول
سو کارِ حرف کیا عمر بھر دباؤ کے ساتھ

ہماری آنکھوں کو حیرت سے تک رہے تھے لوگ
کہ دُنیا گھوم کے آئے تھے ہم بھی ناؤ کے ساتھ

خلاء کے بحر میں بیڑے ہیں کہکشاؤں کے
رواں دواں ہیں کہیں ہم بھی اس بہاؤ کے ساتھ

نظر شناس! کبھی تُو نے یہ بھی دیکھا ہے
میں تجھ کو تکتا ہوں کیوں اس قدر لگاؤ کے ساتھ

وہ کل ملا تھا سرِ راہ ایک عمر کے بعد
مگر ملا کسی انجانے رکھ رکھاؤ کے ساتھ

جواز جعفری ! ہم کس نگر میں آ پہنچے
ہر ایک آنکھ ہمیں دیکھتی ہے تاؤ کے ساتھ

○

پروفیسر صدیق شاہد (شیخوپورہ)

ہم انہیں دُور کسی دیس سے لائے ہوئے ہیں
بے نشاں زخم جو سینے پہ سجائے ہوئے ہیں!

سعیٔ اظہار میں بے کل ہیں نہ جانے کب سے
وہ خیالات کہ جو سر میں سمائے ہوئے ہیں

وہ محبت ہی کے مفہوم سے ہیں ناواقف
ہم جنہیں تختِ محبت پہ بٹھائے ہوئے ہیں

خوف ہے' سینۂ دشمن سے نہ لگ جائیں کہیں
تیرے یارانے کے جو لوگ ستائے ہوئے ہیں

مسندِ دل پہ جنہیں ہم نے بٹھائے رکھا
اب وہی لوگ مری جان کو آئے ہوئے ہیں

اب خنک سایہ کوئی اپنا صلہ ہے شاہدؔ
ہم کہ جلتی ہوئی اقلیم سے آئے ہوئے ہیں

○

حصیر نوری (کراچی)

جس طرف دیکھو شہیدوں کا نشاں ملتا ہے
مقبرہ! لوگو ہر اک سمت یہاں ملتا ہے

تجھکو رہنے کی ہے خواہش تو سنبھل کر رہنا
گھر کی ویرانی میں آسیب نہاں ملتا ہے

صورت حال کی سنگینی یہی کہتی ہے
تپتے صحراؤں میں آرام کہاں ملتا ہے

مجھکو اس دھوپ میں جلنے دو' کوئی آئے نہیں
میرے ماحول میں بوسیدہ دھواں ملتا ہے

زندہ رہنے کے لئے جی تو رہا ہوں لیکن
جس طرف دیکھئے مغموم سماں ملتا ہے

کوئی کہتا ہے تو کہنے دو تمہیں اس سے کیا
فائدہ اس سے' کسی کو بھی کہاں ملتا ہے

یہ بھی اک طرفہ تماشا ہے رفاقت میں حصیرؔ
میں جہاں ملتا نہیں ہوں' وہ وہاں ملتا ہے

○

کرشن پرویز (روپڑ' بھارت)

ملے بھی یوں کہ کسی کو خوشی نہ ہوئی
یہ دوستی تو حقیقت میں دوستی نہ ہوئی

وہ کیوں نہ غم کو لگائے گا ہنس کے سینے سے
خوشی کے بعد بھی حاصل جسے خوشی نہ ہوئی

بجھے بجھے سے رہے شوخ حسرتوں کے دیار
دلوں کے زخم بھی مہکے تو چاندنی نہ ہوئی

ہزار پھول بھی مہکے دھنک بھی لہرائی
مثال پیدا بہاروں میں آپ سی نہ ہوئی

تو زندگی کے تماشے کو زندگی نہ سمجھ
کہ زندگی تو جہاں میں کسی کی بھی نہ ہوئی

شبِ فراق کی محرومیاں معاذ اللہ
دیئے تو لاکھ جلائے تھے روشنی نہ ہوئی

حیات نام ہے پرویزؔ جس کسی شے کا
خودی کے بعد میسّر وہ بے خودی نہ ہوئی

○

ڈاکٹر انیس الرحمٰن (سکھر)

معصومیت کو پیار کے پیکر میں ڈھال کے — رکھی ہے ایک بچی نے گڑیا سنبھال کے
اُن کے جوان ہاتھ گریباں تک آ گئے — بچے بڑے کیے جو محبت سے پال کے
آؤ! مسرتوں میں گزاریں یہ زندگی — آخر گزر گئے ہیں زمانے ملال کے
کتنی کشش تھا حرفِ تمنا لیے ہوئے — کتنے جواب آئے کسی کے سوال کے
اک کرب کے سفر سے سدا لوٹ کر انیسؔ — کاغذ کو سونپتے ہیں خزانے خیال کے

○

شگفتہ نازلی (لاہور)

چلی جو آئے وہ ناؤ تو کوئی بات بنے — ردا کے سائے میں جاؤ تو کوئی بات بنے
ہر ایک رُت کی ہے پہچان اپنی ہی لیکن — بھری بہار میں آؤ تو کوئی بات بنے
سُر اور ساز سے صنفِ سخن سنورتی ہے — غزل کو ٹھمری میں گاؤ تو کوئی بات بنے
وہاں پہ زعم ہے گفتار کا انوکھا سا — ذرا جو جادو جگاؤ تو کوئی بات بنے
یہ کیا کہ دوستی اپنے تلک ہی رکھی ہے — کبھی ہمیں بھی ملاؤ تو کوئی بات بنے
خیال وخواب جیسے شاعری میں ڈھلتے ہوں — جو بزم دل کی سجاؤ تو کوئی بات بنے
رموزِ فن کو یہ بے بہرہ لوگ کیا جانیں — کسی طرح سے سمجھاؤ تو کوئی بات بنے
کھُلیں گے سارے ہی اوراق زیست کے خود پر — پر اپنے آپ کو پاؤ تو کوئی بات بنے
یہی شناخت تو ہوتی ہے زندہ قوموں کی — لو! جشن[1] چودہ مناؤ تو کوئی بات بنے!

[1] یوم آزادی: ۱۴ اگست

○

قاضی عنایت الرحمٰن (برمنگھم، یوکے)

اے عشق مرے کام سبھی تو نے سنوارے — ورنہ مری تقدیر میں لکھے تھے خسارے
ہم تری محبت میں گرفتار ہیں ایسے — لوٹ آئیں اگر تُو ہمیں اک بار پکارے
ہیں کیسے وفادار جنہیں ڈھونڈ رہے ہیں — ماضی کے جھروکوں سے یہ پرکیف نظارے
ہم نے ہی دعا اے دل محروم نہیں کی — آ آ کے پلٹتے رہے تاحشر سہارے
قسمت تو ہماری تری نظروں نے لکھی تھی — سمجھے نہ ہمیں ترے پر اسرار اشارے
اک تُو ہی مری جاں اسے پہچان نہ پایا — قاضیؔ نے ترے عشق میں کیا روپ نہ دھارے

○

سجاد مرزا (گوجرانوالہ)

کبھی کبھی ترے غم خوار ہم کو سوچتے ہیں
بزعمِ نشۂ پندار ہم کو سوچتے ہیں

اگرچہ گوشہ نشیں ہیں مگر یہ کیا کم ہے
قریب و دور کے اغیار ہم کو سوچتے ہیں

ہمارے عہد کے کچھ لوگ ظلمتِ شب میں
برنگِ مطلعِ انوار ہم کو سوچتے ہیں!

یہ سانحہ ہے کہ اب شہرِ ناشناساں میں
عدو کے جو ہیں طرف دار ہم کو سوچتے ہیں

سمیٹ لائے ہیں ہم زخم ان کی گلیوں سے
دیارِ غیر میں کچھ یار ہم کو سوچتے ہیں

ہمیں پسند ہے اپنا ہی دشتِ تنہائی
وہ بن کے رونقِ بازار ہم کو سوچتے ہیں

چلو تو ہم بھی انہیں دیکھتے چلیں سجاد
اداس شہر کے آثار ہم کو سوچتے ہیں

○

عتیق احمد عتیقؔ (مالیگاؤں، بھارت)

اپنی حد سے جب گزر جائے گا لہرا پیاس کا
ایک قطرے میں سمٹ آئے گا دریا پیاس کا

پانی پانی ہوگیا، لو دیتا صحرا پیاس کا
کس کے ہونٹوں سے لپک اُٹھا یہ شعلہ پیاس کا

نو بہ نو سمتوں کو بھی، گلہائے خوں سے بھر دیا
طئے کیا کچھ اس جتن سے، ہم نے رستہ پیاس کا

اپنے ہی دم خم کو چاٹے ہے، کڑکتی دھوپ میں
جلتے لمحوں کا شجر، پھیلا کے سایہ پیاس کا

سچ تو یہ ہے، وہ مری ہی جستجو کا کرب تھا!!!
لے اُڑا مجھ کو سرابوں تک جو لہرا پیاس کا

برف کی یہ سل نہ ٹوٹی، تیشۂ مئے سے تو ہم
دھوپ ہی پی کر کریں گے دل معمّہ پیاس کا

دُکھ کی پتھریلی چٹانیں، بہہ نکلتے توڑ کر!
دل کے جھرنوں میں کہاں تھا اتنا بوتا پیاس کا

قطرے قطرے، دانے دانے کو سراپے ہے عتیقؔ
بھوک کی ٹہنی پہ بیٹھا اِک پرندہ پیاس کا!

○

سیفی سرونجی (سرونج، بھارت)

لایا مزہ حیات میں پڑھنا کتاب کا
دیکھا عجیب ہم نے کرشمہ کتاب کا

بچپن مرے قریب سے ایسے گذر گیا
جیسے کہ بچہ پھاڑ دے پنّا کتاب کا

رکھا ہے میرے پاس حفاظت سے آج بھی
اس نے دیا تھا جو کبھی تحفہ کتاب کا

کیا پوچھتے ہو راز مری شہرتوں کا تم
جو کچھ ملا ہے مجھ کو ہے صدقہ کتاب کا

دل توڑنا کسی کا گناہ عظیم ہے
یہ واقعہ ہے دوستو سچا کتاب کا

تنہائیوں کی جنگ میں ہتھیار ہے یہی
تلوار سے بلند ہے درجہ کتاب کا

سیفیؔ نہیں ہے ایک اکیلا جہان میں
عاشق ہے آج سارا زمانہ کتاب کا

○

انجم جاوید (کراچی)

سفر کی ابتداء ہوگی وہاں سے
جہاں ملتی زمیں ہے آسماں سے

میری آنکھوں کو عادت ہوگئی ہے
کہ دیکھیں تم گذرتے ہو کہاں سے

تم اندازہ نہیں کر سکتے اس کا
مجھے ہے کتنی چاہت اپنی ماں سے

دھواں ہے یا پہاڑوں پر ہیں بادل
یہ باہر ہے مرے وہم و گماں سے

میں پہنچنا چاہتا ہوں اُس جگہ پر
کہ یہ سورج ابھرتا ہے جہاں سے

تری قربت میں انجم ہے یہ عالم
دھواں سا اٹھ رہا ہے جسم و جاں سے

○

ڈاکٹر شاہد رحمٰن (فیصل آباد)

بے چین سا رکھتی ہیں یادیں اُس کی
دیکھتا رہتا ہوں میں راہیں اُس کی

چہرہ اُس کا ہے گویا تازہ گلاب
جھیل سی گہری ہیں آنکھیں اُس کی

وہ تو ہر وقت میں شامل ٹھہرا
صبحیں اُس کی ہیں شامیں اُس کی

کیسے جائے گا دل سے خیال اُس کا
کیسے بھولے گا کوئی باتیں اُس کی

جیسے وہ اب بھی سامنے بیٹھا ہے
جیسے مجھ دیکھتی ہیں نگاہیں اُس کی

○

پیر عتیق احمد چشتی (گوجر خان)

زیست کا لطف کیا' ایک مُٹھی ہوا
زیست ہے کیا بھلا' ایک مُٹھی ہوا

قریۂ جَور ہے' حبس کا دَور ہے
اور میں بے نوا' ایک مُٹھی ہوا

اُس کے سب فیصلے ماننا تھے مجھے
اور مرا فیصلہ' ایک مُٹھی ہوا

دِل کوئی توڑ دے، لے کے یا موڑ دے
دِل کی اوقات کیا، ایک مُٹھی ہوا

تو ہے سب کے لئے، کوئی تیرا بھی ہے؟
گُل نے ہنس کر کہا، ایک مُٹھی ہوا

وہ تو حاکم تھا، تاریخ اُس کی رہی
اور مِرا تذکرہ ، ایک مُٹھی ہوا

کیا عتیق اِس کا غم، کیسا رنج و الم
عشق تھا، کیا ہوا؟ ایک مُٹھی ہوا

○

رپورتاژ۔۔۔نکیں گُم گشتہ

طاہرہ اقبال (فیصل آباد)

(قسط نمبر۵)

''یہاں سکیورٹی کا بہت مسئلہ ہے' سر! پاکٹ مارنا' چین بالیاں چھیننا عام ہے۔آپ کسی پر اعتبار نہیں کر سکتے' بالخصوص غیر ملکیوں کے ساتھ ایسے حادثات روز کا معمول ہیں۔'' ہم فی الفور واپس گاڑی میں بھاگے' دریا سڑک کی سطح سے سینکڑوں فٹ نیچے تھا۔

ڈرائیور نے بتایا آج کل بارشوں کا موسم نہیں ہے ورنہ پانی سڑک کے کنارے تک آجاتا ہے اور ادھر بھی جہاں دریا نہیں یہاں وہاں سب دریا ہی بن جاتا ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہوتا ہے۔لوگ پکنک منانے آتے ہیں۔ بہت خوبصورت منظر ہوتا ہے۔

کاش ہم بارشوں کے موسم میں آئے ہوتے' کیونکہ ہمارے بیس روزہ قیام کے دوران ایک بھی بارش نہ برسی' جس کا اقبال صاحب بار بار شکر ادا کیا کرتے تھے ورنہ پاکستانی پویلین کا کیا بنتا جو معلق پُل کی طرح پہلے ہی لرزتا رہتا تھا اور جہاں ہزاروں قدموں کے ساتھ ریت کی تہیں بچھتی تھیں اور فرش کی ٹائلیں ٹوٹتی تھیں' جن پر سے ذرا سے بلاؤز سے چھلکتے ننگے پیٹ اور ڈھکے سَر والی لڑکی جھاڑو لگاتی رہتی تھی۔

بوڑھی گنگا کے ساتھ ساتھ ایک لنک روڈ انتہائی خستہ حالت میں جا رہی تھی۔ ڈرائیور نے کہا آپ کو اس سڑک پر لے چلتا ہوں آپ دریا کا نظارہ قریب سے کر لیجئے' جس دریا کا سوتا کسی کہسار سے نہیں پھوٹتا۔ اُس کا سبھاؤ کسی کرودی کے دل کی طرح گھٹا گھٹا ہوتا ہے۔ بوڑھی گنگا بھی ایسی ہی خاموش اور گھمبیر تھی۔۔۔انقلابات زمانہ سے بھری ہوئی مجلد تاریخ جیسے چُپ ہو' جیسے کسی مؤرخ کی پابندِ سلاسل زبان تلے مقید حقائق کی تلخی گھلتی ہو' داہنے ہاتھ دریا اور بائیں ہاتھ پانیوں سے بھری فصلیں اور کیلوں کے جھنڈوں میں چھپی جھیلیں' اِکّا دُکّا ٹین اور گھاس پھونس کی جھونپڑیاں آڑی ترچھی۔۔۔جھیلوں میں گھری ہوئیں۔ سارا بھیگا بھیگا سرمئی منظر کسی سازشی دماغ جیسا سیاہ پڑتا ہوا' سڑک بالکل سنسان نہ کوئی آوے نہ کوئی جاوے۔

تقریباً چالیس پچاس فٹ آگے جانے کے بعد ڈرائیور نے بیک گیئر لگایا۔ اُس کے ہاتھ پیر جیسے پھول گئے۔نہیں آگے جانا مناسب نہیں۔ ایسی سنسانی اور خوف جیسے سُندر بن کے لٹیرے انہی بانسوں کے جنگلوں میں پناہ لیے ہوں' جنھیں ساکت پانی بھری جھیلوں نے گھیر رکھا تھا' جیسے ہی ہم واپس پلٹے ٹول ٹیکس والا بانس گاڑی کے سامنے کھڑک سے گرا۔ ''ٹول ٹیکس ادا کرو۔'' جیسے بانسوں کے جنگل میں سے کسی جتھے نے دھاوا بولا ہو۔ ڈرائیور نے پس وپیش کی۔ تقریباً آٹھ دس لڑکے چاروں اطراف سے گاڑی کو گھیرے کھڑے تھے' جیسے کوئی مکتی باہنی کے کارندے' ابھی گاڑی اُٹھا بوڑھی گنگا میں پھینک دیں گے۔

ڈرائیور سے کہا۔ دے دو جو مانگتے ہیں' دے دو'' لیکن وہ اُس وقت کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھا اور اپنے حق کی جنگ تنہا لڑ رہا تھا۔ حق کی سچائی بھی کیسی سَر پھری ہے جو لشکروں کے سامنے تنہا ڈٹ جاتی ہے۔

وہ سارے تیز تیز اور مسلسل کچھ بول رہے تھے۔لڑ رہے تھے لیکن ہمارا ڈرائیور اُنھیں ٹول ٹیکس دینے کو رضامند نہ تھا۔ آخر ہم گیٹ سے دس قدم آگے ہی تو بڑھے تھے۔ ٹیکس کس چیز کا' جیسی رات تاریک تھی ویسا ہی خوف ہمارے اندر سرائت کر رہا تھا۔ میں نے نریمان کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میڈیکل سٹور والے عینی شاہد کا دُکھ آنکھوں میں لہرایا۔ نبضیں بیٹھ گئیں لیکن ان لڑکوں میں تو کوئی بھی 71 کا عینی شاہد نہ تھا۔ سارے ہی بعد کی پیداوار تھے لیکن خاندان اور اقوام میں ہونے والے حادثات وواقعات کو بعد کی نسلیں بھولا نہیں کرتیں۔ اسی لیے تو دشمنیاں اور تحریکیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ سمجھ نہ آنے والی زبان بولنے والے اتنا تیز تیز اور اتنا زیادہ زیادہ کیا بولنے لگتے ہیں۔ لگتا ہے ہماری زبان میں تو اتنے لفظ ہی نہیں ہیں۔ اتنی تیزی اور چابکدستی کہاں سے آئے۔ بنگالی تو ویسے بھی بنگلہ اتنی تیز اور رواں بولتے ہیں کہ بالکونی میں بیٹھے لگتا شاید نیچے بلوہ ہو گیا ہے لیکن جھانک کے دیکھتے تو گلے میں بانہیں ڈالے یار باش گپیں لگاتے جا رہے ہوتے' یہ تو پھر سچ مچ میں لڑ رہے تھے۔ بس مکافاتِ عمل ہوا چاہتا ہے۔

مَیں نے نریمان کو اپنے دوپٹے میں چھپا لیا جیسے دوپٹہ نہ ہو کوئی بھاری سائبان ہو۔ تبھی ایک لڑکا آگے بڑھا۔ پتہ نہیں اُس نے کیا کہا لیکن دو تین جملوں میں بات ختم ہو گئی اور ہم کچھ دیئے بنا بحفاظت باہر آ گئے۔ وہ لڑکا انتہائی خوبصورت لگا تھا۔

کاش ایسے ہی جھگڑتے ہوئے دو فریقوں کے بیچ کوئی ایسا پُر اعتماد اور فیصلہ کر دینے والا اور اُسے منوا لینے والا کوئی خوبصورت آ جایا کرے۔ جھگڑے تو ایثار وقربانی کی مفاہمت مانگتے ہیں۔

بوڑھی گنگا کے داہنے ہاتھ وسیع وعریض میدان خالی پڑا تھا۔ ڈرائیور نے بتایا یہاں تبلیغی جماعتوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ رائے ونڈ کے بعد دوسرا بڑا اجتماع یہاں ڈھاکہ میں ہوا کرتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں افراد پوری دنیا سے شرکت کے لیے آتے ہیں۔ شہر میں بہت سے تبلیغی چغے پہنے ہوئے نظر آتے تھے۔ پھر بھی نجانے کیوں یہاں لوگ کہہ دیتے ہیں۔ مذہب سے متعلق کوئی بات کرنی ہو تو مسجد میں جا کر کرو اور بیگم خالدہ ضیاء قادیانیوں کے مسئلہ پر بیان دیتی ہیں۔ بنگلہ دیش سیکولر ملک ہے یہاں قادیانیوں سمیت ہر ایک کو اپنے مذہب کی

آزادی حاصل ہے۔ اگر پابندی لگانی ہے تو پھر مولانا مودودی جیسے مولویوں کی کتابوں پر لگاؤ جو زیادہ منافرت انگیز ہیں۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں' اگرچہ ان کی آواز دبی دبی رہتی تھی۔ مسجدیں نمازیوں سے بھر رہی تھیں' اذانیں کم پڑ رہی تھیں۔ کیا مذہب کو کلیسا' مندر یا پھر مسجد تک محدود کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ مذہب کو لے کر جتنی قتل و غارت گری ہوئی کسی اور مسئلہ پر اس کے عشر عشیر بھی تباہی نہیں مچی۔ پر اسلام تو دینِ فطرت ہے۔ لچک اور اجتہاد موجود ہے۔ پھر ہم کیوں وضو کے طریقے کے اختلاف پر ہی مرنے مارنے لگتے ہیں۔ جب اسلام مسجدوں میں بٹ جائے تو پھر عقائد خُوں آشام ہو جاتے ہیں۔

واپسی پر ہم نے تنور سے روٹیاں لیں جو ہم نے بسیار تلاش کے بعد ڈھونڈا تھا کیونکہ چاول ہم ایک وقت تو کھا لیتے لیکن دوسرے وقت میں نہیں اور یہ چاول بھی ہمارے باسمتی جیسے تھوڑے ہوتے۔ ساری پچھ نیچے بیٹھ کر چاولوں کو بھتہ بنا دیتی۔ شاید ہمیں انھیں پکانے کا خاص طریقہ نہ آتا تھا۔ ورنہ اُوپر والے فلیٹ سے قریشی صاحب کے گھر سے آئی چاندی کے ورق لگی بریانی بہت کھلی اور مزے دار ہوتی تھی۔

قریشی صاحب خود پاکستانی تھے لیکن اُن کی بیگم بنگالی تھیں' جن سے ملاقات کے وقت پتہ چلا مسز قریشی کا نام جولی ہے جو کافی بہتر اردو بول سکتی تھیں کیونکہ وہ ایک سال تک کراچی میں اپنی ساس کے پاس رہ کر گئی تھیں' جن کے کھانوں کا ذائقہ پاکستانی اور بنگالی کھانوں کا آمیزہ تھا' جن کی بریانی کے ساتھ دھنیے اور ٹماٹر کی چٹنی آتی تھی۔ سلاد پر اوائل کے دانے ضرور موجود ہوتے' کھانا زیتون کے تیل میں پکا ہوتا تھا۔ قریشی صاحب کا بزنس سعودیہ' جاپان' دبئی' بنگلہ دیش' پاکستان میں پھیلا ہوا تھا جو تبلیغی جماعت کے ہمراہ پوری دنیا میں گھومتے تھے' جن کے لباس کا حصہ لمبا چوغہ اور عمامہ تھا' جن کے پاس ہر جگہ سے تبلیغی آتے تھے اور وہ سب کی میزبانی کرتے تھے۔ جولی نے بتایا تھا وہ ہمیشہ آٹھ دس آدمیوں کا کھانا اضافی بنا کر رکھتی ہیں کیونکہ اُنھیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کب ان کے خاوند کا فون آ جائے کہ وہ اپنے ہمراہ 12 آدمی دوپہر کے کھانے کے لیے لا رہے ہیں یا پھر مغرب کی نماز پڑھنے مسجد میں جائیں تو دس آدمی رات کے کھانے پر لے آئیں۔

قریشی صاحب کی ایک بیوی جاپان میں تھی جو جاپان کے کاروبار کی دیکھ بھال کرتی تھیں' لیکن جاپانی بیوی کے دونوں بچے بنگالی بیوی کے پاس رہتے تھے' دونوں قرآنِ پاک حفظ کر رہے تھے۔ شلوار قمیض پہنتے تھے' اور انگریزی بولتے تھے۔ جولی انھیں اپنے بچے کہتی تھی لیکن اُن کے پانچ سالہ عبداللہ کے نقوش اور بڑے بچوں کے نقوش میں بہت فرق تھا۔ عبداللہ بنگالی اور اردو دونوں بول سکتا تھا۔ پر یہ دونوں بچے بس انگریزی ہی بولتے تھے۔ شاید آپس میں جاپانی بولتے ہوں یا نہ بولتے ہوں۔ سترہ اٹھارہ سالہ عمارہ تو اپنے کمرے کو اندر سے لاک کیے رکھتی تھی۔ پہلی بار وہ اپنے گھر کے دروازے پر ملی تھی۔ کہیں باہر سے آ رہی تھی۔ بُرقعے میں لپٹی ہوئی۔ حجاب پہنے ہوئے۔۔۔ لیکن گھر میں وہ جین پہنتی اور سَر پر سکارف لیتی تھی۔

یہ مکس ریس کی لڑکی ایک تیسری نسل کی مصنوعی ماں کے پاس رہ کر پتہ نہیں کیسی تکونوں میں بیٹی تھی' کہ خود کو اکیلے کمرے میں لاک رکھتی تھی۔ شاید سمٹنے کے لیے' بکھرنے کے لیے' جولی سمجھتی تھی کہ اُس کا شوہر عمارہ کی ماں کو چھوڑ چکا ہے جو بزنس اور تبلیغ کے سلسلے میں مہینوں دوسرے ممالک میں رہتا ہے۔ چھوٹے سے قد کی عمارہ بوڑھی گنگا جیسی گھمبیر اور خاموش معلوم ہوتی' جیسے مدت ہوئی ہو دریا پر بارش نہ برسی ہو اور جس کا کھڑا پانی گدلا ہو گیا ہو' جیسے وہ کمرے کو لاک کر کے خود اندر نہ رہتی ہو بلکہ خود کو لاک کر کے بند کمرے میں ڈال دیتی ہو منقسم ہوتے زاویوں کی کھینچ تان سے گھبرا کر شاید' اُس کے کمرے میں ایک کمپیوٹر بھی تھا اور ایک گدا بھی اور باقی کتابوں کا بکھراؤ۔ پاکستانی لڑکی جاپانی ماں سے انٹرنیٹ پر ان ٹچ ہوتی ہوگی یا شاید بنگالی ماں اس پر چیک رکھتی ہوگی۔ پتہ نہیں جاپانی ماں کیا سوچتی ہوگی۔ جاپان میں بیٹھ کر ان اسلامی نظریات کے متعلق جن کی حفاظت کے لیے اس کے دونوں بچے اپنی بنگالی ماں اور پاکستانی باپ کے پاس رہتے تھے۔ جہاں اُس کی بیٹی اکیلے کمرے میں خود کو لاک رکھتی ہے۔

عمارہ اور اُس کا بھائی دونوں قرآنِ پاک حفظ کر رہے تھے۔ بھائی دہرائی کر رہا تھا لیکن عمارہ درمیان میں ہی ٹھہر گئی تھی۔ اُس کا حافظ آگے نہ چل رہا تھا۔ وہ لاک کمرے میں کمپیوٹر کے ساتھ دن گزارتی ہے جہاں کمپیوٹر کی میز کے سامنے ایک کرسی بھی ہے۔ ایک گدا' ایک کُرسی' ایک کمپیوٹر' ایک کمرہ اور اُس میں ایک لڑکی۔

اس گھر میں فرنیچر نہ تھا۔ سب کچھ فرش پر ہی تھا۔ فرشی نشستیں سونے کو فرشی گدے' بیٹھنے کو فلور کشن' کھانے کو دسترخوان سب کچھ گہرے اسلامی رنگ میں رنگا ہوا۔ مَیں نے جولی سے پوچھا۔ یہ فرشی نشستیں اسلامی نکتہ نظر سے ہیں کیا؟ اُس نے کہا ایک وجہ سنتِ نبوی پر عمل ہے اور ایک وجہ یہ ہے کہ جولی سمجھتی تھیں کہ وہ اور اُن کا خاوند دنیا کے سبھی ممالک میں گھوم چکے ہیں اور ایسی اچھی اور نفیس چیزیں نظروں میں سمائی ہوئی ہیں کہ اب یہاں کی معمولی اور دگڑ چیزوں پر نظر ٹکتی نہیں۔ یہ نظر نہ ٹکنے کی ایک وجہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ جولی خود ایک امام مسجد کی بیٹی ہیں اور شوہر مُلّا ملین ڈالرمین' تو نظریں چندھیا ہی جاتی ہیں نا۔

جولی نے اس روز بھی ہمیں گھر میں کھانے پر مدعو کیا تھا جس میں پاکستانی اور بنگالی پکوان پکے تھے۔ دسترخوان پر جولی کی بہنیں بھی موجود تھیں جن میں سے ایک کسی پاکستانی سے بیاہ کر کراچی گئی تھیں' لیکن نہیں موجود تھی' تو خود کو لاک رکھنے والی وہ لڑکی جو نہ نشست گاہ میں آئی تھی نہ دسترخوان پر' پانی میں گھرا جزیرہ' جس کے سارے بجرے ریتلی گار میں دھنسے ہوں' لیکن بات تو ہو رہی تھی

کھانوں کی اور ہمارے قیام کے آخری ہفتے میں ڈاکٹر فریسہ پاکستان اپنے والدین کو ملنے چلی گئیں اور جولی ڈھاکہ سے کوئی دوسو کلومیٹر دور کسی قصبے میں اپنے والدین کے پاس چلی گئیں اور کھانا پکانے کی ساری ذمہ داری اب اپنے ہی سَر پر آن پڑی۔

یہاں بھی وہی گھر داری' دن بھر وہی بھورے جو عورت کی جان کے دیمک ہیں۔ حالانکہ ہمیں چٹاگام کی Beach پر جانا چاہیئے تھا۔ سہلٹ کے پہاڑی سلسلوں پر چائے کے باغات دیکھنے چاہئیں تھے۔ کھلنا اور راج شاہی کے رومانوی شہر دیکھنے چاہئیں تھے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر کم از کم ڈھاکہ کی گلی گلی کوچہ کوچہ تو پھرول لینا چاہیئے تھا یہاں کے ادیبوں شاعروں سے ملنا چاہیئے تھا۔ ہاں ادیبوں شاعروں سے۔۔۔۔ جو کسی بھی خطے کا چہرہ ہوتے ہیں۔

جناب جلال عظیم آبادی نے پروفیسر ڈاکٹر عبدالواحد کا فون نمبر دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ اردو کے لیے کام کر رہے ہیں چونکہ خود بنگالی ہیں اس لیے اردو کے پلیٹ فارم پر زیادہ بہتر طریقے سے آواز بلند کر سکتے ہیں۔ عبدالواحد صاحب سے رابطہ کی کوشش کی' وہی زبان کا مسئلہ آڑے آیا۔ دوسرے اینڈ سے بنگلہ میں بات ہوتی' انگریزی کا سہارا لینے کی کوشش کرتے تو فون کھڑک بند ہو جاتا۔ ڈھاکہ چھوڑنے سے کوئی ایک دو روز پہلے عبدالواحد صاحب سے رابطہ ہو سکا' مغرب کے بعد وہ ملنے کے لیے تشریف لائے۔ سفید پائجامہ کُرتا پہنے ہوئے نوجوان بنگالی جو روانی سے اردو بول سکتے تھے۔ اسلامی بینک میں ملازمت کرتے ہیں۔ اسلامیات میں ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں بطور وزیٹنگ پروفیسر پڑھاتے ہیں۔

عبدالواحد صاحب کا ایک مضمون انٹرنیشنل اقبال کانفرس' ایوانِ اقبال لاہور میں ۲۴ اپریل کو پڑھا گیا جو ماہنامہ بیدار ڈائجسٹ لاہور میں نومبر 2003ء کو چھپا۔ اُس میں ڈاکٹر عبدالواحد کا تعارف یوں کروایا گیا۔

ڈاکٹر عبدالواحد سیکرٹری جنرل علامہ اقبال سنکسد بنگلہ دیش' ایڈیٹر علامہ اقبال سوسائٹی جنرل' ملک کے معروف کالم نگار' بہت ساری کُتب کے مصنف' بہت سارے اداروں کے سربراہ اور فیکلٹی ممبر ایشین یونیورسٹی آف بنگلہ دیش بھی ہیں۔ اس مضمون کے ایک اقتباس میں ڈاکٹر عبدالواحد لکھتے ہیں:

1971ء سے قبل علامہ اقبالؒ پر لکھنے اور پڑھنے کا کام معمول کے مطابق اور مسلسل نہیں تھا اور نہ کسی خود مختار پروگرام کے تحت تھا۔ پاکستان سے جو گرانٹ ڈھاکہ آتی اس سے تھوڑا بہت کام ہو جاتا تھا۔ علیحدگی کے بعد وہاں اقبالؒ پکے کام کی سرکاری سرپرستی ختم ہو کر رہ گئی اور یہ ذمہ داری حکومت کے کندھوں سے اُتر گئی۔ تاہم اقبالیات سے ذاتی طور پر دلچسپی میں کمی واقع نہ ہوئی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں علامہ اقبالؒ پکے نام پر جو ہال تھا اور ان کے نام کی جو تختی تھی۔ اسے مٹا دیا گیا۔ اقبال اکادمی اور اقبالؒ پنڈر الاسلام سوسائٹی بھی ختم ہو گئی۔ ان ایام میں اقبالؒ پکا نام لینا بھی جرم تھا۔ اخبارات میں علامہ کے یومِ پیدائش یا یومِ وفات کی خبر تک شائع کرنے پر پابندی تھی۔ ظاہر ہے اس کی پُشت پر وہ بھارتی عناصر سرگرم تھے جو پاکستان کا نام تک سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ اس بھارتی منصوبے کا ایک حصہ تھا جس کا مقصد ملک کے دونوں حصوں کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی کرنی تھی۔ اسی سبب سے کلام اقبال کے تراجم اور ان کے فکر و فلسفہ پر بنگلہ میں کتابیں جلا دی گئیں۔ محبانِ اقبال کے گھروں سے بھی علامہ اقبال کی کُتب' تراجم اور تشریح پر کُتب نکال پھینکی گئیں۔ تاہم ملک میں علامہ کے نام منسوب شارع اور ایک دو اداروں کے نام ابھی تک موجود ہیں مثلاً ڈھاکہ کے محمد پور میں اقبال روڈ اور کھلنا میں اقبال روڈ ابھی تک ہے۔

ڈاکٹر عبدالواحد نے بتایا

1985ء سے دوبارہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں اردو ڈیپارٹمنٹ قائم کیا گیا ہے۔ اقبال سنکسد کا قیام عمل میں لایا گیا۔ کئی طالب علم اردو اور اقبالیات میں ایم فل اور ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔ افسوس کہ ہمارے پاس فاضل پروفیسر نہیں ہیں۔ ہم نے کئی بار پاکستان ایمبیسی کو لکھا کہ اردو اور اقبالیات کے پروفیسر دیئے جائیں لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ ہم نے اقبال کی کتابوں کے بنگلہ میں تراجم چھاپے اور اکیڈمی اقبال کو لکھا کہ ہم سے پاکستانی یونیورسٹیوں کے لیے دو دو نسخے خرید لیں لیکن اُن کا جواب آیا' ہمیں فلاپی بھجوا دیجئے' کیونکہ یہاں کتابیں چھاپنی سستی ہیں۔ وہاں سے خریدنے میں ہمیں مہنگی پڑتی ہیں۔ وعدہ کیا گیا ڈھاکہ یونیورسٹی میں اقبال ہال بنوا دیتے ہیں لیکن عمل ندارد۔ ہم اردو کی کُتب کے تراجم کرنا چاہتے ہیں لیکن ہمارے پاس کتابیں نہیں ہوتیں کہ تراجم کر سکیں۔ اپنی حقیقت پھر آشکار ہوئی۔ افسوس نے شرم کی چادر میں منہ چھپایا۔

جس ملک میں کُتے بسکٹ کھاتے ہیں اور گھوڑے مربہ تناول فرماتے ہیں وہاں اپنی قومی زبان' اپنی شناخت کے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں۔ آخر تو دوسروں نے بھی تو ہمارے اس بازو کو کاٹنے کی خاطر برسوں انویسٹمینٹ کی لیکن ہم وہاں مُردہ ہوتی ہوئی اپنی ہی زبان کو خون کی ایک ڈرپ لگوانے سے قاصر ہیں۔ آخر یہ ساری ادبی اکیڈمیاں کیا کر رہی ہیں۔ لاکھوں میں تنخواہیں وصول ہوتی ہیں۔ بس گپیں ہانکنے کی۔ ادب کی خدمت' گروہ بندی' اقربا پرستی اور اپنی پسند کے چند لوگوں کو انعام و اکرام سے نوازنے کو ایوارڈز کے اجراء۔۔۔ اندھا بانٹے ریوڑیاں۔۔۔ جہاں مفادات' خود غرضی اور ذاتیات کی جنگ ہو۔ وہاں قومی اور ملکی مسائل کا نام سُننے کی سماعت کس کے پاس ہے۔ یہ وظیفہ خوار ادبی اکیڈمیاں اور این جی اوز ڈاکٹر عبدالواحد جیسے اردو سے پیار کرنے والوں سے کبھی رابطہ میں رہے۔ اُن کی تجاویز سنیں کبھی اردو کی بے جان لاش پر رونے والوں کا ساتھ دیا۔ عبدالواحد صاحب نے دکھ کے ساتھ کہا۔ ''ہم انٹرنیشنل اقبال کانفرس میں لاہور گئے۔ سب کو اُردو کی زبوں حالی بیان کی اور اس مَرتی ہوئی زبان کی

زندگی کی بھیک مانگی' اُس وقت تو تالیاں پٹ گئیں۔ واہ واہ ہوگئی لیکن بعدازاں کہیں ذکر تک نہیں آیا۔ کسی نے بات بھی نہ پوچھی۔'' ارے ہمیں اپنی اپنی پڑی ہے۔ اس بندر بانٹ میں یہ کیا توقع لیے بیٹھے ہیں۔ سادہ لوگ۔۔۔ کسی پنجابی شاعر کے یہ مصرعے بار بار یاد آئے۔

اج کامے کمی ہو گئے تے ویلے کھبی کھان
ایتھے چور اُچکے چوہدری تے گنڈی رن پردھان
ایتھے بال ٹکرنوں ترسدے تے کُتے بسکٹ کھان
ایتھے ہر معبد اچ رونقاں ایتھے ہر دل سنم سان
کدے آجاون ننگ پیرئے کدے بوٹاں آلے آن
ایتھے دیوا بال دوپہر نوں سب دِتّی لٹی جان

ہم تو مشرقی پاکستان سے جان چھڑا کر ایسے خوش ہو گئے جیسے کوئی سوتیلی ماں شوہر کی پہلی اولاد کو کہیں ٹھکانے لگا کر خوش ہو جاتی ہے کہ اب اُس کی روٹی میں سے حصہ بانٹنے والا کوئی نہیں رہا۔ وہ سمو لی کھا سکے گی۔ ہم تو مشرقی پاکستان سے نجات پا کر یوں مطمئن ہو گئے جیسے بڑھتی ہوئی عمر کی بیٹی کا بے جوڑ رشتہ طے کر کے والدین مطمئن ہو جاتے ہیں۔ نہ اُس کی ہسٹریائی حالتیں دیکھنی پڑیں نہ طعنے تشنیع سننے پڑیں۔ نہ سیلابوں کا نقصان بھرنا پڑے۔ نہ بھوکوں کے پیٹ کی ذمہ داری آئے نہ طوفانوں کی نذر ہوئے' جھونپڑوں کو بنانا پڑے نہ بانٹ کر کھانا پڑے۔ نہ زکوٰۃ دینا پڑے۔

آئی' ایم' ایف کا سارا قرضہ تو وہیں کھپ جاتا تھا۔ اس کشکول کو سنبھالنے کی کیا ضرورت تھی' جس کا بجٹ خیرات پر چلتا ہے۔ جسم کا ناسور تو کاٹ کر پھینک ہی دیا جاتا ہے۔ پر یہ کٹا ہوا ناسور بھی تو کبھی اسی جسم کا حصہ رہا ہے۔ اسی خون نے اس کی بھی آبیاری کی تھی۔ یہ کیسی کشش تھی جو اُس سمت کھینچے جاتی تھی۔ ہمدردیا کردل کے پھپھولے پھوڑے۔

''ایسی ہی نادانیوں اور چند افراد کی من مانیوں نے پہلے ملک دو لخت کیا۔۔۔''

ڈاکٹر عبدالواحد نے کُھل کر اس سنگین موضوع پر بات کرنے سے گریز کیا البتہ اُن کی گفتگو کے دروں میں یہ مفہوم چھپا تھا۔ یہ سازش تھی' اپنوں اور غیروں کی مل کر تیار کی ہوئی سازش۔۔۔ یقیناً یہ سازش تھی اور ہماری نااہلی' نادانی اور ذاتی اغراض جس میں برابر کے شریک کار تھے۔ اپنے ہی بھائیوں کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا کہ وہ اپنوں سے بددل ہو کر غیروں کے قریب ہو گئے۔

موضوع کی تلخی ماحول میں گھل گئی۔۔۔ ڈارک براؤن پالش والے لکڑی کے فرش اور لائٹ براؤن پوشش کے صوفوں والا یہ لگژری ڈرائینگ روم زیادہ گھمبیر اور زیادہ ڈارک ہو گیا تھا۔ دُکھ کے رنگ اتنے گہرے کیوں ہوتے ہیں۔ گہرے گہرے نسواری پَردوں نے ڈھاکہ شہر کی روشنیوں کو جذب کر لیا تھا۔ نسواری بانسوں سے بنے کینو جیسی رنگت والا ڈرائینگ روم جیسے بوڑھی گنگا کے آلودہ پانیوں میں دھنستا چلا جا رہا ہو۔ اگرچہ خاص طور پر منع کیا گیا تھا کہ اس موضوع کو چھیڑنے سے گریز کیا جائے لیکن پتہ نہیں کیوں' لگتا یہاں موضوع ہی بس ایک رہ گیا ہے۔ یہ زمین جو ہماری تھی لیکن آج ہم اس میں غیر ملکی کہلا رہے ہیں۔ کتنا بڑا موضوع تھا۔ ہالی وڈ کی کسی بڑی فلم جیسا سٹرونگ موضوع' کیسا تاریخی ٹاپک' بڑے موضوع کتنی سہولت سے اغراض کے سمندر میں ڈوب کر چھوٹے ہو جاتے ہیں اور کتنے چھوٹے موضوعات مفادات کی لہروں پر تیر کر بڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم واقعات اور حقائق کی لاشوں کو اپنے مفادات کے پیمانوں میں ناپتے اُن کے بتوں کو پُوجتے اور اُن کی معبتوں کو دفناتے رہتے ہیں۔

''یہاں مہنگائی بہت ہے۔'' مَیں نے موضوع بدلا۔ ''ہاں ہے یہ ایک لحاظ سے اچھا ہے۔ پہلے کہتے تھے' مغربی پاکستان کھا گیا' لیکن اب کون کھا گیا۔'' احساسِ زیاں پھر گُم سُم تھا۔ دھرتی میں بھی کیسی کشش ہے جو اپنے اُگلے ہوئے عناصر کو بھی کھینچتی رہتی ہے۔ عجب کھچاؤ اور رکاؤ کی کشمکش' دیرینہ شناسائی کھینچتی ہے تو انانیت کا دُکھ اور لایعنیت روکتی ہے۔

عبدالواحد صاحب نے لایعنیت کی تلخی کو نگلا ''لیکن جس جگہ آپ بیٹھے ہیں' یہاں دام بہت زیادہ ہیں۔ چونکہ یہ وی آئی پیز کا علاقہ ہے۔ ساری ایمبیسز ادھر ہیں۔ زیادہ تر فارنرز یہاں رہتے ہیں۔ اس لیے ریٹ بھی ڈالروں میں طے کر لیے جاتے ہیں' دھان منڈی محمد پور' میر پور' ڈاؤں ڈھاکہ میں یہی دام بہت کم ہو جاتے ہیں۔''

انانیت منہ چھپانے لگی۔ وی آئی پیز' تمام مراعات کے حق دار' جب کوئی خود کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہے یا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ تو بدلے میں نفرتیں ملتی ہیں۔ برتری کو رد کر دینے والی انسانی فطرت' انسانی حاکمیت سے بغاوت کر دیتی ہے اور یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ ہم دوسروں کے اَن داتا بننے کی کوشش میں پھر بھی لگے رہتے ہیں۔ بس جھگڑے کا یہی تو آغاز ہے۔ نفرتوں کا بیج اور علیحدگی اور نجات کی تحریک' ڈارک براؤن ڈرائینگ روم' اگر تلا سازش کیس کی طرح پُراسرار ہو گیا تھا۔

''آپ کے ہاں لڑکے لڑکیوں کو ملنے جلنے کی اجازت ہے کیا؟''

''نہیں بالکل نہیں' کم از کم مڈل کلاس میں تو تصور بھی نہیں' اس معاملے میں ہم متوسط طبقہ پوری طرح Rigid ہیں۔'' میری نظر دس سالہ نریمان پر پڑی جی چاہا یہ اس موضوع کو ہرگز نہ سنے اُٹھ جائے یہاں سے۔

''ہمارے ہاں Co.Education نہیں ہے۔ اس لیے اس طرح کا کوئی چانس نئی نسل کے لیے بنتا ہی نہیں ہے۔''

انسانی فطرت بھی عجب ہے جو جس عذاب سے گزرا ہو' وہی اپنے

زیردستوں کے لیے بھی پسند کرتا ہے۔

''لیکن ادھر تو بُرا حال ہے' لڑکے لڑکیاں فرینڈز ہیں۔ سرِعام گھومتے پھرتے ہیں' دراصل ادھر اسلامی تعلیمات کا شعور بہت کم ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ تمام اسلامی کُتب اردو میں تھیں جنھیں تلف کر دیا گیا۔ گھروں میں موجود لائبریاں تک جلا دی گئیں۔'' پتہ نہیں شہروں اور تہذیبوں کے سقوط کے ساتھ علمی خزانوں اور تہذیبی ورثوں کا سقوط کیوں ضروری ٹھہرتا ہے۔ شاید فاتحین ان کی تاثیر کے خوف سے دوچار ہوتے ہیں۔ ''بنگلہ میں اسلامی کُتب بہت کم ہیں۔ حد یہ کہ قرآنِ پاک پڑھنا بھی اب بچوں کے لیے مشکل ہو گیا ہے کیونکہ اُس کے حروفِ تہجی الف' ب ہیں۔ ہم نے اردو پر ہی پابندی نہیں لگائی گویا اسلامی تعلیمات سے بھی منہ پھیر لیا' یہاں مغربی اور ہندوانہ کلچر نے اسلامی معاشرے کی جڑ کھوکھلی کر دی ہے۔''

مجھے ڈھاکہ انٹرنیشنل فیر میں کاسمیٹکس کے وہ اسٹال یاد آئے جن کے باہر بورڈ پر لکھا تھا۔ Kiss proof LipStick یہ ذرہ ذرہ سے اشارے کسی قوم کی سماجی اور اخلاقی اقدار کی غمازی کرتے ہیں۔ اس بورڈ کی طرف نریمان نے توجہ دلائی تھی۔ گھروں پانی پڑ گیا۔ اس دس سالہ بچی پر کیا کچھ کھل گیا ہوگا۔ بظاہر ذرا سا جملہ جو کاسمیٹکس کی سیل کے لیے ضروری سمجھا گیا تھا۔ پھر احساس تفاخراً ابھرا۔ ''ہمارے ہاں اسلامی اور اخلاقی اقدار انتہائی مضبوط ہیں۔'' لیکن ان کی آڑ میں جو کچھ ہوتا ہے لیکن یہاں چھپے ہوئے چھاجے کھولنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ پردہ' خدا بھی ستار ہے' پردہ پوشی کا حکم دیتا ہے۔ ایک طبقہ تو ایسا ضرور ہے نا جو واقعی اسلامی اور مشرقی اقدار پر کاربند ہے۔ تو پھر کفارہ تو ادا ہو گیا نا۔ اگر یسوع مسیح نے تختہ دار پر چڑھ کر پوری عیسائی قوم کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ تو ہمارا یہ طبقہ تو ٹھیک ٹھاک مضبوط ہے اور بڑی تعداد میں ہے۔ سرِدست Should be Proud والی کیفیت تو بنتی ہے نا' تو اسے Enjoy کرنے میں کیا حرج ہے۔

اگرچہ مغربی اطوار میں رنگا ہوا ایک کلچر پوری دنیا میں موجود ہے' جسے جدید عالمی کلچر کہا جا سکتا ہے۔ کوئی ملک' کوئی خطہ اُس سے مبرا نہیں رہا' جو علاقائی تہذیب و تمدن پر چڑھا چلا آ رہا ہے' علاقائی کلچر کونوں کھدروں میں منہ چھپا رہا ہے۔ اپنی بقا کی جنگ ہار رہا ہے لیکن موجود تو ہے نا یہ عالمی کلچر پاکستان میں ابھی قدرے ڈھکا چھپا ہے اور بنگلہ دیش میں نسبتاً کُھلا کُھلا ہے۔

''ادھر تو ہندوازم اور ویسٹرن کلچر مل کر حملہ آور ہوتے ہیں اور ہمارا اپنا کلچر دم دبا کر بھاگ رہا ہے۔''

''یہی تو چال تھی نیو ورلڈ آرڈر کے ناخداؤں کی کہ سب سے بڑے اسلامی ملک میں اسلامی اقدار کمزور کی جائیں۔ یہی تو پلاننگ تھی۔'' بوڑھی گنگا کے آلودہ پانیوں میں ڈولتا ہوا کینو بے سمت تیرنے لگا۔

''پلاننگ کرنے والے بھی ٹوٹیں گے۔''

عبدالواحد صاحب نے حالات کی تلچھٹ کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔

''ہماری زندگیوں میں تو ہونا مشکل ہے۔''

''ہوگا ایسا ضرور ہوگا۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ توڑنے والے خود ٹوٹیں گے!۔۔۔''

''پر کیسے۔''

''پتہ نہیں پر ایسا ہوگا۔ کام شروع ہو چکا ہے۔ ریخت کا عمل جاری ہے۔'' خوش فہمی کے اس لمحے میں ہم پھر مشترکہ قوم کی طرح مشترکہ دشمن کی خیالی تباہی پر خوش ہوئے۔۔۔

گزشتہ رات ایک ریسٹورنٹ کے باہر کچھ بنگالی لڑکے لڑکیاں مغربی لباسوں میں ملبوس بے باکانہ قہقہے لگا رہے تھے تو ٹیکسی ڈرائیور زمان نے بڑی شرمندگی سے کہا تھا۔ ''امیروں کے بچوں کا یہ حال ہے۔ کیا ہوگا اس قوم کا۔''

اب یہی بات ڈاکٹر عبدالواحد صاحب کے لیے لمحہ فکریہ تھا اور یہ سوالات اور یہ تفکرات کتنے یکساں تھے۔ ادھر اور اُدھر دونوں طرف' کتنا کچھ ملتا جلتا ہے ہمارے بیچ۔۔۔

ڈھاکہ انٹرنیشنل فیر کے طویل و عریض احاطے کے گیٹوں پر ٹکٹ کی پرچیوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہوتے تھے' جہاں روزانہ اسّی ہزار سے ایک لاکھ تک افراد آتے جاتے تھے۔ ڈائریکٹر پویلین کے کیبن کے شیشے میں سے یوں محسوس ہوتا' جیسے کسی خاموش فلم کی ریل چل رہی ہو۔ بند گلاس سے کوئی بھی آواز اندر نہ آ سکتی لیکن انسانوں کا کتر کتر گتاوہ سا دکھائی دیتا۔ چمک مارتے گال' آنکھیں اور لمبے بال ڈھیلے ڈھالے قمیض شلوار' سمارٹ ساڑھیاں' چھوٹی عمر کی لڑکیاں اور بڑی عمر کے مرد ہاتھوں میں ہاتھ دیئے۔ کس پروف لپ اسٹک والے اسٹالوں پر کھڑے ہوتے۔ ہم عمر بھی دکھائی دیتے جن کے ساتھ کالج یا سکول یونیفارم میں ملبوس لڑکیاں ہوتیں۔ بیٹیوں کا جہیز خریدتی ہوئی مائیں' چھوٹے بچوں کی ضدیں پوری کرتے ہوئے میاں بیوی' اسٹالوں کے بنگالی سیلز مین' جن کے لنچ گھر سے آتے جو ٹفن کھول کر پورے پنجے بھر بھر چاول اور سبزی کھاتے۔ سامنے واشنگ مشین اور پنکھوں کا اسٹال' ساتھ میں سنگِ مرمر کی آرائشی اشیاء کا اسٹال ادھر چنیوٹی فرنیچر' پرے سندھی کڑھائی والے سوٹ' جہاں سے چینی جاپانی ڈپلومیٹ اور گورے گوریاں خریداری کرتے تھے۔

اتنے تیزی سے مناظر تبدیل ہوتے کہ سیکنڈس میں ہزاروں انسانوں پر نگاہیں اُچٹتیں' ذرا ذرا کترنیں نظر آتیں۔ کہیں ہاتھ' کہیں ٹانگیں' کہیں چہرے' کہیں پورا جسم' کہیں محض بالوں کی لمبی لہراتی ہوئی چوٹی جیسے پوری فلم فاسٹ موشن میں چلا دی گئی ہو۔ کبھی فارورڈ کبھی ریورس' آنکھیں دُکھ جاتیں۔

۔جاری ہے۔

''کند ہم جنس با ہم جنس.....''

رؤف خیر (حیدرآباد،دکن)

حسن پرست Womanisers ہم جنسی کو غیر فطری قرار دیتے ہیں یہ بھی انتہا پسند قسم ہی کے لوگ ہیں جو اپنی پسند ناپسند میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔عدالت نے تو ہم جنس پرستوں کی پشت پناہی کرتے ہوئے ان پر لذت کوشی کا ''پچھلا دروازہ'' کھول دیا۔چاہیں تو لوگ اسے ''نامنظور'' کر دیں مگر ناظر اور منظورِ نظر کے بہر کیف ایک ہونے کا بڑا ''امکان'' ہے ہر چند کہ یہ ''جادہ بے زادہ'' ہے۔

میزان عدالت نے بڑی آسانی سے اس قسم کا شرانگیز شوق فرمانے والوں کو قانونی گرفت سے آزاد تو رکھا مگر عوام وخواص نے اس میں پاسنگ کے ''امکان'' کی نشاندہی کی۔

ہمارا ملک چونکہ ایک سیکولر ملک ہے اس لیے یہاں ہر شخص کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے۔کسی کو کسی کے ذاتی معاملات میں دخول اندازی (میرا مطلب ہے دخل اندازی) کی اجازت نہیں تاوقتیکہ وہ نتائج و ''عواقب'' سے نابلد خود ہی ''دعوت صحبت'' نہ دے۔

مغرب میں اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے کہ دو مرد یا دو عورتیں آپس میں میاں بیوی کی طرح متعہ کر کے رہیں۔تجدید معاہدہ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔اور پھر وہاں تحریری معاہدے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی کہ معاملہ ''ORAL'' بھی تو ہو سکتا ہے۔مغرب میں عموماً مرد اور عورت بھی بغیر نکاح رہتے ہی ہیں یہ تو آپسی ہم جنسی کا معاملہ ہے اس میں فراخ دستی کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور جو تنگ دست ہوتے ہیں وہ تو اپنے اپنے حال ہی میں مست رہتے ہیں۔

مشرق میں جب اسے پشت پناہی مل ہی گئی تو اس کا سب سے زیادہ فائدہ ایسی فوج ظفر موج کو ملنے کا امکان ہے جس کے جوان برسوں تنہا مقام پر گل اندامو سے دور ''دستِ خود دہانِ خود'' جیسے دن گزارنے پر مامور و مجبور ہوتے ہیں۔انھیں چھٹی بھی یک ''مشت'' ہی ملتی ہے۔وہ زیادہ سے زیادہ باہم غم بانٹنے میں ''آگے پیچھے'' ہوں گے۔مشہور مقولہ ہے کہ کبھی گاڑی کے آگے گھوڑا تو کبھی گھوڑے کے آگے گاڑی۔ظاہر ہے صورتِ راکب و مرکب بدلتی رہتی ہے مگر ع اصلِ فعول و فاعل و مفعول ایک ہے۔چارہ کار ایسے جوان اب دشمن کے سامنے سینہ سپر ہونے کے بجائے کہیں ''پیٹھ'' دکھانے نہ لگ جائیں بلکہ کیا عجب ہے کہ حزبِ مخالف کو خود ہی ''تعاقب'' کی دعوت دے ڈالیں۔یہ آگے آگے وہ پیچھے پیچھے حتیٰ کہ زیر و زبر کی صورتِ حال درپیش ہو۔

ایڈز کی روک تھام کے لیے عالمی سطح پر بڑے اقدامات کیے جا رہے ہیں مگر یہ مرض پچھلے دروازے سے عود کر آ رہا ہے۔اس سے بچنے کی تدابیر کے طور پر غیر عورت یا غیر مرد سے دور رہنے کی تلقین بھی کی جاتی ہے۔غالباً ایک ہی ''لحاف'' کے اندر اگر دو ''بے عصمت'' عورتیں ہوں تو یہ ہم آہنگی زیادہ خطرناک نہ ہوگی پھر بھی اس سلسلے میں ''شبانہ روز'' تحقیق ضروری ہے کہ یہ کس حد تک ''قابل لحاف'' ہے۔البتہ جب دو بے کردار مرد ایک دوسرے کا پردۂ دبارت (دبر سے دبارت کا لفظ coin کیا گیا ہے) چاک کرنے کے مشن میں لگے رہتے ہیں تو شاید زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔اس معاملے میں بھی بادِ نسیم سے رجوع ہونا افضل ہے اس میں متقی کے ''م'' پر بھی اثر پڑ سکتا ہے۔

بیشتر لوگ عورت بیزار ہوتے ہیں یا بیشتر عورتیں مردوں سے بیزار ہوتی ہیں ایسے میں دونوں اپنے اپنے طور پر LESS EVIL کمتر خرابی میں آلودہ ہو جائیں تو زمانے کو برا کیوں لگنے لگتا ہے۔سیکولر ملک میں خرابی کا اتنا اختیار تو خوب ملنا چاہیے کہ

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر با باز

آبادی کی کثرت پر بندھ باندھنے (POPULATION CHECK) کے لیے مالتھس کی تھیوری MALTHUSIAN THEORY کے علاوہ یہ بھی ایک اضافی صورتِ حال ہو سکتی ہے۔مالتھس نے سیلاب، وبا اور زلزلوں کو آبادی کو روکنے کے فطری ذرائع قرار دیا تھا جیسے سمندر کی سونامی لہریں ہوں کہ ایرانی زلزلے یا پھر پلیگ وغیرہ کی طرح کی کوئی وبا' ایڈز بھی تو انہی کا ایک حصہ ہے۔اہلِ حق اسے باطل ہی سمجھتے ہیں۔

ایرانی زلزلے پر یاد آیا کہ ہم جنسی کو ایرانی ذوق بھی کہا جاتا ہے یا ہو سکتا ہے کہ کسی لعنت اللہ کمینے نے یہ افواہ پھیلائی ہو مگر اس سے صرف نظر بھی نہیں کیا جا سکتا چیز کے مردم نگو یند چیز ہا۔واقعہ یہ ہے کہ فارسی شاعری میں محبوب مذکر ہی ہوتا ہے۔ایرانی شاعری کا محبوب کم سن لڑکا ہوتا ہے جس کی مسیں بھیگ رہی ہوتی ہیں جسے دیکھ دیکھ کر فارسی شاعر ریشہ خطمی ہوا جاتا ہے۔پھر ایرانی ''درّے'' سے ہوتا ہوا یہ ''عقب ناک'' ذوق ہندوستان میں بھی پھیلا۔آریائی اور ایرانی نسلیں جڑواں خصوصی حیثیت کی سمجھی جاتی ہیں چنانچہ خوبصورت برہمن زادوں پر یہاں کے شعراء مرمٹنے لگے۔کئی مثنویاں اس کی گواہ ہیں۔یہ افلاطونی ذوق بھی کہلاتا ہے۔

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

شمس الرحمٰن فاروقی نے ''شعر غیر شعر اور نثر'' میں بھی اس ذوق کے ڈیرہ داروں کی نشاندہی کی ہے۔

کسی دن منہ اندھیرے یا سویرے
گئے تھے ہم سلام اللہ کے ڈیرے
وہاں دیکھے پری رؤ ایک سے ایک
ارے رے رے ارے رے رے ارے رے

اور یہ ''پری رؤ'' ظاہر ہے کم سن لڑکے رہے ہیں جو سلام اللہ کی سلامتی کے درپے تھے۔ محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں تاباںؔ کے حسن زہرابی کے بارے میں لکھا کہ کئی خوش ذوق ان کے پیچھے پڑے رہتے تھے اور وہ کسی کسی کے ہاتھ بڑی مشکل سے آتے تھے۔ دور کیوں جایئے۔ ''یادوں کی برات'' اٹھایئے تو پتہ چلے گا کہ جوش ملیح آبادی شباب کا اولین نشانہ ایک شاہد نوخیز رہا ہے۔ ماضی قریب کے ایک گورکھپوری شاعر کے بارے میں علم سینہ بہ سینہ کی طرح مشہور ہے کہ وہ کسی نہ کسی راستے سے کچھ نہ کچھ پیٹ میں جانے کے قائل تھے۔ اسی ذوق خانہ خراب کے شاخسانے کے طور پر ان کا نوجوان بیٹا بھٹے چڑھ گیا۔ حیدرآباد کے ایک شاعر کے بارے میں یہ روایتِ ناسعد بھی ملتی ہے کہ برق ان کے آشیانے کے پچھواڑے گرا کرتی تھی۔ بلکہ بقول غالب

برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

ایک GAY شاعر ایک سردار جی سے تعارف کرتے ہوئے بڑے افتخار سے کہتے ہیں کہ وہ ان کے شریک حیات ہیں۔ ایک خورشید بکف شاعر خاور بدوش ہندو پاک کے رسائل میں اپنی انوکھی تخلیقات کی روشنی بکھیرتے تھے، مشاعروں میں کبھی نہیں جاتے تھے البتہ وہ متشاعر امیرزادوں کو اپنا کلام معقول معاوضہ لے کر دے دیا کرتے تھے جسے امیرزادے مشاعروں میں اپنے نام سے پڑھ کر خوب داد بٹورتے تھے۔ ان نام نہاد شہزادوں کے ہاں ناچ گانے اور ناؤ نوش کی محفلیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ ایک قتالہ ان کے گلے میں بانہیں ڈالنے لگی تو انھوں نے فوری اسے جھٹک دیا اور کہنے لگے کہ یہ جو سامنے بیٹھے ہوئے...... ہیں وہی سامنے کی چیزوں کے رسیا ہیں، ہم تو ''پس پشت'' بیٹھنے ہی کو پسند کرتے ہیں۔

شادی شدہ مرد اگر بیوی کے رہتے ہوئے بھی پچھلے پہر پچھواڑے سے بلا کر کسی (مرد) دوست کو ہمدمی کا شرف بخشتے تو بے چاری بیوی ایسے نام نہاد شخص کو (جنسی رقابت کے تحت) اپنا ''مردسوکن'' سمجھنے پر مجبور ہو جائے گی یوں ایک نئے رشتے کی داغ بیل پڑ جائے گی اور اگر بیوی اپنی کسی سہیلی کو چپت مارتی ہے تو اس کا شوہر اس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے اور ایسا شوہر بڑے مزے میں ہوتا ہے یعنی ایک پنت دو کاج۔ ازدواجی زندگی میں ایسے اضافی کردار کے خلاف کیا قانونی چارہ جوئی کی جا سکے گی؟ یا فریقین کے صوابدید پر اس کا انحصار ہوگا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آپس میں ہم جنسی کی قانونی زندگی گزارتے ہوئے دو مرد الگ ہونا چاہیں تو کیا۔ علاحدگی Seperation کا مقدمہ دائر کیا جا سکتا ہے اور ایسی صورت میں دوسرا مرد تجدید تعلق Restitution Conjugal Rights کے تحت اس کا ''پیچھا'' کر سکتا ہے۔ یہی سوال عورت کے معاملے میں بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ کیا ایک سہیلی دوسری سہیلی کے ساتھ اپنا ہم جنسی کا معاہدہ ختم کر سکتی ہے اور کسی مرد کے حوالے اپنے آپ کو کرنا چاہے تو کیا وہ ایسا کرنے کا حق رکھ سکتی ہے؟ اور دوسری عورت اپنی اس سہیلی سے دست برداری پر آمادہ نہ ہو تو وہ قانوناً کیا اسے اپنے لیے روک سکتی ہے؟ دعوے حقِ زوجیت میں وہ کہاں تک حق بجانب سمجھی جائے گی؟

ہم جنسی میں ملوث مرد اگر نام نہاد مسلمان ہے تو کیا اسے چار نامردوں تک چھوٹ رہے گی؟

لغات میں ہم جنسی کو ''علتِ مشائخ'' کا نام دیا گیا ہے۔ گویا ہزاروں سال پہلے پیغمبر لوط علیہ السلام کی امت سے لے کر دورِ حاضر کے لوطیوں تک یہ مرض پھیلا ہوا ہے۔ یہ کوئی نیا مرض نہیں ہے البتہ دیکھنا یہ ہے کہ اس کو قانونی جواز دینا کہاں تک سماج کے حق میں مفید ہو سکتا ہے؟ کیا آبادی کی روک تھام کے لیے یہ عقبی دروازہ کھولا گیا ہے؟ تا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ !یعنی شرحِ اموات تو بڑھ جائے لیکن شرحِ پیدائش کا دروازہ بند رہے۔ غالباً ''بڑی عاقبت'' اندیشی سے کام لیا گیا ہے۔

بہرحال یہ ایک نازک مسئلہ ہے جس پر سختی کی گنجائش نہیں کیونکہ اکثر نوجوان کانوں میں بالیاں، ہاتھوں میں چوڑیاں، گلے میں زیور ڈالے لمبے لمبے بال رکھے نظر آتے ہیں۔ ایسے نوجوانوں کی اکثریت ہے کہ

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

جمہوریت میں اکثریت کی رائے قانون کا درجہ پا لیتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو ہم جنسی کے ''یارِ نار'' ہیلمیٹ Hell-Mate کا لزوم حسن پرستوں کو بھی لے ڈوبے اور ان کا حور شمائل حسیناؤں سے تعلقات رکھنا ہی جرم ٹھہرے۔

قطعات

قیمت

تمہارے نام کی تختی مِٹی مٹی ہے مگر
بڑھا رہی ہے شکستہ مکان کی قیمت
خلا کی سیر سے لوٹا تو یہ ہوا معلوم
میری زمیں ہے ترے آسمان کی قیمت

منجدھار

ہو رُوبرو تو شیشہ بھی چٹخے درمیاں سے
آئینے میں کسی دن وہ چہرہ دیکھنا ہے
بہتے ہوئے کہیں پر بنتا ہے جو بھنور بھی
منجدھار میں پہنچ کر وہ دھارا دیکھنا ہے

غالب عرفان (کراچی)

''باغِ ارم''

ستیہ پال آنند
(یو۔ایس۔اے)

قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

سرطان زدہ جسم سے کہتا ہوں میں اکثر
باغِ ارم ہے، ایک خیاباں ہے یہ جہاں
تُو مرغزارِ زیست کا وہ مرزبان ہے
جو ذوق و شوق، تاب و تواں میں تھا مستعد
جس میں قرار تھا نہ تعطل نہ کاہلی
طوفاں میں بھی جو برسرِ پرواز رہا تھا
جو آشنا نہ تھا کبھی فرصت کے نام سے!

سرطان زدہ جسم سے کہتا ہوں کہ اُٹھ، چل
مت دیکھ یہ بکھرے ہوئے سرطان زدہ جسم
جو ماندگی سے مضمحل ہر سمت پڑے ہیں
پسپائی کے مارے ہوئے یہ لوگ ہیں ناکام
تو ان کی طرح بے عمل، بے کار نہیں ہے
اٹھ چل کہ ابھی تک تری منزل نہیں آئی
اٹھ چل کہ تجھے راہ میں رکنا نہیں ہے آتا!
جنت بدر ہوا تو ہوں لیکن درونِ دشت
''قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم!''

○

لوحِ نامحفوظ

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش
(کوئٹہ)

کیا بھلا روکیں گے اہلِ وطن
غم یہ کشمیر کے فلسطیں کے
یا کسی بھی اسیر مٹی پر
نام ہیں سب کے ''لوحِ نامحفوظ''
مٹ چکا رنگ ہر بشارت کا
ہر طرف رقص ہے اسارت کا
اب تو کشمیر بھی یہیں پر ہے
کم نہیں آگ یہ فلسطیں سے
بلکہ ان سے بھی بات ہے مخدوش
کہ وہاں پتھروں کے لوگوں سے
جنگ لڑتے ہیں امن کے داعی
ہم مگر کن کا رنگ دھاریں گے
کن کو ہم پتھروں سے ماریں گے
کہ یہاں خول میں ہیں سب ابلیس
رہبروں، رہنماؤں، یاروں کے

○

رباعیات

عبدالعزیز خالد (لاہور)

(۱)

ہمپایہ ہوں کس طور سے عالم، جاہل؟
کس طور سے یکساں ہوں محقّ و مُبطل؟
اوصاف و فضائل کے توسّل ہی سے
تمکین و تمکّن ہو جہاں میں حاصل!

(۲)

خُو اہلِ صفا کی نہ ہو آہُو گیری
آزردہ کریں کسی کو قصداً نہ کبھی
بیرونی جراحتوں پہ رکھیں پھاہا
دلہائے دریدہ کی کریں بخیہ گری!

(۳)

قدرت کی طرف سے طبعِ موزوں ہو عطا
محروم کوئی اس سے سخن کہہ نہ سکا
ہر چند کہ ہو وہ متحجّر عالم
تحریر و خطابت و بیاں میں یکتا!

(۴)

تعداد پہ جاؤ نہ مسلمانوں کی
ہو اس سے کسی پہ نہ مہابت طاری
کیا ہیں وہ غُثاؤ کَغُثاءِ السَّیلِ!
مرمر کا جسے ایک ہی جھونکا کافی!

(۵)

سیران کو کرے نہ خوانِ الوانِ جہاں
ہر شے پا کر بھی رہیں فریاد کُناں
انبوہ خلائق میں کتنے کم ہیں
احسان شناس و متشکّر انساں؟

(۶)

ہو رنگِ زمانہ منقلب اک دم سے
بے دھیان جو ہو وہ بھونچکا رہ جائے
جو جانیں اندھا دھند کو ہر وقت رہیں
تیار کسی بھی ناگہانی کے لیے!

(۷)

حق اس کا کرو ہر ایک ذی حق کو ادا
رکھّو نہ دوئی غیر و یگانہ میں روا
ہے سب سے بڑا گناہ بے انصافی
ہو جس سے فساد و فتنہ دنیا میں بپا!

(۸)

ہیں بخت رسا جن کے، طالع یاور
کھائیں ہم سے رشک نہ ان پر کیوں کر؟
سب ہم کو فراموش کیے بیٹھے ہیں
بے مہریِ عالم سے ہوا سوخت جگر!

ترانے

(اوزانِ رباعی میں سہ مصری نظمیں)

کوثر صدیقی (بھوپال، بھارت)

بلبل کی طرح خوب چہکتے رہیے
پھولوں کی طرح دستِ ستمگر میں بھی
ہر حال میں ہر وقت مہکتے رہیے

سیلاب کی صورت نہ کہیں یہ پھیلے
بہتے ہوئے دریا کو نہ روکو کوثر
ایسا نہ ہو حالات پہ قابو نہ رہے

چلیے کہ اُجالوں کو نیا باب لکھیں
وہ تیل، ملے جس سے اُجالوں کو بقا
بجھتے ہوئے معصوم دیوں میں بھر دیں

آتی نہیں کلیوں کے چٹکنے کی صدا
بلبل نظر آتے ہیں چمن میں لیکن
اٹھتی نہیں شاخوں سے چہکنے کی صدا

برسات اندھیروں کی ہوئی ہے شب بھر
مفلوج پرندوں کا سحر سے ہے سوال
کس طرح اڑیں بھیگے ہوئے پَر لے کر

گرمی نئے سورج کی بدن میں بھر دے
ظلمت زدۂ شب کو ذرا دھوپ میں رکھ
بیدار مری خُفتہ انا کو کر دے

رخصت ہوئے دنیا سے سب اچھے احباب
کہنے کو بہت یار ہیں بستی میں مگر
ملتے نہیں ڈھونڈے سے بھی سچے احباب

مرتا ہوں کہ جینے کی نہیں ہے ہمّت
میں شانۂ ہستی پہ ہوں اک سنگِ گراں
اُٹھتا نہیں یہ بوجھ کسی بھی صورت

کُریدتے ہیں جو اَب راکھ۔۔۔۔

(سانحہ مون مارکیٹ، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور کے تناظر میں)

شگفتہ نازلی

(لاہور)

اندوہناک رات، دسمبر کی سات تھی
بارُود سے ہدف کو بنانے کی بات تھی،
وہ بیچنے خریدنے والے جھلس گئے
پھر دیکھنے کو اپنوں کے چہرے ترس گئے،
آتے ہیں صبح و شام عزیز اور اَقربا
آہ و فغاں کا ہوتا ہے منظر جُدا جُدا،
دیوار و دَر کو دیکھتے، مغموم ہوتے ہیں
کچھ اَن کہے سے نوحے پھر منظوم ہوتے ہیں،
دلدوز چیخیں آتی ہیں کچھ پُوچھتی ہوئی
اور سِسکیاں اُبھرتی ہیں کچھ کھوجتی ہوئی،
اِک بے بسی کی کیفیت فریاد کرتی ہے
بھیگی ہوئی ہر آنکھ دل ناشاد کرتی ہے،
وہ ہیں کہاں کہ سُن سکیں یہ آہ و زاریاں
وہ ہیں کہاں سمجھ سکیں یہ دل فگاریاں،
وہ دلخراش یادوں کو دے کر چلے گئے
نمناک سی سوغاتوں کو دے کر چلے گئے،
شعلہ کوئی یا چنگاری اَب ڈھونڈتے ہیں کیا
ہیں ڈھیر راکھ کے اور ہے اُٹھتا ہُوا دُھواں!

○

شٹ بھجی

بھگوان داس اعجاز

(دہلی' بھارت)

"بہت دنوں سے دل میں تھا"
یہ دل تجھ کو چاہتا
تو ہو جائے بیاہتا
لکھ کے لایا ساتھ
رقعہ چکر کاٹتا
دائیں بائیں ہاتھ!

ہم بیٹھے ہیں دل لٹا
تھوڑی بہت ہمت جٹا
گئے جو ان کے سامنے
آنکھ میں آنسو داب
گھر آئے تو آ گیا
آنکھوں میں سیلاب!

کھڑے کھڑے ہم کھو گئے
آنکھوں آنکھوں ہو گئے
گپت اشارے آج
پہلے متھرا جائیں گے
پھر دیکھیں گے تاج!

کر دے بدا سہیلیاں
ڈال نہ اور پہیلیاں
مہندی رچی ہتھیلیاں
جب لیتا ہوں چوم
کہاں پہنچتا آدمی
کچھ ہوتا معلوم!

○

محبت کے سنہرے پھول کھلنے دو

پروفیسر زہیر کنجاہی

(راولپنڈی)

ترے خوابوں سے
اس دل سے
چرائے تھے کئی سپنے
مگر اِک دِن
تو اپنا چاند سا مکھڑا لئے
زُلفیں بکھیرے
جب مری آغوش میں آئی
ترے اُن پھولوں سے ہونٹوں نے
مرے دل کی سماعت میں
خود اپنی خوشبوؤں کے
حرف بکھرائے......کیا
دیکھو مجھے چھیڑو نہیں
ایسا نہ ہو
زُلفیں مری ساری
خزاں سے بہت پہلے
بکھر جائیں
ابھی تو زندگی کے ہاتھ میں ہوں
تری حیرت میری چاہت کے
سب رستے
بڑے شاداب ہیں
دیکھو
ابھی جلدی ہی کیا ہے
چار سو دن کا اُجالا ہے
اندھیری رات کی
وحشت کو اُجلے دن سے ملنے دو
محبت کے سنہرے پھول کھلنے دو

اللہ بول

حفیظ انجم کریم نگری
(کریم نگر، بھارت)

خود کو تو اندر سے ٹٹول اللہ بول
ظاہر باطن میں ہے جھول اللہ بول
کانوں میں تو مصری گھول اللہ بول
میں ڈولوں اور تو بھی ڈول اللہ بول
من کی اپنے کھڑکی کھول اللہ بول
جب منہ کھولے شُھ شُھ بول اللہ بول
کب تک آخر ڈانواڈول اللہ بول
کب تک تیرا ٹالم ٹول اللہ بول
کیسی دنیا کیسا خول اللہ بول
باتیں کرنا سیکھ انمول اللہ بول
اور بھی بگڑے گا ماحول اللہ بول
پہلے بھیج اسپر لاحول اللہ بول
ہاتھ میں لیکر تو کشکول اللہ بول
پیٹ تو رب کے نام کا ڈھول اللہ بول
مفت ہوا بھی پانی بھی وہ دیتا ہے!!!
کیا دیگا تو اِنکا مول اللہ بول
بستر باندھ کے رکھ لے انجم اچھا ہے!!!
کس کو پتہ کب ہوگا گول اللہ بول

○

موت کی پرچھائیاں

خورشید انور رضوی
(اسلام آباد)

برف زاروں میں ٹھٹھرتے لوگ یہ پیرو جواں
اب کوئی دیوار و در باقی نہ اب کوئی مکاں
رات کو تو ہر پرندہ ڈھونڈتا ہے آشیاں
ہائے قسمت نے کیا ہے ان کو کیسا بے اماں
بے سرو سامانیوں میں یہ یہیں مر جائیں گے
جابجا لاشے پڑے ان کو درندے کھائیں گے
دم بدم بڑھنے لگی ہیں ان کی اب مایوسیاں
زندگی کے رخ پہ ہیں اب موت کی پرچھائیاں
بے زباں معصوم بچے ماں کی سوکھی چھاتیاں
ان بلکتے بھوک سے بچوں کی یہ محرومیاں
سوچتا ہوں کون دے گا ان کو کوئی سائباں
کوئی ان کو جو نہ پہونچا تو یہ جائیں گے کہاں
قبل اس کے برف سے سب راستے مسدود ہوں
پہونچنے کی ان تلک سب کوششیں بے سود ہوں
آؤ ان میں زندہ رہنے کی امنگیں بانٹ دیں
دکھ کے مارے جان ہارے پھر سکوں کی سانس لیں

○

''قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے''

خالد حمید شیدا (یو۔ایس۔اے)

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے! وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برقِ خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلک ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے
بے نیازی تِری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

○

I'm totally insane and I'm to blame
But let my madness become your fame

O please don't end our relationship
The budding flower of my love don't nip

And if with me you don't want to be seen
Then let me use a go-between

Be a casual friend if you possibly can
I know you're in love in another man

I know, my darling, you're not perfect
So mind I will not a little neglect

Oh, life is short and the time flies
So on what I have let me capitalize

I don't mind troubles; I don't mind woes
For your sake, my love, I'll put up with foes

I'm not in a hurry; I'll patiently wait
And learn to live with my cruel fate

I promise to you I'll not be upset
And take from you whatever I get

And GHALIB tells me that I should not pout
And if I can't have you, I should do without

○

''جینے کی ادا کرب و بلا سے سیکھیں''

ایک مختصر فنی جائزہ

پروفیسر مامون ایمن (نیویارک)

حضرت خواجہ محمد امیر المتخلص بہ صبا اکبر آبادی کے فنِ مرثیہ گوئی میں ان کا اسلوب، کربلا کی روایتی جہت سے ہٹ کر، چند دیگر جہتوں کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ ان جہتوں میں احتسابِ ذات، تجزیۂ ماحول، استواریِ حیات اور مشاہداتِ افکار و افعال کی حیثیتیں نسبتاً زیادہ نمایاں ہیں۔ یہ جہتیں مجرد نہیں۔ صبا کے ذہن و قلم انہیں ایک مجرد انداز میں پیش کرنے کی سعی ضرور کرتے ہیں۔ اس سعی پر صبا صاحب کی طرزِ نگارش کی مہر ہے۔ یہ مہر انفرادی ہے لہٰذا موصوف کا اسلوب انفرادی ہے۔ یوں کہیے کہ ایک ''اجتماعی مضمون'' کو ایک ''انفرادی بیان'' بنانا، اِزدحام میں اپنا تشخص برقرار رکھنا، یا طوفان میں کام یابی سے قدم جمائے رکھنا ناممکن تو نہیں، مشکل امور ضرور ہیں۔ اس حقیقت سے اتفاق کے بعد، یہ کہا جا سکتا ہے کہ صبا صاحب کی تحریر ان کے وقت کی تحریر ہے، ان کے ماحول کی تحریر ہے، ان کی زندگی کی تحریر ہے، ان کی فکر کی تحریر ہے۔ وہ فکر جو ماضی کے حالات و واقعات کو حال سے یوں ہم کنار کرتی ہے کہ ان میں مستقبل کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ تاریخ کے ابواب صرف جانے والے دنوں ہی کا بیان نہیں، ان میں وجدان کی بنیاد پر آج کے دن اور آنے والے دنوں کی صورتیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ شاعر صبا کے فن میں اس صورتِ حال کا اہتمام ہے۔ تناظر کے ضمن میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ متون اور واقعات کے حوالوں سے، دوسرے مرثیہ نگاروں سے قطعی طور پر الگ نظر نہیں آتے۔ یہ توقع قیاس کی حد میں نہیں کہ اس صنف کی لفظیات، تراکیب، موضوعات، اسباب اور نتائج بہ ہر حال مشترک ہیں۔ ہر فن کار انہیں اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق چُنتا ہے اور برتتا ہے۔ مجموعہ اشتراک میں تخصیص کا پہلو کیسے دَر آتا ہے؟ مرثیہ کے عوامل اور عناصر کا انفرادی طور پر جائزہ، تجزیہ اور ان سے جذباتی نسبت کی نوعیت، وغیرہم تخصیص کی تشکیل کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ صبا صاحب کا فنِ مرثیہ نگاری محض کوئی مشقِ سخن نہیں۔ ان کا فن جذبِ عقیدت و اعتراف کا مظہر ہے۔ یہ مظہر روحِ ایماں سے براہِ راست رشتہ استوار کرتا ہے کہ یہ رشتہ اہلِ بیت سے رشتہ ہے۔ یہ رشتہ رسولِ پاک سے جذباتی اور دینی قرب کا سب سے زیادہ معتبر رشتہ ہے۔ صبا صاحب کے مراثی میں اعتبار کا لہجہ ہے۔ اس لہجہ میں برجستگی بھی ہے اور وارفتگی بھی، اس لہجہ میں اخلاصِ نیت پر مبنی سادگی کا وجود اپنی تمام تر طرح داری اور تہہ داری کے ساتھ خود کو متعارف کرواتا اور منواتا نظر آتا ہے۔ اس دو پہلو عمل میں خود سپردگی کا انمول جوہر ہے۔ خود سپردگی کا براہِ راست واسطہ ''ہجر میں وصل کی تمنا، دوری میں قرب کی آرزو، سراب میں منزل آسا راہ کی دعا، اندھیرے میں اجالے کی ہاؤ ہُو، نیاز میں بے نیازی کی صورت، اور برجستگی میں احتیاط کے عنصر'' سے ہے۔ ''وارفتگی، خود سپردگی، برجستگی'' ایسے مفاہیم عمومی طور پر صنفِ غزل کے لیے مخصوص ہیں۔ اس بات کا اطلاق ''ہجر، وصل، تمنا، اندھیرا، اجالا، نیاز، بے نیازی'' پر بھی ہوتا ہے۔ صبا صاحب اس بات سے خوب آشنا ہیں۔ وہ اس آشنائی سے، ابلاغ اور اظہار کے ضمن میں، انفرادیت کا ایک دَر یوں وا کرتے ہیں کہ وہ دَرِ صنفِ مرثیہ کا پیامی بن جاتا ہے۔ صنفِ غزل سے صنفِ مرثیہ کی جانب رواں یہ تغیّر مروری نہیں، پایدار ہے۔ یہی تغیّر صبا صاحب کے جذبات، احساسات، اشاروں، کنایوں اور ترجیحات کا یوں احاطہ کرتا ہے کہ فکر اور عمل کے پیش تر پہلو اور زاویے وسیع سے وسیع تر ہو جاتے ہیں۔ ابلاغ و اظہار کی یہی وسعت صبا صاحب کے فنِ مرثیہ گوئی کی اساسی راہ ہے۔ یہی راہ ان کی انفرادیت میں انسلاک کی بنیاد ہے۔ یہ بنیاد زندگی کو کسی خوش باش جھونکے سے بھی کم تر ٹھہراتی ہے۔ یہ جھونکا خدشات کا ہدف ہے۔

ہوتے ہیں روز دامنِ گیتی میں حادثات
ہر وقت زد میں موت کی ہے کشتیِ حیات
معمورۂ فنا ہے حقیقت میں کائنات
اِک کھیل ہے ہَوا کا، یہ ہستیِ بے ثبات

یہ بند مشاہدات پر مبنی ہے۔ یہ مشاہدات انفرادی نہیں، اجتماعی ہیں۔ ان مشاہدات میں عیاں اشارے حقائق سے معمور ہیں جن کے اعتراف میں تاخیر تو ہو سکتی ہے لیکن ان کی تردید کسی بھی طور پر ممکن نہیں۔ صبا صاحب کی تحریر میں الہام، اِبہام اور اوہام نہیں کہ وہ اپنے تجربات اور مشاہدات کو غیر ضروری، بے جا سوالات، خدشات اور شبہات سے الجھانا نہیں چاہتے۔ وہ تو کرب و بلا کا ذکر اس حقیقی رنگ کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں جو اس واقعہ کو بلاشبہ، ایک سانحہ قرار دیتا ہے۔ ایک ایسا سانحہ جس کا وجود ہر شبہ، ہر شک سے بالا ہے۔ ایک ایسا سانحہ جو معنوی طور پر بھی اور جذباتی طور پر بھی نہ صرف ہمہ جہت ہے بلکہ ایک عالمی سبق کے طور پر ہمہ وقت بھی ہے۔ یہ سبق ایک حقیقت کا علم بردار ہونے کے باوجود، اپنی ذات میں ایک واضح اور روشن علامت بھی ہے۔ بجا کہ واقعۂ کربلا ایک معرکۂ کہنہ ہے لیکن سچ اور جھوٹ کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والا یہ غم آلود معرکہ آج بھی خود کو صلاح و فلاح کے لیے، زمانہ بھر کو فکر کی دعوت دیتا نظر آتا ہے۔ اس دعوت سے اُبھرنے والی ہر منزل خود کو ایک نئے راستے میں ڈھال لینے کا ہنر رکھتی ہے۔ اس دعوت کا براہِ راست رشتہ وقت سے ہے جو خاموشی سے سفر تو کرتا ہے لیکن کبھی موسم یا تکان کے باعث کسی موڑ، کسی پڑاؤ پر آرام کی تمنا نہیں کرتا۔ صبا صاحب کا فنِ مرثیہ گوئی حقیقت کو اعتراف سے، اعتراف کو اخلاص سے، اخلاص کو استقلال سے اور استقلال کو اعتبار سے مربوط کرتا ہے۔ یہ اعتبار راہِ الم پر رواں دواں ہے۔ یاد رہے کہ یہ راہ ایک دائرہ ہے کہ سانس اور غم کا رشتہ مسلسل ہے۔ یوں سانس کو غم سے اور حُسینؑ کو کربلا سے

جدا نہیں کیا جا سکتا۔ کربلا کا پیام جاری و ساری ہے۔ حُسینؓ نے فنا سے معمور زندگی کو عزّت دے کر بقا کا مژدہ سنایا ہے۔

لیکن وہی کہ جن سے ہے توقیرِ زندگی
جو زندگی میں کر گئے تطہیرِ زندگی
کھینچی ہے اپنے خون سے تصویرِ زندگی
مرنے کے بعد بھی ہیں وہ تقدیرِ زندگی
گو سامنے نہیں ہیں، زبانوں پہ نام ہے
ایوانِ زندگی میں انہیں کا قیام ہے

صبا صاحب نے وقت کی دھڑکنوں میں موجود حُسینؓ کا جواز بہت احتیاط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مجوّزہ احتیاط بہ ہر حال ناگزیر تھی کہ خالق خالق ہے اور مخلوق مخلوق ہے۔ ہر جائی کا مقام صرف خالقِ کائنات کو حاصل ہے۔ حُسینؓ کو یہ شرف، یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ اپنے ثابت قدم، حق گو کردار کے باعث رہینِ زباں ہیں۔ حُسینؓ کی تقدیر، تقدیرِ حُسینؓ نہیں۔ یہ تقدیرِ زندگی ہے۔ تقدیرِ زندگی کا فخر، عزم اور جرأت کے گویا آئینہ کا ایک جیتا جاگتا، پُرنور پرتو ہے۔ یہ پَرتو بنی نوع انساں سے باز گوئی کا طلب گار ہے تا کہ سچ کا اعتراف اور جھوٹ سے انحراف ہوتا رہے کہ یہی کربلا کا پیام ہے، یہی حُسینؓ کی قربانی کا ماحصل ہے۔ یہ پیام برملا اعلان کرتا ہے۔ "شبیرؓ وہ پیش رو ہے جو مِٹ تو سکتا ہے قدم پیچھے نہیں رکھ سکتا، وہ طوفان پلٹ دینے والا ناخدا اور منزل سمیٹنے والا رہ نما ہے، ایوانِ ملت کا مقدّر یہ ہے کہ نبیؐ اُس کی تعمیر کرے اور حُسینؓ اُسے سجائے، شبیرؓ وہ مردِ حق ہے جو اجتہاد سے الحاد کا انسداد کرتا ہے اور معصوموں سے فوجوں کا کام لے کر جہادِ اسلام کرتا ہے۔" کردارِ حُسینؓ کی توضیع کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ توضیح کا یہ سلسلہ متنذبذب نہیں، مشکوک نہیں، برملا اور برحق ہے۔

مجروح سہی، بہارِ عالم ہیں حُسینؓ
بے کس سہی، شہریارِ عالم ہیں حُسینؓ
کیا تاج کے سامنے جھکاتے سَر کو
سردے کے بھی، تاج دارِ عالم ہیں حُسینؓ

"مجروح، بے کس" ایسے الفاظ بہ ظاہر حوصلہ افزا خیالات کو جِلا نہیں دیتے، بجا، لیکن ان کے ہم راہ "بہار، شہریار، تاج دار" بھی تو ہیں جو ہر منفی ردِّ عمل کو مثبت عمل اور احساس کے لیے، کام یابی کے ساتھ راستہ استوار کرتے ہیں۔ صبا صاحب کے اسلوب میں نفی کی تردید موجود ہے۔ اس اسلوب میں "کربلا کو حُسینؓ سے نسبت ہے، حُسینؓ کو اہلِ بیت سے نسبت ہے، اہلِ بیت کو محمدؐ سے نسبت ہے"۔ ان نسبتوں کا سلسلہ زرا آگے بڑھایئے۔ "محمدؐ کو دین سے نسبت ہے، دین کو وحدانیت سے نسبت ہے، وحدانیت کو فلاح سے نسبت ہے، فلاح کو نجات سے نسبت ہے"۔ نجات اُسی صورت میں ممکن ہے جب کسی بھی توقف کے بغیر سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہا جائے۔ یوں حُسینؓ کے نام پر اِتمامِ محبّت ہوتا ہے کہ اس میں حزن و ملال ہیں، اس میں طاقت کے نشّہ میں دُھت بے جا اقتدار کا خواہاں ذہن، عقل سے عاری ہو کر گم رہی کا دل دادہ نظر آتا ہے۔ وہ ذہن اِس دنیا کو اُس دنیا پر ترجیح دیتا ہے۔ دوسری جانب، اِسی اِتمامِ محبّت سے یہ بھی تو واضح ہوتا ہے کہ ایک ظالم طاقت وَر ہونے کے باوجود ایک مظلوم سے بے حد کم زور ہے۔ مجوّزہ اِتمامِ محبّت صنفِ مرثیہ کی سرخ روئی ہے۔ یہ سرخ روئی صبا صاحب کے انفرادی فن کی سرخ روئی ہے۔

فنِ مرثیہ گوئی میں صبا صاحب کا مقام، عصری حوالہ سے، بلا شبہ نمایندہ ہے۔ اس نمایندہ حیثیّت کا منظر عیاں ہے۔ یہ منظر گڈ مڈ نہیں کہ اس میں ہر چہرہ گویا ہے۔ مجوّزہ گویائی کا پس منظر اپنے منظر سے یوں مربوط ہے کہ زبان اور بیان یک جان ہیں۔ زبان کے ضمن میں، صبا صاحب کی پختہ گوئی روایت اور اختراع سے ہم کنار ہے۔ روایت کے ضمن میں، تقریباً ہر مرثیہ ان مفردات کو اپنے دامن میں ضرور سمیٹتا ہے۔ "توسن، فرات، کوفہ، شام، مدینہ، کربلا، خط، یزید، شمر، حُر، زینبؓ، عبّاس، حُسینؓ"۔ صبا صاحب نے اپنے مراثی میں، بیان کو بنانے اور سجانے کے لیے نسبتاً کم مستعمل مفرد الفاظ کو معانی کے ساتھ ساتھ تاثرات کا جامہ پہنایا ہے، مثلاً۔ "نرگس، حباب، باک، پتلیاں، محجوب، ڈپٹ، سحر، منکا، ہمتا، ڈاب، قبالہ"۔ مرکّباتِ اضافی کے ضمن میں وہ روایت کے ہم سفر ہیں۔ مثلاً۔ "سبطِ نبیؐ، وفورِ اشک، پشتِ فرس، اشکِ خوں، جامِ جم، جادۂ حرم، رنگِ نہاں، آمادۂ قتال، عرقِ انفعال، لذّتِ اجل"۔ اُن کا بے قرار قلم سفر جاری رکھنے کے لیے اختراعی راہ اختیار کرتا ہے، مثلاً۔ "لحمکِ لحمی، نقشِ صاف، عنوانِ آفرینش، بصیرتِ باطن، شیشۂ پُر خاک، مقصودِ کُن، حُسنِ باصفا، رُوکشِ قمر، گرزِ جاں، اوراقِ جسم"۔ "کحل البصر" کی ترکیب کا ایک علیحدہ حُسن ہے۔ اب اِن روایتی مرکّباتِ عطفی پر نظر ڈالیے۔ "ہست و بود، سیر و دید، زیر و زبر، ارض و سَما، بلند و پست، معانی و صورت، رست و خیز، کَر و فر، آب و تاب، آفت و بلا"۔ اس ضمن میں نئی تراکیب بھی سامنے آتی ہیں، مثلاً۔ "زیب و زین، زشت و خوب، کیف و کم"۔ مرثیہ میں حَسین و مست" کی ترکیب کا حُسن جداگانہ ہے۔

مرثیہ کا ایک نام اور بھی ہے، داستانِ رزم و بزم۔ اس داستان کی صورت دیگر داستانوں کی صورتوں سے مختلف ہے کہ یہ داستان حقائق سے معمور ہے۔ اس داستان میں اسباب و نتائج کے پہلو بھی ہیں اور عقیدت، قُرب، اقتداء، احتیاط اور اجتناب کے الگ الگ پیغامات بھی ہیں۔ ہر مرثیہ گو کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنا بیان موثر بنانے کے لیے، رواں دواں، مترنم بحروں کا انتخاب کرے۔ اس ضمن میں، بحرِ مضارع مثمّن اخرب مکفوف محذوف/مفعول، فاعِ لاتُ، مفاعیل، فاعِ لُن/ کی حیثیت نسبتاً زیادہ نمایاں اور مقبول ہے۔ صبا

صاحب کی بیش تر مراثی اس بحر میں ہیں، مثلاً۔ پھر زندگی ہے موردِ بے دید آج کل/ پہلے قدم اُٹھاؤں تو حمدِ خدا لکھوں/ جو صبحِ زندگی ہے وہی شامِ زندگی/ تلوار سے کھری ہے، سپاہی کی قبر ہے/ وہ دَور جب نبیؐ سے علیؓ تک پہنچ گیا/ ذرّے نظر ملانے لگے آفتاب سے/ کہیے تو آسمان سے تارے اُتار دیں/ "۔ صبا صاحب کی دوسری پسندیدہ بحر، بحرِ رمل مثمن سالم محذوف ہے، فاعِ لاتن، فاعِ لاتن، فاعِ لاتن فاعِ لن، مثلاً۔ " یہ ہوا یہ روحِ انساں، یہ مدارِ زندگی/ اِس اندھیری رات میں پھر روشنی ہو جائے گی/ آج تک اُن کو پکارا ہے اُنہی کے نام سے/ "۔ اسی بحر میں ایک مرثیہ چھڑکنی بھی ہے۔ " عشق پیغامِ اجل سے کم نہ تھا/ فاعِ لاتن، فاعِ لاتن، فاعِ لُن " بحروں کے ضمن میں یہ مثالیں بھی دیکھیے۔ " آج اس بزم میں اربابِ نظر بیٹھے ہیں/ فاعِ لاتن، فِعلاتن، فعلن/ بحرِ رمل مثمن سالم مخبون محذوف "۔ " رُخِ انور کی تنویریں فضا میں جلوہ ساماں ہیں/ بحرِ ہزج مثمن سالم/ مفاعیلُن، مفاعیلُن، مفاعیلُن، مفاعیلُن/ "۔ اِسی بحر میں مکفوف محذوف صورت بھی نظر آتی ہے۔ " آئی شبِ عاشور جو میدانِ بلا میں/، رکھتا کبھی تلوار، اُٹھاتا کبھی خنجر/ مَف عول، مفاعیل، مفاعیل، فعولن "۔ " روشن روشن چاند ستارے بحرِ زمیں میں ڈوب گئے/ فِعلُن، فِعلُن، فِعل، فعولُن، فِعل، فعولُن، فِعل، فَعل/ بحرِ متقارب شانزدہ "۔

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ شعر کو شاعر کی ذات سے جُدا کیا گیا ہو کہ شعر تخلیق کا وہ آئینہ ہے جس میں صاحبِ تخلیق کا پَرتو جھلکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مجوّزہ پرتو روشن بھی ہو سکتا ہے اور دھندلا بھی۔ مجوّزہ پرتو کا براہِ راست واسطہ صاحبِ تخلیق کے ظاہر سے بھی ہوتا ہے اور باطن سے بھی۔ فنِ مرثیہ گوئی میں صبا صاحب کی تخلیق کا آئینہ گرد سے محفوظ ہے، لہٰذا ان کا پَرتو روشن ہے۔ اس روشن پرتو سے صبا صاحب کی شخصیّت کے خدوخال واضح ہوتے ہیں، مثلاً۔ " وہ کنارِ بحر پر ایک تشنہ کام ہے جو ایک ناتمام طلب کے ساتھ، حضورؐ کے در پر نگاہِ لُطف کی امّید لیے حاضر ہے/ وہ ہر قطرہ ہر ہر جام میں ربّ العزت کا جلوہ دیکھتا ہے تو پکار اٹھتا ہے، اللہ ہو، اللہ ہو/ اُس کے ہر سانس میں رب کا نام ہے/ وہ خود اپنا دشمن ہے/ اس کے ہونٹوں پر کئی طرح کے سوالات ہیں/ وہ پوچھتا ہے کہ مضطرب دل ہر آن کیوں دھڑکتا ہے اور لہو کیوں کر گردش میں رہتا ہے/ وہ ایک گنہ گار ہے، شرم سار ہے، بے قرار ہے/ زندگی کے بازار میں اُس کی قیمت بہت کم ہے/ وہ دلِ بے قرار کے لیے گذری بہار کے قرار کا خواہاں ہے/، وہ دنیا میں قیام کا عرصہ قلیل اور بے ثبات جانتا ہے/ وہ خواہشات کے حصول سے نہیں، رب کے ذکر سے نجات کا سرمایہ حاصل کرنا چاہتا ہے/ وہ خود کو ایک حقیر بندہ بھی کہتا ہے اور زعمِ زباں تیج کر، ہر بیان کو رایگاں جانتا ہے کہ فن پر اس کی دسترس نہ ہونے کے برابر ہے/ اللہ کے کرم سے اُس کے ہونٹوں پر رسولؐ عربی کا نام بار بار آتا ہے/ اُس کے نزدیک، یادِ کربلا سے گریہ و ماتم کی صدا آتی ہے/ وہ ایوانِ شہادت کی ہوا سے مجلس میں سکون پاتا ہے "۔

ہر وقت جو یادِ کربلا آتی ہے
بس گریہ و ماتم کی صدا آتی ہے
مجلس میں سکون پا لیتا ہوں
ایوانِ شہادت کی ہَوا آتی ہے

یہ تو تھیں صبا صاحب کی شخصیت سے متعلق باتیں۔ اب آیئے ذرا دیکھیں کہ اِن باتوں سے اُن کے پیغامات، تجربات اور مشاہدات کے دَر کن جھونکوں کے لیے وا ہوتے ہیں، مثلاً۔ " زندگی یزداں کا ایک بہا عطیّہ ہے/ زندگی کی صبح اور شام میں کوئی فرق نہیں/ موت کے سامنے جینے کا سوال نہیں ہوتا/ آلِ عبا کو مرگ وحیات کا انتظام حاصل ہے/ لوگوں پر آلِ رسولؐ کا ادب لازم ہے/ حشر میں قہرِ خدا کے سامنے غرور و شجاعت دھرے رہ جائیں گے/ قلبِ کائنات میں موجود حُسینؓ زندگی کا مقصد و مقصود ہیں/ حُسینؓ نے خود کو مٹا کر دین بچایا اور موت کو حیات بنایا/ ہاتھوں کو یہ دسترس حاصل ہے کہ وہ کلیجہ تھام لیں/ فلک کو دیکھنے کے لیے دیدۂ بینا درکار ہے/ انسان کو آنکھیں اس لیے عطا ہوئی ہیں کہ وہ اہلِ بیت کے لیے خوں چکاں رہیں/ شرابِ جمالِ حُب کے رسیا جامِ سفال کو منہ نہیں لگاتے/ عزائے حُسینؓ سے مرہون زیب و زین کی کوئی مثال نہیں/ قربانیِ حُسینؓ شہادتِ عظمیٰ ہے "۔

بلا شبہہ، معرکۂ کربلا جھوٹ کے سامنے سچ کی ایک جیتی جاگتی حقیقت بھی ہے اور ہر زمانہ کے لیے، حیات و موت کے ضمن میں فنا و بقا کا ایک مسلمّہ عیار بھی۔ یہ معرکہ ایک تابندہ اصول بھی ہے اور اعتراف و اعلانِ حق کا ایک زندہ و جاوید باب بھی۔ اس باب میں ایک علامت بھی سرگرمِ بیاں ہے۔ صبا صاحب نے اپنے ہنرِ شعر گوئی سے مجوّزہ حقیقت اور علامت کو یک جان کیا ہے۔ وہ اِس ہنر کو بروئے کار لاتے ہوئے، احساسات اور جذبات حزن کو جوازِ اعتبار فراہم کرتے ہیں۔ صبا صاحب! فنِ مرثیہ گوئی سے کتابِ سخنِ حیاتِ بقا پر دست خط ثبت کرنے کا شکریہ۔

نیو یارک شہر میں تقریباً آدھ صدی سے مقیم لاہوری، پنجابی بولنے والے انگریزی زبان کے استاد، اس ہیچ مدان مضمون نگار کی جانب سے مقتدر رباعی گو حضرت صبا اکبر آبادی کے فنِ مرثیہ گوئی کے نام یہ اعترافی رباعی نہایت ادب سے حاضر ہے۔

جینے کی ادا کرب و بلا سے سیکھیں
سچ کیا ہے، چلیں آلِ عبا سے سیکھیں
مرثیہ نگاری کا ہو جب فن مقصود
لازم ہے یہ، ایمنؔ! کہ صباؔ سے سیکھیں

☆

''طوفانِ حوادث سے گزرنا سیکھو''

نند کشور وکرم

(دہلی، بھارت)

برصغیر کے معروف و ممتاز صحافی، ادیب، ناول نویس، افسانہ نگار، ٹریڈ یونینسٹ اور سماجی کارکن جمنا داس اختر کا یکم اگست ۲۰۰۹ء کو نئی دہلی میں انتقال ہو گیا جن کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے برسوں پہلے پاکستان کے نامور صحافی، شاعر، خطیب اور مجاہدِ آزادی شورش کاشمیری نے اپنے ہفت روزہ اخبار ''چٹان'' لاہور کے مئی ۱۹۵۰ء کے شمارے میں لکھا تھا:

اب بھی پابندیٔ آئین و وفا باقی ہے
اب بھی انسان کے چہرے پہ حیا باقی ہے
اب بھی کچھ لوگ رہ و رسمِ وفا جانتے ہیں
اب بھی آوازۂ تسلیم و رضا باقی ہے

اور سچ مچ یہ نظم اختر صاحب کے کردار و شخصیت کی منہ بولتی تصویر ہے کیونکہ وہ ہمارے دور کے ایک ایسے مردِ مجاہد تھے جو گزشتہ پون صدی سے صحافت و ادب کے علاوہ سماجی میدان میں بھی سرگرم عمل رہے اور جن کی غیر معمولی خدمات کا اعتراف ملک کی متعدد نامور ہستیوں نے کیا تھا۔

میری اختر صاحب سے پہلی ملاقات غالباً ۶۲-۱۹۶۱ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ صحافت، نئی دہلی میں ہوئی تھی جہاں وہ جز وقتی طور پر لیکچرار تھے۔ مگر مَیں اختر صاحب کے نام سے بہت پہلے سے واقف تھا۔ اور یہ بات ۱۹۴۵ء کی ہے جب میں سناتن دھرم ہائی اسکول راولپنڈی میں نوویں جماعت میں داخل ہوا تھا۔ وہاں ایک دن ہمارے اُردو کے اُستاد ''ماسٹر نرسنگھ داس'' جی نے پڑھائی کے دوران بڑے فخر سے ان کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''معروف صحافی اور ادیب جمنا داس اختر بھی اسی اسکول میں پڑھتے رہے ہیں اور اسکول کو اس بات کا بے حد فخر ہے۔''

اختر صاحب کو زیادہ تر اہلِ اُردو ایک ممتاز صحافی اور ایڈیٹر کی حیثیت سے جانتے ہیں حالانکہ اُن کی زندگی کے کئی اہم پہلو ہیں اور وہ کئی میدانوں میں سرگرم عمل رہے ہیں۔ وہ ایک کامیاب ناول نویس، ممتاز سماجی کارکن، معروف ٹریڈ یونینسٹ، شاعر اور تاریخ داں بھی تھے لہٰذا اُن کی ہشت پہلو شخصیت کو سمجھنے کے لئے اُن کے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا جانا چاہیئے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں اختر صاحب نے اپنی زندگی کی شروعات صحافت سے کی تھی اور اپنی طویل صحافتی زندگی میں کئی اخبارات سے وابستہ رہنے کے علاوہ انہیں بہت سے نامور اور تاریخ ساز صحافیوں اور مدیروں کے ساتھ کام کرنے کا یا اُن کی قربت میں رہنے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ جیسے مولانا ظفر علی خاں، مہاشہ کرشن، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، میلا رام وفا، مہتہ خوشحال چند خورسند (ایڈیٹر ملاپ)، نانک چند ناز، پریتم ضیائی، گوری شنکر ساگر وغیرہ۔ ان کے علاوہ اُردو کے کئی نامور اور ممتاز ادیب اور شاعر مثلاً مالک رام، گوپال متل، ہنسراج رہبر اور رامانند ساگر بھی ان کے ساتھ بطور صحافی کام کرتے رہے تھے۔

اختر صاحب کی ولادت ۲؍نومبر ۱۹۱۶ء کو راولپنڈی (حال پاکستان) میں ہوئی۔ ان کے والد کا تعلق موہیال براہمنوں کی دت شاخ سے تھا جنہیں حسینی براہمنوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور جن کے بارے میں روایت ہے کہ ان کے اجداد نے میدانِ کربلا میں حضرت امام حسینؓ کے ساتھ یزید سے جنگ کی تھی۔ مگر اختر صاحب کو اپنے حقیقی والدین کے ساتھ رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملا کیونکہ ان کے پھوپھا مہتہ بھگوان داس چھبر نے انہیں گود لے کر اپنا بیٹا بنا لیا تھا جس سے اُن کا سلسلہ نسب بھائی متی داس کے معروف خاندان سے جا ملتا ہے اور جس خاندان میں بھائی بالمکند چھبر اور بھائی پرمانند ایسی نامور ہستیاں گزری ہیں۔

اُن کے پھوپھا مہتہ بھگوان داس چھبر راولپنڈی میں سرکاری ملازمت میں تھے مگر انہیں سیاست اور صحافت میں بے حد دلچسپی تھی لہٰذا ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ ایک مقامی اخبار ''شانتی'' میں بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر کام کرنے لگے جس کے ایڈیٹر مہتہ کشن چند موہن تھے جنہیں خلافت تحریک کے دنوں میں برطانوی سرکار نے گرفتار کر لیا تھا اور جس کے نتیجے میں اخبار بند ہو گیا تھا۔ بعد ازاں اس اخبار کو دوبارہ جاری کیا گیا مگر مہتہ کشن چند کو انگریزی حکومت نے دوبارہ گرفتار کر لیا اور ساتھ ہی پریس بھی ضبط کر لیا جس کے نتیجے میں اخبار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ اختر صاحب کو صحافت اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی تو غلط نہ ہوگا۔

بھگوان داس چھبر جی کی دیکھا دیکھی اختر صاحب کو بھی بچپن سے ہی صحافت میں دلچسپی ہو گئی اور ۱۹۳۱ء میں وہ بحیثیت نمائندہ ''روزنامہ'' بندے ماترم' اور آئندہ برس ''سناتن دھرم پرچارک'' امرتسر اور ''ارجن'' کے ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ پھر ۱۹۳۳ء میں ترقی کر کے وہ روزنامہ بندے ماترم کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بن گئے۔

دو تین سال لاہور میں بطور اخبار نویس ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں وہ واپس راولپنڈی آ گئے اور وہاں سے انہوں نے ہفت روزہ ''پیشوا''

کی شروعات کی مگر یہ اخبار زیادہ مدت نہ چل سکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دوبارہ ۱۹۳۶ء میں لاہور منتقل ہوگئے۔اور روزنامہ ویر بھارت میں بحیثیت جائنٹ ایڈیٹر کام کرنے لگے۔پھر ایک سال بعد ۱۹۳۷ء میں وہ مذکورہ اخبار کی ملازمت ترک کرکے روزنامہ ''بھارت ماتا'' لاہور میں اور ۱۹۳۹ء میں مہاشہ خوشحال چند کے اخبار ورزنامہ ''ملاپ'' میں بحیثیت جائنٹ ایڈیٹر کام کرنے لگے۔۱۹۴۳ء میں ہندی روزنامہ ''وشو بندھو'' میں جائنٹ ایڈیٹری کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ''ایلائیڈ پریس سروس'' کی بھی شروعات کی۔جو حصولِ آزادی کے ایک سال بعد تک بھی چلتی رہی۔۱۹۴۷ء میں وہ دہلی آگئے اور روزنامہ ''تیج'' میں چیف ایڈیٹر کے عہدے پر مقرر ہوئے۔بعدازاں ۱۹۵۵ میں وہ اس اخبار کو چھوڑ کر چودھری برہم پرکاش کے روزانہ اخبار ''سنسار'' سے وابستہ ہوگئے اور کچھ مدت بعد انہیں گوپی ناتھ امن کی جگہ اس کا چیف ایڈیٹر بنا دیا گیا۔پھر اپریل ۱۹۵۶ء میں انہوں نے اپنا نجی ہفت روزہ ''سویرا'' جاری کیا جسے بعدازاں انہوں نے روزنامے میں منتقل کردیا۔یہ اخبار تقریباً ۳۳ سال تک جاری رہا اور ۱۹۸۹ء میں بوجوہ بند ہوگیا۔

۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۵ء کے دوران سویرا کی ادارت کے ساتھ ساتھ وہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت میں جزوقتی لیکچرار کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتے رہے۔۸۳۔۱۹۷۵ کے دوران وہ روزنامہ ''جنگ'' کراچی اور ڈیلی نیوز کراچی سے بطور کالم نویس وابستہ رہے۔۸۰۔۱۹۷۹ کے دوران وہ لندن میں قیام پذیر رہے اور اس دوران انہوں نے قدیم تاریخ میں تحقیق کرنے کے علاوہ انگریزی کے روزنامے ''پائنیر (Poineer)'' میں نامہ نگار کی حیثیت سے کام کرنے کے علاوہ لیبر پارٹی کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔اور ساتھ ہی برمنگھم کی کاؤنٹی کونسل کے انتخاب کے دوران انہوں نے اس کی بھرپور حمایت کی۔بعدازاں ان کی مذکورہ خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لیبر پارٹی نے ایک تقریب میں ان کی قدرافزائی بھی کی تھی۔اسی دوران لندن اور برمنگھم میں بی بی سی اور واشنگٹن میں وائس آف امریکہ نے ان کے انٹرویو نشر کئے۔اس کے علاوہ لندن میں قیام کے دوران انہوں نے ''پریم سبھا'' کی بنیاد رکھ کر وہاں آباد ہندوستانیوں اور پاکستانیوں میں اتحاد و دوستی کو بھی تقویت بخشی۔

اختر صاحب کی صحافتی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔وہ لگ بھگ پون صدی سے زیادہ عرصہ تک اس پیشے سے وابستہ رہے مگر وہ اسے پیشہ نہیں بلکہ ایک مقدس فریضے کی طرح انجام دیتے رہے۔اُن کا فرمانا تھا کہ اخبار نویس کا کام صرف خبروں اور فیچروں کا ترجمہ کرنا یا کرانا، انہیں ترتیب دینا یا اداریہ لکھ کر اخبار کو مکمل کرنا نہیں بلکہ خبروں کے معاملے میں اخباروں کا ایک دوسرے سے مقابلہ بازی کرنا بھی ضروری ہے تاکہ مدِ مقابل یا حریف بازی نہ لے جائے۔نیز ان کا کہنا تھا کہ اخبار نویسی کو ایک مقدس فرض اور مشن مان کر اخبار نویس کو کرپشن، بددیانتی، ناانصافی اور عدم مساوات کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔

اختر صاحب صرف اس کی تلقین ہی نہیں کرتے بلکہ زندگی بھر کرپشن اور بددیانتی کے خلاف آواز بلند کرتے رہے۔سبارڈی نیٹ سروسز سیلیکشن بورڈ کے چیئرمین کی حیثیت سے انہوں نے اپنے محکمے کو حتیٰ الوسع کرپشن سے پاک صاف رکھنے کی کوشش کی۔یہاں تک کہ کسی وزیر یا بڑے شخص کی سفارش یا دباؤ کی بھی پروا نہیں کی۔کہا جاتا ہے کہ پنجاب کا ایک وزیر اپنے کسی رشتہ دار کی دو نالائق لڑکیوں کو سروس میں مستقل کروانا چاہتا تھا مگر انہوں نے انکار کردیا۔اُن کے بورڈ کے ایک رکن نے انہیں دو ہزار روپے کے نوٹ پیش کرکے چھ امیدواروں کی سفارش کی۔مگر انہوں نے رشوت قبول کرنے کے بجائے اُن امیدواروں کو نااہل قرار دینے کے ساتھ ہی وزیر اعلیٰ پنجاب سے شکایت کردی۔پھر محکمے کے اراکین اور عملے کی بدعنوانیوں سے تنگ کر ایک دن اچانک ایک پریس کانفرنس کرکے وزراء اور سیاسی رہنماؤں کے سفارشی خطوط کی نمائش کرکے سب کو بے نقاب کردیا اور گورنر سے درخواست کی کہ وہ بورڈ ہذا کو توڑ دیں۔اسی طرح آل انڈیا پوسٹ مین یونین کے سیکرٹری کو بھی اکاؤنٹس میں بد دیانتی کے الزام میں انہوں نے یونین سے نکال دیا تھا۔

صحافتی میدان میں اختر صاحب کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی طویل صحافتی زندگی کے دوران صرف اخبار کے دفتر میں بیٹھ کر ہی کام نہیں کیا بلکہ وہ جنگ کے محاذوں پر بھی رپورٹنگ کرنے گئے۔۱۹۴۷ء اور ۱۹۶۵ء میں انہوں نے کشمیر اور پنجاب کے جنگی محاذوں کا دورہ کیا اور اخبارات کو ان سے متعلق خبریں فراہم کرتے رہے۔۱۹۵۴ء میں وہ دوستانہ کمیشن کے رکن کی حیثیت سے سوویت روس کے دورے پر گئے۔۱۹۸۰ء میں جب وہ امریکہ کے دورے پر گئے تو ورجینیا اور واشنگٹن کے میئروں نے ان کی عزت افزائی کی۔۱۹۷۷ء میں ان کی گراں قدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں آل انڈیا اُردو ایڈیٹرس کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا۔۱۹۹۰ء میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں پریس کلب کراچی نے استقبالیہ دے کر ان کی پذیرائی کی تھی اور ۱۹۸۶ء سے وہ وینکوور (کینیڈا) کے انڈو کینیڈین ٹائمز کی نمائندگی کرتے رہے۔وہ ۱۹۴۹ء سے ابھی چند سال پہلے تک آل انڈیا نیوز پیپرز ایڈیٹرس کانفرنس کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے مسلسل خدمات انجام دیتے رہے۔

صحافت کے علاوہ اختر صاحب میدانِ ادب میں بھی برسوں سرگرمِ عمل رہے۔انہوں نے لگ بھگ تین درجن ناول تخلیق کئے ہیں جن میں آگ، جلن، وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ان ناولوں میں سے بعض ہندی، گجراتی، تلگو اور تمل میں بھی ترجمہ ہوکر ان زبانوں کے قارئین سے دادِ تحسین حاصل کرچکے ہیں۔ان ناولوں میں سماج کی ٹھکرائی ہوئی بے بس، مظلوم

اور لاچار عورتوں، سماجی ناانصافی اور عدمِ مساوات، فرقہ وارانہ فسادات اور ملک میں پنپ رہی بدعنوانی اور کرپشن کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے۔ ان ناولوں کے علاوہ انہوں نے نے متعدد افسانے بھی قلمبند کئے ہیں اور ''کانٹے'' کے نام سے ان کا ایک افسانوی مجموعہ بھی منظرِ عام پر آیا تھا۔ انگریزی میں ان کا ایک ناول Storms of Tears بھی شائع ہوا تھا اور پنجابی میں ''بچھی'' نام سے بھی ان کا ایک ناول شائع ہوا تھا۔ ان کے علاوہ سیاسیات پر بھی ان کی تین کتابیں اشاعت پذیر ہو کر دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

فکشن کے علاوہ اختر صاحب نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی مگر اُن کا کوئی شعری مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا اور ان کی زیادہ تر شاعری اخباری ضرورت کے تحت معرضِ وجود میں آئی تھی۔ غالباً انہوں نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا اور ان کی صحافتی انداز کی یہ شاعری ان کے ذریعہ معاش کے زیرِ اثر ہی تخلیق ہوتی رہی۔ خود انہوں نے بھی اپنی شاعری پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُن کی شاعری برآمد کی بات نہیں بلکہ حالات کی مجبوری اور ضرورت ایجاد کی ماں والا معاملہ ہے۔ وہ روزانہ ''تیج'' دہلی کے لئے ''ماڈرن غزل'' کے عنوان سے ایک مدت تک شعر گوئی کرتے رہے۔ اگر اُن تمام نظموں اور غزلوں کو یکجا کیا جاتا تو ایک اچھا خاصا دیوان وجود میں آجاتا۔ مگر اب اس طرح کی کوئی امید باقی نہیں رہی کیونکہ ایک تو اختر صاحب نے اس بارے میں سنجیدگی سے کبھی سوچا نہیں تھا اور نہ اس خیال سے کبھی اپنے کلام کو محفوظ کیا ہے اور جو تھوڑا بہت کلام ایک چھوٹی سی بیاض کی صورت میں اُن کے پاس موجود تھا، وہ بھی اُن کا کوئی پرستار اور قدر دان اُن کی ڈرائنگ روم نما لائبریری سے دورانِ ملاقات اُڑا کر لے گیا تھا۔ اور اس طرح ان کا یہ بچا کھچا شعری سرمایہ بھی تلف ہو کر رہ گیا۔ تاہم اُن کا کچھ کلام ملاحظہ ہو:

طوفانِ حوادث سے گزرنا سیکھو
موجوں کے تھپیڑوں سے اُبھرنا سیکھو
اس دور کی آواز یہی کہتی ہے
جینے کی تمنا ہے تو مرنا سیکھو

اے کاش شبِ غم کا سویرا آئے
اس سمت بھی امید کا جھونکا آئے
بیمار کو تسکین سی آ جائے گی
قاتل ہی کے پردے میں مسیحا آئے

ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

موجِ غم اب ہم تو ہارے
دیکھیں تو کس گھاٹ اُتارے
ہم نے کیا منزل کی سوچی
مدھم پڑ گئے چاند ستارے
ایوانوں میں جشنِ چراغاں
میرے گھر میں گھور اندھیارے
ایک تمہیں ہو سنگدل ورنہ
روئے اکثر چاند ستارے

چونکہ اکثر کلام سیاسی پس منظر میں لکھا گیا ہے اس لئے ان میں بھرپور طنز و مزاح پایا جاتا ہے۔ جیسے:

بیٹے کو کیا پتا تھا نکل آئے گا اِدھر
دیکھا جب اُس نے باپ کو شرما کے پی گیا
محفل میں کہہ دیا کہ مَیں ہوں پرہیزگار
قربان اس ادا پہ گھر آ کے پی گیا

خدا شیطان سے اِک روز یہ رو رو کے کہتا تھا
کہ مَیں ہی جانتا ہوں کیا مصیبت ہے خدا ہونا

آسماں پر جب کبھی کالی گھٹا چھا جائے ہے
لومڑی کو اپنے لومڑ کا خیال آجائے ہے
منتری بننے کے جھانسے میں تو مَیں آتا نہیں
جا کسی لیڈر کے گھر میں کیوں میرا سر کھائے ہے
بھوک ہڑتالی بنا کر ہم کو وہ نیتا بنے
بھوک سے تڑپا کئے ہم اور وہ پھل کھائے ہے
وہ سمگلر ہے مگر پکڑا نہ جائے گا کبھی
شہر کا ڈپٹی کمشنر اس کے ہاں روز آئے ہے
جاں چھڑانے کے لئے کشکول میں کچھ ڈال دو
وہ تو ہے پاپی پرانا بِن لئے کب جائے ہے
غیر کے پہلو میں بیٹھا ہم سے وہ شرمائے ہے
''ہم اُسے دیکھا کریں کب ہم سے دیکھا جائے ہے''
یہ کسی دھنوان کی ارتھی ہے اختر اس لئے
ہر کوئی بڑھ بڑھ کے اس پر پھول یوں برسائے ہے
دھرم رکشک کی اُپادھی اب تو مل جائے حضور!
بھینس مَیں نے بیچ کر اب باندھ لی اِک گائے ہے

اختر صاحب نے بے بس اور مظلوم عورتوں کی ہمدردی و حمایت میں

صرف قلم ہی نہیں اُٹھایا بلکہ عملی طور پر بھی ان کی مدد کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ انہوں نے سماجی بہبود کے میدان میں بھی وہ قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ حصولِ آزادی کے بعد جب ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکی تو انہوں نے دہلی میں قیامِ امن کے لئے شہر کے مختلف حصوں میں جلسے منعقد کرائے۔ علاوہ ازیں انہوں نے دہلی سے اغوا کی گئی لڑکیوں کی بازیابی کے علاوہ پاکستان میں لائلپور (حال فیصل آباد) لاہور، شیخوپورہ، شورکوٹ اور جھنگ وغیرہ کی مغویہ لڑکیوں کی بازیابی اور انہیں ہندوستان پہنچانے میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ انہوں نے مغویہ لڑکیوں کو برآمد کرنے اور بدعنوانی اور کرپشن کے خلاف ایک مہم چلانے کے واسطے ایک ''اینٹی کرپشن کمیٹی'' بھی قائم کی تھی جس میں مولانا امداد صابری، پھمن سنگھ گل (جو بعد ازاں پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہے) اور چودھری بنسی لال وغیرہ شامل تھے۔ اور جسے مولانا سعید احمد اور مولانا حفظ الرحمٰن کی سرپرستی وحمایت حاصل تھی۔ مذکورہ بورڈ کے اراکین نے دہلی میں عصمت فروشی کے اڈوں سے بھی تقریباً دو ہزار ارا عورتوں کو رہا کرایا اور اس کارِ خیر میں اختر صاحب نے بھی ایک نمایاں رول ادا کیا تھا۔ انہوں نے کئی مغویہ لڑکیوں کو برآمد کرنے کے بعد انہیں آباد بھی کرایا اور کئیوں کی شادیاں بھی کرائیں۔

اختر صاحب کے بارے میں شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ صحافی، ادیب، شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ممتاز و سرگرم ٹریڈ یونینسٹ بھی تھے اور وہ متعدد ٹریڈ یونینوں سے وابستہ رہے ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں انہوں نے لاہور میں مشہور صحافی رانا جنگ بہادر کے ساتھ مل کر ورکنگ جرنلسٹس یونین قائم کی تھی۔ بعد ازاں جب وہ دہلی آئے تو انہوں نے ٹائمز آف انڈیا کے شری شام لال کے اشتراک وتعاون سے صحافیوں کی ایک یونین قائم کی تھی۔ اس کے علاوہ وہ آل انڈیا پوسٹ مین یونین کے جنرل سیکرٹری اور کنفیڈریشن آف فیڈریشنز آف گورنمنٹ ایمپلائیز کی نیشنل کونسل کے رکن بھی رہے اور انہیں محکمہ ڈاک وتار نے یونیفارم کمیٹی کا غیر سرکاری رکن بھی نامزد کیا تھا۔ ان حیثیتوں سے انہوں نے ملک کے طول وعرض کا دورہ بھی کیا اور کئی ہڑتالیں بھی منظم کرائی تھیں۔

۱۹۶۸ء میں انہوں نے ٹریڈ یونین سرگرمیوں کو خیرباد کہہ دیا کیونکہ گورنر پنجاب نے انہیں سبارڈی نیٹ سروسز سیلیکشن بورڈ کا چیئرمین نامزد کر دیا جو ریاستی سرکار کے سیکرٹری کے عہدے کے برابر تھا۔ اس عہدے پر جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے انہوں نے صرف آٹھ ماہ تک کام کیا اور پھر ایک پریس کانفرنس میں بورڈ کے ایک رکن پر بدعنوانی کے الزامات لگا کر گورنر پنجاب سے بورڈ ہذا کو توڑنے کی سفارش کر دی تھی۔

اختر صاحب ان ہستیوں میں سے تھے جو صدق دلی سے ہندو پاک میں دوستی۔ بھائی چارے اور ہم آہنگی میں اعتقاد رکھتے تھے اور اس کے لئے انہوں نے صرف قلمی جہاد ہی نہیں کیا بلکہ اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے بھی سرگرم و کوشاں رہے تھے۔ اسی مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی غرض سے انہوں نے پاکستان کے مشہور شاعر مرحوم رئیس امروہوی کے ساتھ مل کر انڈو پاک پریم سبھا کی بنیاد بھی رکھی تھی جو ایک عرصہ تک سرگرم عمل رہی۔

یہی نہیں اختر صاحب کو قدیم تاریخ کی تحقیق میں بھی بے حد دلچسپی تھی۔ اور اس سے متعلق ان کی لائبریری میں لاتعداد کتابیں موجود تھیں جن کی مالیت کا اندازہ لگ بھگ تین چار لاکھ روپے تھا۔ وفات سے چند سال پیشتر صحت کی خرابی اور بیماری کی وجہ سے انہوں نے یہ کتابیں لاجپت بھون کی لائبریری کو بطور عطیہ دے دی تھیں تاکہ مستقبل کے محققین اس سے استفادہ کر سکیں۔ قدیم تاریخ خصوصاً مصر، عراق اور افغانستان کی تاریخ کی تحقیق وجستجو میں انہوں نے قابلِ قدر کام انجام دیا تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے برمنگھم یونیورسٹی، لندن یونیورسٹی، برطانوی میوزیم، مشرقی جرمنی کے عجائب گھر، فرانس کے ٹوڈرے میوزیم، امریکن لائبریری آف کانگریس اور قاہرہ میں تحقیق ومطالعہ کیا تھا۔ ان اداروں کے علاوہ انہوں نے بغداد اور انقرہ کے عجائب گھروں سے چار ہزار سال پرانی دستاویزات کی فوٹو کاپیاں بھی حاصل کی تھیں۔

اختر صاحب کی ادبی علمی، صحافتی اور سماجی خدمات کے لئے متعدد انجمنیں ادارے اور ریاستی حکومتیں انہیں اعزازات وانعامات عطا کر چکی ہیں۔ دہلی اُردو اکادمی اور حکومتِ پنجاب کے بھاشا وبھاگ نے انہیں ایوارڈ عطا کئے تھے۔ اس کے علاوہ موخر الذکر ادارے نے ایک خصوصی تقریب کا انعقاد کر کے ان کی پذیرائی بھی کی تھی۔ میرا کادمی لکھنؤ اور ماتری شری کمیٹی نے بھی ان کی ادبی اور صحافتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں اعزازات سے نوازا تھا۔ نیز برطانیہ کی انجمن ترقی اُردو برمنگھم نے بھی ایک تقریب میں انہیں اعزاز سے نواز کر ان کی پذیرائی کی تھی۔

اختر صاحب نوے اکیانوے سال کی عمر تک نوجوانوں کی طرح ادبی، تاریخی اور صحافتی سرگرمیوں میں سرگرم عمل رہے۔ وہ اُردو ہندی پنجابی اور انگریزی کے کئی اخبارات کے لئے کالم نویسی کرتے رہے اور ریڈیو اور دوردرشن کے لئے بھی اپنی خدمات فراہم کرتے رہے لیکن گزشتہ ڈیڑھ سال سے ان کی صحت کچھ جواب دے گئی تھی اور ان کی سرگرمیاں موقوف سی ہو کر رہ گئی تھیں۔ بوڑھاپے کی وجہ سے ان کی یادداشت بھی کچھ کمزور ہو گئی تھی۔ تاہم اگر کوئی ملاقاتی یا انٹرویو لینے والا آجاتا تو وہ ماضی کے تاریخی، سیاسی ادبی اور صحافتی واقعات کو بڑے تسلسل سے بیان کرتے تھے۔ اور آج ان کے اُٹھ جانے سے ہم ایک ایسی قد آور شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں جو ایک ممتاز صحافی اور ادیب ہونے کے علاوہ ایک نامور سماجی کارکن اور ٹریڈ یونینسٹ بھی تھے۔

☆

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

نازش فردوس

(راولپنڈی)

برادرِ عزیز گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

میں گزشتہ چار ہفتوں سے مسلسل سفر میں ہوں۔ بحرین میں یوم سر سید کے موقع پر بین الاقوامی مشاعرے کی صدارت، دبئی میں پاکستان ایسوسی ایشن کی ادبی تقریب میں اعزاز اور ابوظہبی میں مشاعروں کی صدارتوں کے چکر۔ یہاں میرا بیٹا عرفان انجینئر ہے اس لیے ابھی وسط جنوری ۲۰۱۰ء تک انشاء اللہ قیام ابوظہبی میں ہی رہے گا۔ پرویز میاں نے برمنگھم سے ای۔میل سے ''چہارسُو'' روانہ کیا ہے۔ میں کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ وغیرہ کے طلسماتی استعمال سے ناواقف ہوں، اصل مزا تو مطبوعہ رسالے کو پڑھنے پر آئے گا، فی الحال انٹرنیٹ پر دستیاب ''چہارسُو'' کے جستہ جستہ دیدار سے جو مسرت ہوئی اس کے لیے صمیم قلب سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خداوند قدوس اس بے لوث خدمت کے صلے سے نوازے اور آپ کو اپنے مقاصد میں کامیاب فرمائے۔ آمین۔ ''چہارسُو'' کے قرطاس اعزاز کے تحت ساٹھ صفحات میں آپ نے مجھ ہیچمدان کی حقیر شخصیت اور معمولی ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ انتہائی ذہانت اور مدبرانہ مہارت کے ساتھ کیا ہے اور کئی سو صفحات پر پھیلے ہوئے مواد کو بطور عطر مجموعہ، محدود ضخامت میں سمیٹ لیا ہے۔ ہر چند کہ بہت سے اچھے مضامین اشاعت سے رہ گئے لیکن صبا تسنیم کے مرتبہ سوانحی خاکے، فضیل مظفر کی مرتب کردہ متعدد ناقدین کی آراء اور آپ کے ساتھ میرے انٹرویو میں تقریباً تمام ضروری معلومات قارئین تک پہنچ رہی ہیں پھر بھی اگر ایک صفحے پر میری کتابوں کی فہرست شامل اشاعت ہوتی تو بہتر تھا۔ ایک اور صفحہ میری رباعیوں کے لیے بھی نکالا جا سکتا تھا۔ سید امین اشرف کے ساتھ ''پروفیسر'' کا اضافہ درست نہیں، وہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے بحیثیت ریڈر سبکدوش ہوئے تھے۔ ہمدان نعمانی بھی اصلاً ہمدم نعمانی ہیں۔ بایں ہمہ یہ کاوش بہت پرکشش اور کامیاب ہے۔ آپ کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

مظفر حنفی (ابوظہبی)

مکرمی گلزار جاوید صاحب: آداب۔

چہارسو کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ۔ قرطاس اعزاز مظفر حنفی صاحب کو؟ اور اب، یعنی ۲۰۰۹ء کے آخر میں؟ ارے بھائی، اپنی پلاننگ کا قبلہ کچھ تو صحیح کرو۔ مظفر حنفی صاحب کو یہ اعزاز ہم سب سے پہلے یعنی آج سے دس برس پہلے جب یہ اعزازات کا سلسلہ شروع ہوا تھا، دیا جانا چاہیے تھا۔ خیر، وہی فرسودہ محاورہ یعنی 'دیر آید، درست آید' کہہ کر آپ کی سب لغزشیں معاف کیے دیتا ہوں۔ مظفر حنفی (جو کسی زمانے میں اپنے نام کے ساتھ اپنے آبائی شہر کا لاحقہ 'ہنسوی' لکھ کر اردو کی اس روایت کو قائم رکھتے تھے جس کے مطابق آج تک ایران میں علامہ اقبال کو 'اقبال لاہوری' لکھا جاتا ہے) عمر میں مجھ سے پانچ برس چھوٹے ہیں۔ ہم دونوں نے افسانہ نویسی کے سفر کا آغاز شاید ایک ساتھ ہی کیا۔ میرا پہلا افسانوی مجموعہ ''جینے کے لیے'' 1953ء میں شائع ہوا، جب کہ مظفر صاحب کا پہلا افسانہ اسی برس چھپا۔ ہم دونوں نے اس وقت کے ادبی اور نیم ادبی (سیاسی یا فلمی) رسائل میں ایک ساتھ لکھا۔ میری آمدنی کا ذریعہ صرف قلم گھسائی ہی تھا اس لیے میں اردو سے ہندی کی طرف مائل ہوا جہاں افسانوں کی اجرت اردو سے زیادہ ملتی تھی۔ اور پھر انگریزی کی درس و تدریس کے سلسلے میں دساور کی جامعات میں پڑھانے کا ایک لامتناہی سلسلہ ایسا شروع ہوا جس کی وجہ سے میری اپنی یونیورسٹی میں میرا نام ہی ''ایرپورٹ پروفیسر'' پڑ گیا، اور اس نسبت سے میرا تعلق اردو سے کم ہوتا گیا، جبکہ ان برسوں میں مظفر صاحب ایک باوفا، باصفا اور سچے عاشق کی طرح اردو (جسے ان کے سیاق و سباق میں مادرِ اردو بھی کہا جا سکتا ہے) کے آنچل کو مضبوطی سے پکڑے رہے۔ انہوں نے خوب لکھا، جی بھر کر لکھا، اچھا لکھا اور نظم و نثر دونوں میں کسی سیاسی جماعت کی پیروی کیے بغیر اپنا سکہ چلایا، کام کیا اور نام کمایا۔ یہ اردو کی کم ظرفی رہی ہے کہ سکۂ وقت پر انہی کا نقشِ رخ ثبت ہوتا ہے، جو وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہتے ہیں، یعنی اگر ترقی پسند تحریک کا دور دورہ ہو تو پرکاش پنڈت جیسے معمولی افسانہ نگار کو اردو کا چیخوف کہا جا سکتا ہے اور اگر جدیدیت کا دور دورہ ہو تو بلراج مینرا اور کمار پاشی بھی صف اوّل کے اہل قلم قرار پاتے ہیں۔ اور اگر حاکم وقت یا اردو کے بہی کھاتوں یعنی اکادمیوں کے محرر و منشی کے مرغوب رفقا میں گنے جاتے ہیں تو اردو میں صرف اور صرف ایک ناول کے مصنف (جنہیں یہ کمال حاصل ہے کہ مصنف اور ناول کا نام ایک ہی ہے) بھی اردو کا چوٹی کا ایوارڈ لے جاتے ہیں جبکہ مظفر حنفی (یا راقم الحروف) جیسے قلمکار اس زمرے میں بھی شمار نہیں کیے جا سکتے۔ آپ نے محنت اور جانفشانی سے مظفر صاحب کے بارے میں نئے اور پرانے مضامین یکجا کیے ہیں جو ان کی شاعری کی مختلف جہات کو پیش کرتے ہیں، ان کی موضوعاتی اور اسلوبیاتی خوبیاں بمعہ مثالوں کے ہمارے سامنے رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ صبا تسنیم کا تحریر کردہ سوانحی خاکہ ایک جامع مضمون ہے جس سے فاضل شاعر کے بارے میں سب معلومات مل سکتی ہیں اور جو جدید اردو شاعری کے طلبہ کے لیے مشعل راہ کا کام دے سکتا ہے۔ ''براہ راست'' میں آپ نے براہ راست سوالات تو کیے ہی ہیں (اور یہ ضروری بھی تھے) لیکن جو سوالات صنفِ غزل میں روایت اور روایت

سے قدرے انحراف کے باوجود اس سے 'وفاداری'...." بشرط نا استواری"....سے متعلق تیکھے بھی ہو سکتے تھے، آپ نے ان نا گفتنی سوالوں کی فہرست میں صرف ایک سوال کو رکھا ہے جو' غزل کی کمائی' کے بارے میں ہے۔مظفر صاحب کا جواب گھوم پھر کر الیکز انڈر پوپ کے ارشاد پر ہی آ گیا ہے۔

What oft was said but never so well expressed. میرے خیال میں مظفر صاحب اس سلسلے میں اپنی نظموں کا حوالہ بھی دے سکتے تھے جنہیں کمال شائستگی سے صفوت صاحب نے مرتب کیا ہے۔ان نظموں میں نہ صرف صنف غزل کے پیش پا افتادہ موضوعات اور مضامین سے اجتناب ہے بلکہ اسلوبیاتی سطح پر غزل کی cliche-ridden parlanace سے بھی مراجعت ہے۔مجھے یہ نظمیں پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ تین چار دہائیوں سے مغربی جامعات میں پڑھاتے پڑھاتے اور تقابلی ادب کی Curriculum planning اور ourse Designing مرتب کرتے کرتے میں جب دیکھتا ہوں کہ جاپان کی ہائیکو صنف شعر میں سہ سطری mini poems میں بین المتونیت کے حوالے سے خال خال پیش پا افتادہ مضامین اور استعارے در آتے ہیں، وہاں اردو کی صنف غزل میں اگر نناوے فیصد نہیں تو نوے فیصد سے کچھ اوپر ہی یہ چلن ہے۔اس بات سے مظفر بھائی صاحب کو بھی اختلاف نہیں ہوگا کیونکہ وہ آپ کے ساتھ اپنے مکالمے میں یہ بات کہہ چکے ہیں: "میرا نظریہ ہے کہ غزل کا عمدہ وہ شعر ہوتا ہے جس میں کوئی نیا خیال باندھا گیا ہو یا پھر کسی نفیس پرانے مضمون کو نئے انداز میں پیش کیا گیا ہو۔اردو میں غزل چار سو برسوں سے کہی جا رہی ہے اس لیے اب مضمون تازہ اور اسلوب نو کا حصول میرے خیال میں اسی وقت ممکن ہے جب شاعر نادر قافیوں اور انوکھی ردیفوں کے تال میل سے نئی نئی زمینیں تلاش کرے۔۔۔" بات صحیح ہے، لیکن اس سے ایک گستاخانہ سوال جو میرے ذہن میں اٹھتا ہے وہ شاعری یا تخلیقی قوت کی کارکردگی کے بنیادی اصول کے بارے میں ہے۔یعنی کیا ہم اس جواب سے یہ فرض کر لیں کہ غزلیہ شاعری کی تعریف epiphany نہیں ہے، الہام نہیں ہے، پکے ہوئے پھل کا گرنا نہیں ہے، یعنی وہ کیفیت نہیں ہے، جسے امرتا پریتم نے اپنی پنجابی نظم میں یوں کہا تھا "بچہ تے کوتا پیدا ہوندے جنم پیڑتوں بعد" بلکہ caesarean کا وہ جراحی عمل ہے جس میں حاملہ عورت کا بچہ پیٹ چاک کر کے نکالا جاتا ہے۔معافی چاہتا ہوں، میں بھی کن فضول باتوں میں الجھ گیا۔مجھے یہ بات کہنے میں کوئی عار نہیں کہ مظفر صاحب کے بیشتر غزلیہ اشعار بھی ایک 'منی پوئم' کی طرح اپنی شناخت قائم کرتے ہیں ۔اس بات کے لیے وہ بدھائی کے پاتر ہیں۔۔۔دیر نوشت: خط لکھ چکا تھا کہ عزیزی پرویز مظفر کی وساطت سے مظفر حنفی صاحب کے شعری مجموعہ کا ایک پیکٹ مجھ تک پہنچ گیا۔اب دسمبر کی طویل راتوں میں یہ کتابیں میری رفیق ہوں گی اور انشا اللہ میں ان کی شاعری پر ایک سیر حاصل مضمون لکھوں گا۔

ستیہ پال آنند (یو۔ایس۔اے)

بھائی گلزار جاوید صاحب' السلام علیکم۔

گذشتہ ہفتے "چہار سو" کا تازہ شمارہ موصول ہو گیا جس کے لیے ممنون ہوں۔قرطاسِ اعزاز کا قرعہ فعال اس بار ڈاکٹر مظفر حنفی کے نام نکلا اور بہت خوب نکلا "حق بحق حقدار رسید" کے مصداق انکا فن انکی شخصیت اور ان کے کارہائے نمایاں کو "چہار سو" نے جس طرح تحقیق و جستجو کے بعد اپنے گراں قدر صفحات میں سجایا ہے وہ یقیناً آپ ہی کا حصہ ہے یہ کام آپ برسوں سے کئے جا رہے ہیں اور جس تسلسل کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہیں وہ کسی صلے کی تمنا کیے بغیر کر رہے ہیں لیکن اس کی بازگشت وطن سے زیادہ اردو کی نئی بستیوں میں سنائی دے رہی ہے جسے میں بھی سن رہا ہوں۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے وسائل کو مزید وسعت اور آپ کے قلم کو نئی توانائیاں عطا فرمائے، آمین! مظفر حنفی صاحب کی شعری اور نثری تخلیقات میں اُن کا ذات اور کائنات کا نظریہ کھل کر سامنے آیا ہے جسے میں نے قریب سے محسوس کیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ ایک دل گداز بھی اپنے سینے میں رکھتے ہیں یہ میں نے "دل کے آئینے میں ہے....." پڑھ کر محسوس کیا۔ایک عرصے کے بعد کلاسیکل افسانے کا لطف آیا جو مرحلہ وار قاری کے دل میں اترتا جا رہا تھا۔اس افسانے پر مظفر حنفی صاحب کو میری پرخلوص مبارکباد پیش ہے اگرچہ یہ انکا بہت ہی پہلے کا لکھا ہوا افسانہ ہوگا۔ بھارت میں بین المذہبی شادیوں (INTERCASTE MARRIAGES) بالخصوص ہندو مسلم گٹھ بندھن کو جو رواج تشکیل پا رہا ہے اُس کا پس منظر لئے یٰسین احمد کا افسانہ "سمتوں کا تعین" ایک نئی سوچ کا مظہر' بہت ہی خوبصورت افسانہ ہے۔لادینی اور غیر مذہبی افکار کو نہ پہلے کبھی عالم ہست و بود میں پناہ ملی اور نہ ہی آج یا آئندہ کبھی ملے گی آدمی کے سکون کا آخری سہارا مذہب اور صرف مذہب کی سچائی ہی ہوتا ہے۔مصنف کو یہ افسانہ مبارک ہو۔گلزار جاوید کا افسانہ "کہانی عنوان چاہتی ہے" سچ پوچھیئے تو میرے سر سے گذر گیا جس میں قصور وار شاید میری اپنی کم علمی ہے۔معذرت! اب آیئے' جناب ایس۔ایم۔معین قریشی کے گراں قدر مراسلے کی جناب! انہوں نے میرے لکھے ہوئے ایک مصرع کے سہو کی جانب اشارہ کیا ہے۔عمر کے جس مرحلے میں میں ہوں ہوسکتا ہے یادداشت دھوکا دے گئی ہو اور میں نے "تجھ پر" کی جگہ بروزن لفظ "صدہا" لکھ دیا ہو۔اُن کی نشاندہی پر اُن کا شکریہ! لیکن یہ کوئی باقاعدہ غزل کا شعر نہیں بلکہ اُن کا فی البدیہہ شعر ہے جو عام بول چال میں بطور محاورہ وہ استعمال کیا کرتے تھے۔پھر موصوف نے مولانا آزاد کو اس شعر کا خالق کہا ہے اُن کی معلومات کے لیے عرض ہے کہ نہ تو "آب حیات" مولانا آزاد کی لکھی ہوئی تصنیف ہے اور نہ ہی مولانا آزاد کا یہ شعر ہے (یہاں مولانا آزاد کے ذکر سے قاری کا ذہن مولانا ابوالکلام آزاد کی جانب جاتا ہے) جبکہ متذکرہ تصنیف اور مذکورہ شعر کے خالق محمد حسین آزاد تھے۔ہاں مجھے سینئر اور

معتبر شاعر کہنے پر بھی ان کا ''ممنون'' ہوں شاید ان کے پاس لفظ سینئر جیسے انگریزی لفظ کا ہم معنی اردو لفظ ہی نہ تھا پھر ''معتبر'' محترم نے اُس شاعر کے لیے استعمال کیا جس نے اپنی عمر کے نصف صدی شاعر ہی کے گیسو سنوارنے میں صرف کی جو تین شعری مجموعوں کا خالق ہی نہیں بلکہ پوری اردو دنیا میں اپنی شاعری کی بدولت صفِ اول کے شعراء میں اپنا منفرد مقام رکھتا ہے۔ ہاں یاد آیا۔ انہوں نے شعر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے..... جب کوئی ''عالی مضمون'' بھائی صاحب! لفظ ''عالی مضمون'' نہیں ''اعلیٰ مضمون'' لکھا جاتا ہے۔

غالب عرفان (کراچی)

میرے بھائی گلزار، خوش رہو۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ جو میرے عزیز دوست مظفر حنفی صاحب سے منسوب ہے میں نے بے پناہ خوشی دل میں سمیٹ کر اپنے لیپ ٹاپ پر سرِ ورق سے لے کر پس ورق تک دل میں اتار لیا ہے۔ یقین مانیے مجھ پر وجد کا سا عالم طاری ہے۔ آج سے کچھ سال قبل اس جدت طرازی کا تصور بھی محال تھا۔ آپ نے دورِ حاضر کی ترقی کا خوب خوب استعمال کیا ہے جس کے لیے میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ مظفر بھائی کی کس کس تخلیق اور کس کس وصف کو تحریر کروں ان کا تحریر کردہ ہر لفظ اپنے اندر معنیٰ آفرینی لیے ہوئے ہے۔ طویل نظم عکس ریز کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

یہ مسلماں ہیں، یہ ہندو ہیں ، یہ سکھ
ان کو انسان کے خانے میں نہ لکھ

کس سادگی سے حنفی صاحب نے اپنے دل کا درد بیان کیا ہے۔

شاید یہ صفحہ حنفی صاحب کے اوصاف کو بیان کرنے کے لیے ناکافی ہو مگر ان پر تحریر کیے گئے تمام مضامین نے ان کی شخصیت و فن سے خوب انصاف کیا ہے بالخصوص براہِ راست نے تمام دریافت اور نادریافت کو اس طرح کوزے میں بند کیا ہے کہ مظفر صاحب کی شخصیت و فن اُجلے پانی پر تیرتی تصویر کی مانند نظر آنے لگے ہیں۔ حسبِ سابق شعری حصہ بھی بہت خوب ہے۔ محمود الحسن، پرت پال سنگھ، پنہاں، نثار ترابی اور شگفتہ نازلی کے چند اشعار اپنی معنیٰ آفرینی کے لحاظ سے انفرادیت لیے ہوئے ہیں۔ افسانے سبھی اپنی جگہ خوب ہیں مگر طوالت کے خوف سے فرداً فرداً سب پر تبصرہ نہیں کیا جا سکتا البتہ ''یہ داغ داغ اجالا یہ شب گذیدہ سحر'' انڈریو سولیون جسے ڈاکٹر فیروز عالم صاحب نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے مہذب انسانیت کے منہ پہ ایسا طمانچہ ہے جسکی شدت ایک باشعور انسان اپنے چہرے پر محسوس کر سکتا ہے۔

یوگیندر بہل تشنہ (کیلی فورنیا، امریکہ)

پیارے گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

آپ نے چہارسو کی عزت بخشی۔ آپ کی اعلیٰ مزاجی کے احساس سے راحت نصیب ہوئی۔ آپ کے عندیئے میں معیارِ ادب کی جو خوبیاں ہیں وہ آپ نے ہر رنگ رسالے میں مترشح کر دی ہیں۔ بہرصورت آپ نے ان کا جُز کُل ورق ورق مبارک بنیاد و خوش سوار کر دیا ہے۔ اس باب میں جو دارمدار کیا خوب کیا۔ ایک ایک سطر ایک ایک شعر متاعِ خوبی سے کم نہیں۔ آپ محنت سے گھبراتے نہیں میں نے ''چہارسو'' کے جملہ اسبابِ ذوق و نظر کچھ شاد کچھ آباد ہو کر دیکھے۔ مظفر حنفی کی اثراتِ شعر و نثر میرے دیکھے ہوئے ہیں ان کو چہارسو میں اس طور سے جلوہ گر پا کر از حد خوشی ہوئی۔ انھوں نے لکھنے لکھانے کے ساتھ ساتھ تکمیل شوقِ تعلیم میں اپنی سی کر دیکھی ہے۔ ''کہانی عنوان چاہتی ہے'' کی طرح ہر کہا سنا عنوان چاہتا ہے۔ خوش عنوانی سے کہی ہوئی بات اثر انگیز اور دل خوش کن ہوتی ہے۔ ماشاءاللہ چہارسو کا یکسو

آصف ثاقب (ایبٹ آباد)

بھائی گلزار جاوید، تسلیمات۔

میں دہرہ دون اور مسوری سے پرسوں شام واپس آ گیا تھا۔ گو وہاں سردی بہت تھی لیکن وقت اور ماحول بہت خوشگوار رہا۔ ''چہارسو'' کا مظفر حنفی نمبر ہمراہ لے گیا تھا فرصت غنیمت جانتے ہوئے سارے کا سارا پڑھ ڈالا۔ سب سے پہلے ''کہانی عنوان چاہتی ہے'' پڑھا اور بہت خوش وقت ہوا۔ ڈاکٹر مظفر حنفی سے یوں تو کئی بار مشاعروں اور سیمیناروں میں ملاقات ہو چکی ہے لیکن آپ نے جس طور اُن کی شخصیت و فن کے گوشوں کی وضاحت کی ہے وہ یقیناً بہت معلوماتی ہے۔ میری جانب سے مبارکباد قبول کیجیے۔

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ، بھارت)

عزیز من گلزار جاوید،

بہت بہت سلام، بہت سی دعائیں اور ان نیک تمنا کا اظہار جو میں، آپ ایسے طالبانِ دل مضطرب اور نگاہ شفیقانہ کے لیے رکھتا ہوں کہ اگر یہ زر ہے قاضی الحاجات تو ہم فقیروں کے پاس اس دولت کے سوا رکھا کیا ہے، سو چہارسو کی عنایت کے جواب میں یہی کچھ حاضر ہے، دل مضطرب بھی اور نگاہ شفیقانہ بھی؛ بیس روز لاہور میں پُر ہنگم مصروفیات کے ساتھ گزارنے کے بعد واپس کراچی پہنچا تو ڈاک کے اجتماع میں چہارسو کو بھی منتظر پایا، مشفقانہ تشکر پیش کیا، لیکن دل ہی دل میں کہ مدیر چہارسو بھی تو اس کے مکینوں میں سے ہے، پرچے کو دیکھا تو معلوم ہوا، تِل برابر بھی اپنی روایت سے نہیں ہٹا، یہی واضع داری، مدیر چہارسو کو تحقیق کا مستحق بناتی اور قارئین کو مجبور کرتی ہے کہ وہ کلمۂ تحسین کہے بغیر نہ رہ سکے۔ میری دعا ہے کہ آپ اس روایت کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھنے میں کامیاب ہو سکیں۔ اگرچہ مجھے تجربہ نہیں کہ دل مضطرب اور نگاہِ شفیقانہ اگر زرسالانہ ہو تو کوئی بھی پرچہ خواہ وہ ادبی ہو کہ غیر ادبی اپنی عمر دراز کر سکتا ہے، میں نے غیر ادبی کو محض جملہ سازی کے لیے استعمال کیا ہے ورنہ ادب کے سوا دیگر جرائد و رسائل کو جس

دل مضطرب اور نگاہِ شفیقانہ کی ضرورت ہوتی ہے اس کے ہیت و ماہیت کچھ اور ہوتی ہے وہ دل بھی اور ہوتے ہیں اور نگاہیں بھی دوسری ہوتی ہیں، وہ دل اسیر کمند ہوا ہوتے ہیں اور وہ نظریں ہولناک عنوان سے جانی پہچانی جاتی ہیں۔ زیرِ نظر شمارے میں صاحب گوشہ کی رنگین تصویر سے رس رابطے کی سنگین تحریر تک سب ہی ''سب اچھا ہے'' کا سماں باندھے ہوئے ہے، تاہم بڑھیا اور لذیز پلاؤ میں دانتوں تلے کنکر آ گیا اسی کا شکوہ ہے، کیونکہ بہرحال طبیعت تو مکدّر ہوئی نا! مثلاً دیکھیے، شروع میں دو نہایت حساس اصناف، حمد و نعت کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے گلزار جاوید تمام کا تمام صاحب قرطاس اعزاز کی نذر ہو گیا یعنی خود کو ''یک سو'' کر لیا اور چہار سو کی دیگر اطراف خصوصاً ذکورہ صفحہ کو بچوں کے حوالے کر دیا۔ حمد کا مطلع ہے ''چراغ حرم کے اجالے میں تو'' یقین نہیں آتا کہ یہ بیان پروفیسر مظفر حنفی صاحب کا ہے، قرآن اعلان کر رہا ہے ''اللہ نور السموات والارض'' اور اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، گویا ذرہ ذرہ اس کے نور کا محتاج اور اس کے اجالے میں سانس لے رہا ہے۔ حتیٰ کہ حرم پر اسی کا نور ضوافشاں ہے، نا کہ چراغ حرم کے اجالے میں جو اسی کا پرتو ہے، وہ نور ازل ہے؟ دوسری میری بیقراری کا سبب نعت میں رسول آخر و اعظم کا اسم گرامی کا بغیر درود کے استعمال ہے، یوں بھی پوری نعت رسول میں آپ ﷺ کے اسم کو خواہ وہ صیغۂ تخاطب میں ہو کر بیانیہ اس کے شایانِ شان استعمال نہیں کیا گیا، اگر انتخاب ہی دینا تھا تو یقیناً پروفیسر صاحب نے کچھ اور بھی نعتیں کہی ہوں گی۔ پوری نعت کا انداز یوں ہے جیسے کی عام چیز کے بارے میں اور اشتہاری انداز میں بات کہی جا رہی ہے۔ جو بات طبیعت پر گراں گذری بیان کر دی، چلتے چلتے کینیڈا والے ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ صاحب سے متعلق بھی عرض کرتا چلوں، میں بہت غور و فکر کے بعد یہ سمجھ نہ پایا کہ جناب شاعر کے ضمن میں ''نظم'' کا کیا تصور رکھتے ہیں، ردیف و قافیے کی حیثیت ان کے نزدیک کیا ہے، اگر لفظ کا آخری حرف ہی قافیہ ہے تو اعراب کو دفنا دو، زیر و زبر اور پیش کی ارتھی جلا دو، عمل کا قافیہ اگر فصل ہے تو بھائی تشنہ کا قافیہ کینیڈا باندھ لیجیے تا کہ قصہ تمام ہو جائے۔ جاٹ رے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ کے جواب میں تیلی رے تیلی تیرے سر پر کولھو کیا بُرا ہے۔ اب مرزا کو بھی یاد کر لیتے ہیں کہ ایسے موقع پر ہی تو یاد آتے ہیں۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ''تھا''

خیال آفاقی (کراچی)

گلزار بھائی، آداب۔

ایک بات بتلائیے جب آپ کسی شخصیت پر قرطاسِ اعزاز ترتیب دیتے ہیں تو ان کی بابت ہر چھوٹی بڑی بات کیسے جان لیتے ہیں۔ براہِ راست مجھے ہمیشہ دلچسپ اور معلوماتی لگتا ہے۔ پروفیسر مظفر حنفی کی شخصیت اور شاعری بے حد پسند آئی اور ان کا افسانہ اُس سے زیادہ پسند آیا۔ سلطانہ مہر کا افسانہ، سمتوں کا تعین بھی عمدہ افسانہ ہے انجم جاوید نے اپنے افسانے میں جذبات کی چاشنی گھول کر اسے دلچسپ بنا دیا ہے۔ مراق مرزا کا ''دادا میاں'' ایک دلچسپ اور عمدہ افسانہ ہے۔ ''کہانی عنوان چاہتی ہے'' میں گلزار جاوید کا ایک الگ رنگ نظر آیا اس سے پہلے میں نے ان کے جو افسانے پڑھے ہیں وہ مختلف انداز کے تھے۔ زیرِ نظر افسانہ پڑھ کر دیر تک سوچتی رہی کہ کہانی کار نے زور کس بات پر دیا ہے۔ بہرحال آپ کے افسانوں میں جو چیز سب سے الگ اور منفرد ہے وہ منظر نگاری اور کہانی کی تمام تر جزئیات کا بیان ہے مثال کے طور پر ''مشتاق نگاہیں''، ''جھورا نیاری والا'' اور نو کروالی کہانی میرے ذہن میں ابھی تک زندہ ہیں۔ شعری حصہ بھی اس بار خوب ہے مگر مجھے رس رابطے پڑھ کر بہت لطف آتا ہے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ ''چہارسو'' کو دھیرے دھیرے پڑھا جائے اور یہ میرے ساتھ گھر دفتر ہر جگہ رہے پتہ نہیں کب پڑھنے کا موقع مل جائے۔ On the whole, i always look forward to Chaharsu.

رینو بہل (چندی گڑھ، بھارت)

محترم گلزار جاوید صاحب، سلام احترام

تقی عابدی صاحب والے شمارے میں میری ایک غزل چھپی تھی جو اتفاقاً مظفر حنفی نمبر میں دوبارہ چھپ گئی ہے۔ اس غزل کا آخری شعر، جی ہاں میرا ہی شعر ہے مگر کسی اور غزل کا۔ یہ شعر میری جس غزل کا ہے وہ پہلے کہیں چھپ چکی ہے۔ میں نے نئی غزل جس فائل میں ٹائپ کر کے آپ کو ای میل کی تھی اس میں پرانی غزل کا آخری شعر غلطی سے لکھا رہ گیا تھا لہٰذا اسی طرح شائع ہو گیا۔ چہارسو کا انتظار ہے، فی الحال ای میل سے جو سرسری طور پر پڑھا اسے دیکھ کر جلدی میں یہ وضاحتی خط لکھ رہا ہوں تا کہ وقت پر آپ کو بھیج سکوں۔ پرچہ ملنے پر تفصیل سے پڑھوں گا۔ آپ پچھلے دنوں جس صدمے سے گزرے، اللہ آپ کو صبر دے۔ مٹی کے متوالے کی مبارکباد قبول کیجیے۔

فیصل عظیم (کینیڈا)

محترم گلزار جاوید صاحب، سلام و رحمت۔

ہر بار کی طرح اس بار بھی تازہ شمارہ بروقت موصول ہوا جس کے لیے بہت ممنون ہوں۔ اس بار قرطاس اعزاز ڈاکٹر مظفر حنفی صاحب سے منسوب ہے جو چہارسو کی روشن روایات کا تسلسل ہے۔ مضامین کے علاوہ ''براہ راست'' میں ڈاکٹر مظفر حنفی صاحب کی شخصیت کے بہت سے نہاں گوشے عیاں ہوئے ہیں۔ اور یہی انٹرویو نگار کا فن ہوا کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تخلیقات بھی خوب لطف دے رہی ہیں باقی مندرجات کی نسبت جلد ہی تفصیلی معروضات پیش کروں گا۔ بارِ دگر شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ آپ مجھے ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔

غفور شاہ قاسم (لاہور)

محترم گلزار جاوید صاحب' السلام علیکم۔

جس دن ''چہارسو'' آتا ہے یقین جانیے سارا دن سرور سا رہتا ہے اور اسی رات کو سارا رسالہ پڑھ لیا جاتا ہے۔ چہارسو کے کسی ایک شمارے کی بابت رائے تحریر کرنا دشوار عمل ہے کیونکہ ہر شمارہ اس قدر جامع اور بھرپور ہوا کرتا ہے کہ کسی ایک خط میں اس کے حسن و قبح پر گفتگو کی جائے تو وہ خط مضمون بن جائے گا۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے اپنا جانتے ہوئے چہارسو کے کچھ شمارے ارسال کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی آپ کے حکم کے مطابق چہارسو تمام احباب کو ارسال کر دیا گیا ہے پروفیسر وارث علوی صاحب نے فون پر پرچہ ملنے کی رسید بھی دی ہے۔ آپ شوق سے مجھے اسی طرح احباب کے حصہ کی کاپیاں بھیجا کیجیے میں آپ کے حکم کے مطابق موسومہ ادیبوں اور شاعروں کی خدمت میں پیش کر دیا کروں گا۔ ہم ادیب اور شاعر اچھی تخلیقات کے لیے چشم براہ ہوتے ہیں اگر دونوں طرف کی حکومتیں ادبی رسائل و کتب کی ترسیل پر سہولتیں دیں تو یہ علم و ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔ اندرون ملک کی حد تک ہماری حکومت نے شرح ڈاک بہت کم رکھی ہے جس سے ہم لوگ خوب استفادہ کر رہے ہیں۔ آج اخبار میں راولپنڈی میں دھماکوں اور ہلاکتوں کی خبر پڑھ کر دلی صدمہ پہنچا۔ اس طرح کے دھماکے دنیا کے کسی خطے میں بھی ہوں یہ انسانیت کے لیے انتہائی نقصان دہ اور دکھ کا باعث ہے۔

رؤف خیر (حیدرآباد دکن)

گلزار جی' تسلیمات۔

تازہ ''چہارسو'' دستیاب ہوا۔ طویل عرصہ کے بعد محترمہ اختر جمال کو افسانوی حصہ میں سرِ فہرست دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ہمارے دور کی اتنی بڑی تخلیق کار ایک عرصہ سے کینیڈا میں مقیم ہیں اور گوشہ نشینی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ اربابِ ادب بھی اُن کی موجودگی سے بے خبر نہیں۔ میری اُن سے اکثر بات چیت رہتی ہے۔ وہ عمر کی جس منزل پر ہیں اُس میں سفر مشکل ہوتا ہے جبکہ وہ علیل بھی رہتی ہیں۔ میں گذشتہ بارہ برس سے کینیڈا میں مقیم ہوں۔ ادبی تقاریب میں اکثر انڈیا اور پاکستان سے مہمان بلائے جاتے ہیں مگر اختر آپا کی جانب کسی کا دھیان نہیں جاتا۔ سنا ہے بہت عرصہ قبل ایک بار اُن کا ٹورنٹو آنا ہوا تھا اُس کے بعد مکمل خاموشی ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں سجاد نقوی صاحب نے اپنے خط میں شاید اپنی ہی کتاب ''کچھ دیر نیند سے پہلے'' کا ذکر کیا ہے جسے پڑھ کر میں چونک گئی ہوں۔ یہ بات یقیناً آپ کے علم میں ہوگی کہ 1985ء میں شائع ہونے والے میرے افسانوی مجموعے کا نام بھی ''کچھ دیر نیند سے پہلے'' تھا۔ سجاد نقوی صاحب جیسے سینئر اہلِ قلم کی اس امر سے بے خبری میرے لئے حیرت کے ساتھ افسوس کا باعث بھی ہے۔

شکیلہ رفیق (کینیڈا)

گلزار جاوید صاحب' سلام و رحمت۔

اس بار پروفیسر مظفر حنفی سے تفصیلی ملاقات کرانے پر آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ ہر ورق کی ہر سطر پر میں نے ان سے معانقہ کیا ہے۔ حضرت شاد عارفی کے کلیات کی تلاش میں کافی عرصہ سرگرداں رہا مگر کامیابی نہ ہو سکی اسی طرح حنفی صاحب کی کلیات بھی تلاش کر رہا ہوں۔ میری یہ سطور یقیناً حنفی صاحب کی نظر سے گذریں گی۔ اُن سے التماس ہے کہ وہ میری دیرینہ خواہش پوری کرنے کی کوئی سبیل نکالیں تو اس کا انہیں بہت ثواب ملے گا۔ ''چہارسو'' کے ورق اوّل سے ورق آخر تک کے انتخاب کی داد کے آپ مستحق ہیں پر اس دور ناسپاس میں جب کہ کچھ ادبی مدیران چیف مارشل لاء ایڈمنسٹرٹر (ادبی) بنے ہوئے ہیں، آپ عجز و انکسار سے ادب کی آبیاری میں مصروف ہیں ماشاء اللہ ۔۔۔ شعری حصے پر رائے دینا آسان کام نہیں ہے البتہ کہانیاں سبھی اپنی جگہ خوب ہیں ''کہانی عنوان چاہتی ہے'' جیسا ماحول اور رنگ میں نے سنیما ڈیوٹی کے دوران بارہا دیکھا ہے آپ کی کہانی نے جوانی کے کئی مناظر یاد کرا دیے ہیں۔ واہ واہ ۔۔ سبحان اللہ ۔۔ اللہ تعالیٰ آپ' ہم اور ہمارے ملک پر کرم فرمائے جو روز بروز دہشت و وحشت کی گرد میں لپٹا چلا جا رہا ہے۔

ضیاء شبنمی (ملتان)

مکرمی و محترمی گلزار جاوید صاحب' تسلیمات۔

''چہارسو'' کے تازہ شمارے نے خوب شاد کام کیا جس کے لیے آپ کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ جہاں پاکستان میں دوسری علاقائی زبانوں کے علاوہ پنجابی کے زیرِ اثر نظمیہ اور غزلیہ شاعری مقبولیت کی منزلیں طے کر رہی ہے وہیں ہندوستان میں (اردو ادب میں) نظم کو خصوصیت کے ساتھ نئی نظم کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی جو غزل کا خاصہ رہا ہے۔ ابھی تک نظم کی کچھ اقسام سے متعلق یہ بحث ختم ہونے میں نہیں آ رہی کہ یہ شاعری کے زمرے میں آتی بھی ہیں یا نہیں۔ میرے خیال میں اردو ادب کو عالمی ادب کے مقابلے میں ٹھہرنے کے لیے غزل کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی ترقی کی منزلیں طے کرنا ہوں گی۔ غالب نے تو بزبانِ شیر بہت عرصہ پہلے کہہ دیا تھا

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے

''چہارسو'' آپ جس باقاعدگی سے بھجوا رہے ہیں اُس کے لیے جس قدر بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ ہندوستان کی تازہ ترین نسل کی زبان میں کہا جائے تو ''چہارسو'' بہت ہی ''مست'' رسالہ ہے اور آپ بھی بہت ''مست'' آدمی ہیں اور اسی زبان میں کہوں تو ایک ''مست'' غزل چہارسو کے لیے ارسال کر رہا ہوں۔

پرتپال سنگھ (جموں' کشمیر)

مدیرِ محترم' سلام ورحمت۔

ڈاکٹر مظفر حنفی صاحب کے لئے قرطاسِ اعزاز کے ساتھ ''چہارسُو'' ملا۔ بہت شکریہ! صداقت کے علمبردار میں بڑی سچائی اور دیانتداری سے احساسات کو سمویا گیا ہے اور ممدوح کے مرتبے کو بہت اخلاص سے متعین کیا گیا ہے۔ ''چراغِ حرم'' عقیدت وارادت کا بے پایاں اظہار..... ''براہِ راست'' نے ہمیشہ اپنے فصیح و بلیغ استفسارات کی زد میں آئی ہوئی شخصیت سے بکمال مشاقی و چابکدستی ناموجود کا سراغ پایا ہے اور قاری کو مخفی علمی زاویوں سے آگہی جبکہ اوجھل ادبی گوشوں سے شناسائی فراہم کی ہے۔ اسی وصف کے باعث پروفیسر صاحب کی ''قومی کونسل برائے تدریسی تحقیق وتربیت'' اور ''قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان'' کے ضمن میں نہایت وقعت آمیز' دور رس اثرات کے حامل' قابلِ قدر خدمات منظرِ عام پہ آئیں۔ معرکۂ تخلیق وتنقید۔ مروجہ تخلیقی وتنقیدی رویوں اور مزاج کا نہایت متوازن گہرا مطالعہ ہے جس سے اختلاف کا امکان ممکن ہی نہیں۔ سمندر کو آداب' بوند بھر نرم اجالا' حصارِ جسم سے' مرنا ہے تو بے موت اور دیگر مضامین میں نقادانِ فن نے پروفیسر صاحب کی گونا گون تخلیقی جہات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اُن کے مخصوص ومنفرد طرزِ اظہار کی ستائش و پذیرائی کی ہے کہ اُس کے تیکھے و کٹیلے شعری تیوروں نے اُنہیں عام ڈگر سے ہٹ کے جداگانہ راہ بخشی ہے جس کے باعث وہ دنیائے ادب میں ممتاز وممیّز جانے ومانے جاتے ہیں۔ ''محبت کے حق میں دعا کیجیے'' معاصرین ومخلصین کی مظفر حنفی صاحب کی شعری و نثری تصانیف سے متعلق توصیفی وستائشی آراء سے مزین لائقِ مطالعہ وباعثِ لطف رہا۔ ''برف باری کا یادگار دن'' صدر اوباما سے روشن توقعات استوار کئے ہوئے چینج کی خواہش کا گلوبل منظر نامہ ہے (یاد پڑتا ہے کہ محترمہ اختر جمال نے بنام مسز محسن ہمیں گورنمنٹ گرلز کالج گجرات پڑھایا ہوا ہے اور دلچسپ یادیہ بھی کہ انہوں نے ہمیں ''کالج میں میرا پہلا دن'' کی بجائے ''سکول میں میرا آخری دن'' پر مضمون لکھنے کو کہا تھا) ''تیرگی کے سیلاب میں'' آج کے انسانوں کا المیہ سناتا ہے کہ گردو پیش میں سرایت کی ہوئی لاقانونیت نے انہیں اپنے ہی گھروں میں مال ومتاع سمیت غیر محفوظ وخوفزدہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ''سمتوں کا تعین'' سے یہ پہلو اُبھرتا ہے کہ اکثر وبیشتر تاریخ اپنے آپ کو متضاد ومتصادم زاویوں کے ساتھ دہراتی ضرور ہے لیکن اس کا تدارک ہر کسی کی اپنی صدابدید پر منحصر ہوتا ہے۔ ''کہانی عنوان چاہتی ہے'' بچپن کی ناآسودگی کے پس منظر میں متوقع سے غیر متوقع احوال واقعی کا سفر انسانی سائیکی کا ردِعمل ہے مگر آخر میں نہایت ہنروری سے کہانی کو متوقع اختتام سے بچا کے انفرادی موڑ دے دیا گیا ہے۔ ''مشرق کی بیٹی'' کے کثیر الجہتی استعارے کو عنوان کے رنگ وروپ سے نوازنا' تہذیبی پاسداری، ثقافتی ترجمانی اور مشرقی وضعداری کا احسن انداز لگا۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

محبی بھائی جناب گلزار جاوید صاحب' عید مبارک۔

چہارسو کا تازہ شمارہ ستمبر اکتوبر ۲۰۰۹ء موصول ہوا۔ مشکور ہوں۔ زیرِ نظر شمارہ کی ورق گردانی کر رہا ہوں اور سوچ بھی رہا ہوں کہ ایک زمانہ ہو گیا ملاقات کو، اب کبھی یہاں آنے کا پروگرام بنا ڈالو پتہ نہیں کوئی کتنے دن؟

پران پکھیرو اجنبی سانسوں کی مت پوچھ
تن میں روح دیسا وری' کب کر جائے کوچ

شفقت تنویر مرزا پر محمد عامر ہاشم کا مضمون ''ماں بولی کا سچا عاشق'' پڑھ رہا ہوں، وہ 6 فروری 1932 کو وزیر آباد کے چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے تو میں 17 دسمبر 1932 کو بہاولپور میں۔ پیدا ہونا یا مرجانا کوئی بڑی بات نہیں۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کیا کلابازیاں دکھا کر گیا۔ جوگندر پال کا افسانہ تیسرا شخص' نعیم کوثر کا چمڑے کا سکہ، دیپک کنول کا ''لال بندری'' اور گلزار جاوید کا ''گولی کی زبان'' اچھے لگے۔ اس بار کی غزلوں اور نظموں نے بھی متاثر کیا۔ صفحہ 39 پر نظر تھکی ہے

چپ کے بندھن ٹوٹیں گے تو پاؤں میں لوہا بولے گا
پھر دیکھو گے، سانس کے سارے رشتے ناطے ٹوٹ گئے

بھگوان داس اعجاز (دہلی' بھارت)

گلزار جاوید صاحب' آداب۔

آپ کا محبت سے بھیجا ہوا تحفہ حسین ''چہارسو'' شمارہ برائے ماہ ستمبر اکتوبر ہمہ دست ہوا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اپنے چاہنے والوں کو نہیں بھولے۔ شفقت تنویر مرزا کو قرطاس اعزاز منسوب کر کے آپ نے نیک کام کیا ہے وہ واقعی اس کے لیے مستحق تھے، یوں تو ان پر لکھے گئے مضامین نہایت عمدہ ہیں مگر راجا رسالو کا ''منی پر منی گل'' منیر فاروقی کا ''خودی اور بے خودی کا خوشگوار سنگم'' تنویر ظہور کا ''جیون دی گڈی'' اور پروین ملک کے منتخب کلام متاثر کن ہیں۔ آپکا انٹرویو تو ہمیشہ کی طرح اہلِ قرطاسِ اعزاز کے فن اور شخصیت کے سبھی پہلو روشن کئے ہوئے تھا۔ خود مرزا صاحب کے مضامین ''شاہ حسین دی حیاتی، سرائیکی تحریک کی حقیقت اور سیاست'' بہت معلوماتی اور پُر اثر مضامین ہیں۔ افسانوں میں جوگندر پال، نعیم کوثر، دیپک کنول، گلزار جاوید، مشتاق اعظمی، فیروز عالم، شاہد رحمان اور شمشاد احمد سبھی قابلِ تعریف ہیں۔ شعری حصے میں مشکور حسین یاد، ستیہ پال آنند، امجد اسلام امجد، ندا فاضلی، حصیر نوری، زہیر کنجاہی، مظفر حنفی، یوگندر بہل تشنہ، نوید سروش، غلام مرتضیٰ راہی، سرور انبالوی، مراق مرزا، انوار فیروز، پرت پال سنگھ بیتاب، شگفتہ نازلی اور بھگوان داس اعجاز کی تخلیقات نے بہت متاثر کیا۔

نارنگ ساقی (دہلی' بھارت)

☆

۔ فرہادِ لوح وقلم ۔

پانچ صد صفحات کی مجلد یہ دستاویز ''عالمی اردوادب'' کے مدیر اور نامور افسانہ نگار جناب نند کشور وکرم کی شخصیت وفن کا احاطہ کرتی ہے۔ کتاب کے مرتب جناب فاروق ارگلی نے کشادہ دلی اور کشادہ نظری کو کام میں لاتے ہوئے جناب نند کشور وکرم کی چھ دہائیوں پر مشتمل علمی وادبی جہات کا بڑی خوبصورتی سے احاطہ کیا ہے۔ اس کارِخیر میں جناب ارگلی کے شریکِ قلم پریم پال اشک، دیویندر اسر، مشرف عالم ذوقی، کوثر صدیقی، ڈاکٹر انور سدید، اودھے بھان مشر، اختر جمال، ستیہ پال آنند، نامی انصاری، تاج سعید، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، فضیل جعفری، منشایاد، نعیم کوثر، دیپک بدکی، اسلم جمشید پوری، عطیہ سکندر علی، حقانی القاسمی کے علاوہ ان گنت اہلِ قلم شامل ہوئے ہیں۔ وکرم صاحب کی شخصیت کے نہاں و پنہاں گوشوں سے گلزار جاوید کے انٹرویو نے پردہ اٹھا کر قاری کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا کیا ہے۔ سب سے اہم بات جس کا اہتمام مرتب نے کیا وہ جناب نند کشور وکرم کی تخلیقات کی معقول تعداد میں شرکت ہے۔ وکرم صاحب کے چند بہترین اور نمائندہ افسانوں کے علاوہ جناب اللہ بخش، دادا امیر حیدر، بابا غنی، اُستاد دامن، شورش کاشمیری، کا کا صنوبر حسین مومنہ، کامریڈ عباد خان، مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، قرۃ العین حیدر، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، سردار جعفری، دیویندر ستیارتھی، حبیب جالب، منیر نیازی اور معنی آتش نوا کنہیّا لال سیگل کے بارے جناب نند کشور وکرم کے مقالات اپنے اندر ایک طویل سلسلہ روز وشب محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ قبل اس کے آپ کا اشتیاق ہیجان کی شکل اختیار کرے اس خوبصورت ادبی گلدستے کی دستیابی سے آپ کو متعارف کرادیا جائے۔

پبلی شرز اینڈ ایڈورٹائزرز، F-14/21-D، کرشن نگر، دہلی، بھارت۔

○○○

۔ سمندر مضطرب ہیں ۔

ردائے شب بدلنا چاہتے ہیں/ دیئے طوفان میں جلنا چاہتے ہیں/ کہو کہ قافلے امشب نہ سوئیں/ کہ رہبر چال چلنا چاہتے ہیں/ ردا سورج کی سر پر تن گئی ہے/ کہ سائے رخ بدلنا چاہتے ہیں/ سمندر مضطرب ہیں رات بھر سے/ نہ جانے کیا اگلنا چاہتے ہیں/ اُجالو اور کچھ کرنیں بکھیرو/ اندھیرے چال چلنا چاہتے ہیں۔

کس قدر خوبصورت، دلنشیں اور فکر انگیز غزل آپ اور ہم نے ملاحظہ کی۔ دلچسپ پہلو اس غزل کا یہ ہے کہ بہت کچھ کہنے اور سننے کے باوجود یہ ابھی بھی نامکمل ہے۔ اگر آپ اس نامکمل غزل کو مکمل شکل میں دیکھنا اور پڑھنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ اس غزل کے شاعر دل نوا اور اُس کے کلام سے تفصیلی اور بھرپور ملاقات کے متمنی ہیں تو آیئے زیرو پوائنٹ پبلی کیشنز، O/924-A، نزد جیولری مارکیٹ، مری روڈ، راولپنڈی کا رخ کرتے ہیں جہاں ہمارے عصر کے محبوب ومقبول شاعر جناب انوار فیروز کا تازہ شعری نسخہ ''سمندر مضطرب ہیں'' فقط دو صد پچاس روپے کے عوض دستیاب ہے۔

○○○

۔ ماہنامہ انشاء کولکتہ کا گفتنی نمبر ۔

''ربع صدی سے اردو ادب کو بارآور کرنے اور زندگی کو نت نئے رنگ اور زاویے سے دیکھنے اور پرکھنے کے بعد ماہنامہ ''انشا'' کولکتہ بھارت کے مدیر جناب ف۔س۔ اعجاز نے ایک اور کوہِ گراں سر کر لیا ہے۔ کثیر الاقوامی ملک' کثیر الاقوامی زبانیں' کثیر الاقوامی تہذیب وتمدن اور کثیر الاقوامی مسائل ومعاملات پر جناب ف۔س۔ اعجاز نے ہمیشہ ماہنامہ ''انشا'' میں بروقت اور برمحل گفتنی کے عنوان سے گفتگو کی ہے جو کبھی تلخ، کبھی ترش اور کبھی فکر انگیز رہی ہے۔ جس نے کبھی مرہم کا کام کیا ہے تو کبھی مسیحائی کا فریضہ انجام دیا ہے اور کبھی خوگر سے گلہ بھی کیا ہے تو اس انداز سے کہ تمام آبگینے اپنی اپنی جگہ محفوظ و مامون رہیں۔ پچیس سالوں کو محیط ''انشا'' کے تمام اداریوں کو اُن کے روایتی عنوان ''گفتنی'' کے تحت دو صد بہتر صفحات' نفیس کاغذ' عمدہ طباعت اور دلکش سرِ ورق کے ساتھ صرف تین صد ہندوستانی روپے' سات سو پاکستانی روپے' پچیس ڈالر اور پانچ پونڈ (معہ ڈاک خرچ) بیرون ملک کے قارئین کو فراہم کرنا ایک اہم کارنامہ ہے جس کی جس قدر بھی تعریف' توصیف اور تعاون کیا جائے کم ہے۔

زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی